حُسنِ گفتار

طالب ہاشمی

دار الاشاعت مصطفائی

حُسنِ گُفتار

DATA ENTERED

طالب ہاشمی

دارُالاشاعت مُصطفائی دہلی ۱۱۰۰۰۶

۲۹ اسلامی زاویۂ نگاہ سے بچوں کی تعلیم و تربیت 138
۳۰ لمبی امیدیں نعمتوں کی خوشی کو دور کرتی ہیں 147
۳۱ فرض صدقہ کے سوا صدقات چھپا کر دو 150
۳۲ اپنے یا کسی دوسرے کے ماں باپ کو گالی دینا گناہِ کبیرہ ہے 154
۳۳ غیبت نہایت گھناؤنا گناہ ہے 158
۳۴ حسد کا منہ کالا 163
۳۵ بخل اور اسراف سے پرہیز 167
۳۶ وسوسوں کو زبان پر بھی نہ لائیں 171
۳۷ آزادی نسواں یا تبرّج جاہلیہ 174
۳۸ ملاوٹ 182
۳۹ جہیز کی بیماری 187
۴۰ مُردوں کو برا مت کہو 191
۴۱ اپنی زبان پر قابو رکھیے 195
۴۲ چند عجیب عادتیں 199
۴۳ ہمسایوں کے ساتھ حُسنِ سلوک 203
۴۴ گھریلو ملازموں سے برتاؤ 207
۴۵ یہ عادتیں اپنائیے 211
۴۶ اعتدال کا راستہ اپنائیے 216
۴۷ حُسنِ تکلم یا خوش کلامی 219
۴۸ اچھے پڑوسی بنیے 225
۴۹ والدین کی اطاعت، جنّت کی ضامن 228
۵۰ راشی اور مرتشی دونوں ملعون ہیں 232
۵۱ دو قابلِ رشک انسان 238
۵۲ رمضان المبارک، ملی وحدت و یک جہتی کا مہینہ 242
۵۳ رمضان المبارک اور مسلمان تاجر کا کردار 246
۵۴ سحری اور افطاری کی برکات اور رمضان کے عشروں کے فضائل 250
۵۵ لیلۃ القدر کی فضیلت 253
۵۶ عیدالفطر کی اہمیت اور اس کے دینی اور دنیوی فوائد 257
۵۷ مسرّت اور شادمانی کا اسلامی تصور 260
۵۸ کتابیات 263

تقدیم

(از ڈاکٹر خواجہ عابد نظامی صاحب)

طالبؔ ہاشمی صاحب سے میرا تعلق خاطر خاصا پرانا ہے۔ تقریباً تیس بتیس سال، قبل دفتر پوسٹ ماسٹر جنرل لاہور میں ان سے ملاقات ہوئی تھی۔ ان دنوں میں ماہنامہ ''ضیائے حرم'' کا مدیر تھا۔ اور رسالے ہی کے کسی کام کے سلسلہ میں مولانا امداد بخش ضیائی صاحب سے ملنے گیا تھا۔ جو ان دنوں اسی آفس میں کام کرتے تھے۔ میرے کام کی نوعیت جان کر مولانا ضیائی نے مجھ سے کہا: ''اس کام کیلئے طالب ہاشمی صاحب سے مل لیں''

یہ نام میرے لیے نیا نہیں تھا۔ ہاشمی صاحب کی لکھی ہوئی کئی کتابیں میری نظر سے گزر چکی تھیں۔ لیکن یہ علم نہیں تھا کہ موصوف بھی اسی آفس میں ہوتے ہیں۔ خیر میں ہاشمی صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ وہ اس وقت دفتر کی فائلوں میں گم تھے:

''السلامُ علیکم'' ہاشمی صاحب نے میری آواز سن کر فائلوں سے سر اٹھایا اور دھیمے لہجہ میں کہا:

''وعلیکم السلام''

میں نے تعارف کرایا، تو محبت سے پیش آئے اور چپڑاسی کو چائے کے لئے بھیجا۔ یہ چائے یا چاہ کیا تھی اللہ ہی جانے لیکن وہ دن اور آج کا دن ہاشمی صاحب کے ساتھ چائے اور چاہ کا رشتہ مسلسل قائم ہے۔

ہاشمی صاحب کی بیشتر زندگی تصنیف و تالیف اور مطالعہ میں گزری ہے۔ سیرت طیبہ، اسوۂ صحابہؓ، حالاتِ اولیاء اللہ اور اسلامی نظامِ زندگی، غرض ہر موضوع پر انہوں نے لکھا ہے، بلکہ کہنا چاہیے کہ ان موضوعات پر لکھنے کا حق ادا کیا ہے۔ اب تک اُن کی بیسیوں کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ کئی کتابوں پر ایوارڈز مل چکے ہیں۔ پھر ایسی کتابوں کی تعداد بھی کچھ کم نہیں جن کے کئی کئی ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔

اب ان کے مضامین کا مجموعہ ''حُسنِ گفتار'' شائع ہو رہا ہے۔ یہ انکے ریڈیو پر نشر ہونے والے اور مختلف رسائل و جرائد میں شائع ہونے والے مضامین کا دل کش مجموعہ ہے،

جواس سے پہلے نشر اور اشاعت کے مختلف موقعوں پر بھی سامعین وقارئین سے دادو تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ ''حُسنِ گفتار'' میں شامل کرنے سے پہلے ہاشمی صاحب نے ان مضامین میں خاصا ردو بدل کر دیا ہے تاکہ ان کی افادیت میں زیادہ سے زیادہ اضافہ ہو سکے۔ مضامین قرآن وحدیث کی تعلیمات پر مبنی ہیں جو نہایت عام فہم اور سلیس زبان میں لکھے گئے ہیں۔ اندازِ بیان شگفتہ شُستہ اور دل نشین ہے، جن سے بچے جوان اور بوڑھے بھی مستفید ومستفیض ہو سکتے ہیں، لیکن بعض مضامین ایسے ہیں جن سے خصوصی فائدہ بھی اٹھایا جاسکتا ہے۔ مثلاً کار پردازانِ حکومت ''عدل کی اہمیت'' اور ''اسلام میں عورتوں کے حقوق'' جیسے مضامین سے فائدہ اٹھاسکتے ہیں۔ اسی طرح دکاندار ''تجارت کے اسلامی اصول'' اور ''مسلمان تاجر کا کردار'' وغیرہ مضامین سے بھرپور استفادہ کر سکتے ہیں اور عورتیں ''اسلامی نقطۂ نظر سے بچوں کی تربیت''، ''آزادی نسواں''، ''رزقِ حلال اور پرورشِ اولاد''، ''عورتوں کی خاص الخاص صفت حیا ہے'' اور ''جہیز کی بیماری'' جیسے مضامین سے بہت کچھ سیکھ سکتی ہیں اور عملی زندگی میں رہنمائی حاصل کر سکتی ہیں۔ اگر ملک کے مخیّر حضرات مصنف کی اجازت سے ان مفید مضامین کو پمفلٹ کی صورت میں شائع کر کے لوگوں میں تقسیم کرنے کا اہتمام کریں، تو اس سے ہمارے ہاں معاشرتی انقلاب کے سلسلہ میں اہم کام لیا جاسکتا ہے۔

''حُسنِ گفتار'' میں شامل یہ تمام مضامین گہرے سماجی، معاشرتی اور مِلّی وقومی شعور کے حامل ہیں، ان کے مطالعہ سے دینی ودنیاوی کامیابی اور اُخروی فلاح ونجات کا حصول ممکن ہوسکتا ہے۔ آج ہماری قوم کو ایسی ہی مفید، پُرمغز اور ایمان افروز کتابوں کی ضرورت ہے۔ میری دعا ہے اللہ تعالیٰ ہاشمی صاحب کو تادیر سلامت باکرامت رکھے، تاکہ وہ پاکستانی قوم کی تعمیرِ سیرت کے لئے ایسی ہی مفید کتابیں اور مضامین لکھتے رہیں۔

ڈاکٹر خواجہ عابد نظامی

لاہور

۲۶ ستمبر ۲۰۰۲ء

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیم

ابتدائیہ از مؤلّف

آیئے، رحمٰن کے بندے بنیں

یہ مجموعۂ اوراق جو آپ کے ہاتھوں میں ہے، کوئی مستقل تصنیف نہیں بلکہ راقم الحروف کے اُن ۵۰ مضامین کا مجموعہ ہے جو گزشتہ چند سالوں میں وقتاً فوقتاً مختلف رسائل و جرائد میں شائع ہوئے یا ریڈیو پاکستان لاہور سے نشر ہوئے اور علمی و دینی حلقوں میں پسند کیے گئے۔ یہ تمام مضامین متفرق دینی و معاشرتی موضوعات پر ہیں۔ ان میں سے بیشتر کا تعلّق اخلاق کے مختلف پہلوؤں، دینِ حق اسلام کے بعض خصائص اور اصلاحِ معاشرہ سے ہے۔ اِن کو پڑھ کر معلوم ہوگا کہ ایک مومن کا مقصدِ حیات کیا ہے اسلامی تہذیب و تمدّن کے خدوخال کیا ہیں، اولاد کی تعلیم و تربیت کے تقاضے کیا ہیں، مسرت اور شادمانی کا اسلامی تصوّر کیا ہے۔ عورتوں، پڑوسیوں، اور گھریلو ملازموں (یا زیر دست افراد) کے حقوق کیا ہیں، ایک مسلمان کا دوسرے مسلمان پر کیا حق ہے، اسلام میں عدل، اعتدال اور رواداری کی کیا اہمیّت ہے وغیرہ وغیرہ۔۔۔ فی الحقیقت ان مضامین کا مقصود و منشا اخلاق کی اصلاح اور اپنے مسلمان بھائیوں کو وہ اوصاف اپنانے کی طرف راغب کرنا ہے جن کو قرآنِ حکیم میں اس طرح بیان کیا گیا ہے:

> وَعِبَادُ الرَّحۡمٰنِ الَّذِيۡنَ يَمۡشُوۡنَ عَلَى الۡاَرۡضِ هَوۡنًا وَّاِذَا خَاطَبَهُمُ الۡجٰهِلُوۡنَ قَالُوۡا سَلٰمًا ﴿۶۳﴾ وَالَّذِيۡنَ يَبِيۡتُوۡنَ لِرَبِّهِمۡ سُجَّدًا وَّقِيَامًا ﴿۶۴﴾ وَالَّذِيۡنَ يَقُوۡلُوۡنَ رَبَّنَا اصۡرِفۡ عَنَّا عَذَابَ جَهَنَّمَ ۖ اِنَّ

عَذَابَهَا كَانَ غَرَامًا ﴿٦٥﴾ اِنَّهَا سَآءَتْ مُسْتَقَرًّا وَّمُقَامًا ﴿٦٦﴾ وَالَّذِيْنَ
اِذَآ اَنْفَقُوْا لَمْ يُسْرِفُوْا وَلَمْ يَقْتُرُوْا وَكَانَ بَيْنَ ذٰلِكَ قَوَامًا ﴿٦٧﴾
وَالَّذِيْنَ لَا يَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ وَلَا يَقْتُلُوْنَ النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ
اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ وَلَا يَزْنُوْنَ ۚ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ يَلْقَ اَثَامًا ﴿٦٨﴾
يُّضٰعَفْ لَهُ الْعَذَابُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَيَخْلُدْ فِيْهٖ مُهَانًا ﴿٦٩﴾ اِلَّا مَنْ تَابَ
وَاٰمَنَ وَعَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا فَاُولٰٓئِكَ يُبَدِّلُ اللّٰهُ سَيِّاٰتِهِمْ
حَسَنٰتٍ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿٧٠﴾ وَمَنْ تَابَ وَعَمِلَ صَالِحًا
فَاِنَّهٗ يَتُوْبُ اِلَى اللّٰهِ مَتَابًا ﴿٧١﴾ وَالَّذِيْنَ لَا يَشْهَدُوْنَ الزُّوْرَ ۙ وَاِذَا
مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا كِرَامًا ﴿٧٢﴾ وَالَّذِيْنَ اِذَا ذُكِّرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ لَمْ
يَخِرُّوْا عَلَيْهَا صُمًّا وَّعُمْيَانًا ﴿٧٣﴾ وَالَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ
اَزْوَاجِنَا وَذُرِّيّٰتِنَا قُرَّةَ اَعْيُنٍ وَّاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِيْنَ اِمَامًا ﴿٧٤﴾ اُولٰٓئِكَ
يُجْزَوْنَ الْغُرْفَةَ بِمَا صَبَرُوْا وَيُلَقَّوْنَ فِيْهَا تَحِيَّةً وَّسَلٰمًا ﴿٧٥﴾
خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ حَسُنَتْ مُسْتَقَرًّا وَّمُقَامًا ﴿٧٦﴾

(الفرقان رکوع٦)

ترجمہ: اور رحمٰن کے (اصلی) بندے وہ ہیں جو زمین پر نرم چال (مسکنت کے ساتھ) چلتے ہیں اور جاہل ان کے منہ آئیں تو کہہ دیتے ہیں کہ تم کو سلام (یعنی رفع شرّ کی خاطر ان سے جھگڑا نہیں کرتے) جو اپنے ربّ کے حضور سجدے اور قیام میں راتیں گزارتے ہیں جو دعائیں کرتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار ہم سے عذابِ جہنّم کو دُور رکھ۔ بیشک جہنّم بُرا ٹھکانا اور بُرا مقام ہے۔ وہ جب خرچ کرتے ہیں تو نہ فضول خرچی کرتے ہیں نہ بخل بلکہ ان کا خرچ دونوں انتہاؤں کے درمیان اعتدال پر قائم رہتا ہے۔ جو اللہ کے سوا کسی اور معبود کو نہیں پکارتے۔ اللہ کی حرام کی ہوئی کسی جان کو ناحق ہلاک نہیں کرتے اور نہ زنا کے مرتکب ہوتے ہیں یہ کام جو کوئی کرے وہ اپنے گناہ کا بدلہ پائے گا۔ قیامت کے روز اس کو مکرر عذاب دیا جائے گا اور اسی میں وہ

ہمیشہ ذِلّت کے ساتھ پڑا رہے گا اِلَّا یہ کہ کوئی (ان گناہوں کے بعد) توبہ کر چکا ہو اور ایمان لا کر عملِ صالح کرنے لگا ہو۔ ایسے لوگوں کی برائیوں کو اللہ نیکیوں سے بدل دے گا وہ بڑا غفور رّحیم ہے جو شخص توبہ کر کے نیک عملی اختیار کرتا ہے وہ تو اللہ کی طرف پلٹ آتا ہے جیسا کہ پلٹنے کا حق ہے۔ اور رحمٰن کے بندے وہ ہیں جو جھوٹ کے گواہ نہیں بنتے اور کسی لغو چیز پر ان کا گزر ہو جائے تو شریف آدمیوں کی طرح (اس کے پاس سے سلامت روی کے ساتھ) گزر جاتے ہیں۔ جنہیں اگر ان کے رَبّ کی آیات سنا کر نصیحت کی جاتی ہے تو وہ اس پر اندھے اور بہرے بن کر نہیں رہ جاتے جو دعائیں مانگا کرتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار، ہمیں اپنی بیویوں اور اولاد سے آنکھوں کی ٹھنڈک دے اور ہم کو پرہیزگاروں کا امام بنا۔ یہ ہیں وہ لوگ جو اپنے صبر کا پھل منزلِ بلند کی شکل میں پائیں گے۔ آداب وتسلیمات سے ان کا استقبال ہوگا اور وہ ہمیشہ ہمیشہ وہاں رہیں گے۔ کیا ہی اچھا ہے وہ مستقر اور وہ مقام۔"

اللہ تعالیٰ نے قرآنِ حکیم کی ان آیات میں "رحمٰن کے بندوں" کے جو اوصاف بیان فرمائے ہیں اور جن کو آخرت میں ان بندوں کی فلاح اور کامرانی کا ضامن قرار دیا ہے، اخلاقِ حَسنہ کے ذیل میں آتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام میں ایمان یا بنیادی عقائد (ارکانِ اسلام) کے بعد جس بات پر بہت زیادہ زور دیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ ایک سچے مسلمان کو اخلاقِ حَسنہ اختیار کرنا چاہیے اور بُرے اخلاق سے اپنی حفاظت کرنی چاہیے۔ اللہ تعالیٰ ابتدائے آفرینش ہی سے انسانوں کی ہدایت کے لیے اپنی برگزیدہ ہستیوں کو رسول اور نبی بنا کر بھیجتا رہا جنہوں نے زبانی تبلیغِ حق کے ساتھ اپنی پاکیزہ سیرت و کردار کا عملی نمونہ بھی لوگوں کے سامنے پیش کیا۔ چنانچہ جب خالقِ ارض وسما نے اشرف المخلوقات پر اپنی ہدایات کی تکمیل کرنا چاہی تو جناب مُحَمَّد مصطفی ﷺ کو خَاتَمَ النَّبِیّٖن بنا کر مبعوث فرمایا اور

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ

فرما کر نہ صرف آپؐ کی سیرت و کردار کو مسلمانوں کے بہترین نمونہ قرار دیا

بلکہ آپؐ سے مخاطب ہو کر فرمایا وَمَآ اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِیْنَ (اور ہم نے آپ کو سارے جہانوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے)۔۔۔ حُضُور ﷺ کے اخلاقِ عالیہ کی شہادت اللہ جلّ شانُہٗ نے یوں دی۔

وَاِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْمٍ (القلم: ۴)

ترجمہ: (اور بلاشبہ آپ اَخلاق کے نہایت اعلیٰ درجہ پر ہیں)

خاتَمَ الانبیاء والمُرسَلِیْن ﷺ نے خود ایک مرتبہ فرمایا: اِنَّمَا بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ مَکَارِمَ الْاَخْلَاقِ یعنی میں اسی لیے بھیجا گیا ہوں کہ اخلاقی خوبیوں کو کمال تک پہنچا دوں۔

قرآنِ حکیم میں رسولِ اکرم ﷺ کی بعثت کے جن مقاصد کا ذکر کیا گیا ہے ان میں ''انسانوں کے تزکیہ'' کو بنیادی حثیت حاصل ہے۔ تزکیہ سے مراد اصلاحِ اَخلاق ہے۔ ایک مسلمان کی زندگی کا گوہرِ مقصود رضائے الٰہی کا حُصُول ہے اور رضائے الٰہی اس کو اسی وقت حاصل ہو سکتی ہے جب وہ حقیقی معنوں میں ''رحمان کا بندہ'' بن جائے اور ''رحمان کا بندہ'' وہ اسی طرح بن سکتا ہے کہ رسولِ اکرم ﷺ کے اُسوۂ حَسَنہ پر عمل کرنے کو اپنی زندگی کا شِعار بنا لے۔ قرآنِ حکیم اور ارشاداتِ نَبَوی کے مطابق اخلاق کی دو قسمیں ہیں ایک اخلاقِ حَسَنہ اور دوسری اخلاقِ سَیِّئَہ۔

اَخلاقِ حَسَنہ میں وہ تمام اعمال شامل ہیں جن کے کرنے یا جن کو مَشعلِ راہ بنانے کا حُکم دیا گیا ہے مثلاً اِخلاص فی الدّین، ذکرِ الٰہی، خشیتِ الٰہی، راست گفتاری، ایفائے عہد، عفو و درگزر، عدل و انصاف، صلۂ رحمی، رحم، صبر و استقامت، سخاوت، تقوٰی، اطاعتِ والدین، تربیتِ اولاد، تواضع، انکسار، مہمان نوازی، خوش کلامی، دیانت داری، زُہد و قناعت، ایثار، شرم و حیا، صُلح پسندی اکلِ حلال، بُرد باری، صفائی، سادگی، بڑوں کا ادب، چھوٹوں پر شفقت، زمین پر اکڑ کر نہ چلنا، توکّل علی اللہ، ادائے شکریہ، غُربا کی اعانت، حاجت مندوں، معذوروں اور مسافروں کی امداد، باہمی اصلاح، بیمار پرسی، فوت ہو جانے والوں کے پسماندگان سے تعزیت، بے سہارا

یتیموں اور بیواؤں کی مدد کرنا حقوق العباد ادا کرنا (اس میں شوہر بیوی بہن بھائی، ماں، باپ، اولاد، استاد، شاگرد، دکاندار خریدار پڑوسی وغیرہ کے ایک دوسرے پر جو حقوق ہیں سبھی شامل ہیں) ایک دوسرے کو اچھی نصیحت کرنا اور بھلائی کی طرف راغب کرنا اور دوسری ہر قسم کی چھوٹی بڑی نیکیاں۔ (حضور ﷺ کے ارشاد کے مطابق کسی چھوٹی سے چھوٹی کو بھی حقیر نہیں سمجھنا چاہیے مثلاً کسی سے خندہ پیشانی سے ملنا یا نرمی سے گفتگو کرنا، سلام کرنا، راستے سے پتھر کانٹا یا کوئی تکلیف دِہ چیز ہٹا دینا وغیرہ سب باتیں نیکیوں میں شامل ہیں)۔

اخلاقِ سَیِّئہ میں وہ تمام کام شامل ہیں جن سے منع کیا گیا ہے یعنی یہ نہ کرنے کے کام ہیں ان سے بچنا چاہیے مثلاً شرک، حسد، قتلِ ناحق، قطع رحمی، بے حیائی بغض و کینہ، بدچلنی، بدعہدی، غیبت، تکبر فتنہ و فساد۔ جھوٹ، بددیانتی (خیانت) تجسس، دریوزہ گری، کتمانِ شہادت، چغلی، چوری، ظلم، ماپ تول میں کمی، سرگوشی، بدگمانی، بخل، عیب چینی، اِسراف (فضول خرچی) ریاکاری، نشہ آور اشیاء کا استعمال، سود خواری، فحش کلامی، تہمت طرازی، جوئے بازی، تمسخر، خوشامد، اہانتِ نفسِ انسانی وغیرہ وغیرہ۔

ہادیِ اکرم ﷺ نے اُمّت کو جو درسِ اخلاق دیا اس کی چند جھلکیاں ملاحظہ ہوں:

> حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ''تم میں سب سے اچھے وہ لوگ ہیں جن کے اَخلاق اچھے ہیں''۔
>
> (صحیح بخاری وصحیح مسلم)
>
> حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا، آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ صاحبِ ایمان بندہ اپنے اچھے اخلاق سے ان لوگوں کا درجہ حاصل کر لیتا ہے جو رات بھر نفلی نمازیں پڑھتے ہوں اور دن کو ہمیشہ روزہ رکھتے ہوں۔ (ابوداؤد)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے پوچھا گیا کہ یا رسول اللہ وہ کیا چیز ہے جس کی مداومت لوگوں کو جنت میں داخل کرے گی۔ آپؐ نے فرمایا اللہ کا ڈر اور خوش خُلقی۔ (ترمذی)

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ نرمی کرنے والا ہے اور ہر کام میں رِفق اور نرمی کو دوست رکھتا ہے۔ (صحیح بخاری و صحیح مسلم)

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حیا ایمان کی علامت ہے اور ایمان جنت کا ذریعہ ہے۔ اور بے حیائی گندگی ہے اور گندگی دوزخ کا موجب ہے۔ (مشکوٰۃ)

حضرت ابواُمامہ رضی اللہ عنہٗ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: اللہ عزّ وجلّ صرف اس عمل کو قبول فرماتا ہے جو خالص اس کے لیے کیا گیا ہو اور جس کے ذریعے صرف اسی کی رضا چاہی گئی ہو۔

(ابوداؤد۔ نسائی)

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: اس پوری دنیا کی تباہی اللہ کے نزدیک ایک مسلمان شخص کے قتل (ناحق) سے ہلکی ہے۔ (ترمذی۔ مشکوٰۃ)

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: وہ شخص ہم میں سے نہیں جو بڑوں کی عزت نہ کرے، چھوٹوں پر شفقت نہ کرے، نیکیوں کا پرچار نہ کرے اور برائیوں سے نہ روکے۔

(مُسندِ احمد)

حضرت اَنس رضی اللہ عنہٗ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جو شخص مسلمانوں کے کسی معاملہ کا ذِمہ دار بنا پھر اس نے ان کے ساتھ خیانت کی تو وہ جہنمی ہوگا۔ (معجم الصغیر)

حضرت ابوقتادہ رضی اللہ عنہٗ سے روایت ہے کہ میں نے اللہ کے رسولؐ

سے سنا، آپ نے فرمایا، جس شخص نے کسی تنگ دست کو مہلت دی یا اپنا حق اسے معاف کر دیا تو اللہ قیامت کے دن کی سختیوں سے اس کو نجات بخشے گا۔ (صحیح مسلم)

اس سلسلے میں رسولِ اکرم ﷺ کے اور بہت سے ارشادات اس کتاب میں شامل مضامین میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ جہاں تک ہو سکا ان مضامین میں سادہ اور عام فہم اندازِ بیان اختیار کیا گیا ہے۔ ان کو کتابی صورت میں لاتے وقت یہ مقصد بھی پیشِ نظر رہا ہے کہ عام مسلمانوں کے علاوہ طلبہ، طالبات، خُطبا، مقررین اور مُعلّمین ان سے بطورِ خاص استفادہ کر سکیں، استفادہ اس صورت میں کہ اگر ان کو ان میں سے کسی موضوع پر مقالہ لکھنے یا گفتگو (تقریر کرنے یا خطبہ دینے) کی ضرورت پیش آئے تو وہ ان سے مدد لے سکیں۔ ہو سکتا ہے۔ کہ اس طرح ان کی تقریر یا گفتگو میں حُسن پیدا ہو جائے جس سے پڑھنے یا سننے والے متاثر ہوں؛ اس کے نتیجے میں اگر ایک فرد بھی حقیقی معنوں میں رحمان کا بندہ بن گیا تو اللہ تعالیٰ کی شانِ رحیمی سے امید ہے کہ ناصح نصیحت کے اجر سے محروم نہیں رہے گا۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہم سب کو رحمان کے (حقیقی معنوں میں) بندے بننے کی توفیق عطا فرمائے۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ
وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰی رَسُوْلِهِ الْاَمِیْنِ وَعَلٰی اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِیْنَ

راجی غفران وشفاعت

طالب الہاشمی

۲۰ ذیقعد ۱۴۲۳ ہجری

مطابق ۲۴ جنوری ۲۰۰۳ء

قرآنِ حکیم کی روشنی میں
انسان کا مقصدِ حیات

اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں پر جو بے حساب احسانات فرمائے ہیں اُن میں سب سے بڑا احسان یہ ہے کہ اُن کی صلاح و فلاح کے لئے نُبُوّت و رسالت کا مقدّس سلسلہ جاری فرمایا۔ انبیاء و مُرسَلین کا یہ سلسلہ ہزاروں سال جاری رہا یہاں تک کہ رحمتِ عالم حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ پر اس سلسلہ کو ختم فرما دیا گیا اور آپؐ کے ذریعے وہ آخری اور مکمل تعلیم و ہدایت بھیج دی گئی جو ابَدُ الآباد تک بنی نوعِ انسان کی رہنمائی کرتی رہے گی یعنی قرآنِ حکیم۔ اللہ تعالیٰ نے اس پاک کتاب کو ہر دَور میں محفوظ اور روشن رکھنے کے ایسے ظاہری اور باطنی انتظامات فرما دیے کہ چشمِ بینا رکھنے والوں کے لیے یہ اللہ جَلَّ شَانُہٗ کی نشانیوں میں سے ایک بڑی نشانی اور خاتَم الانبیاء والمُرسَلین ﷺ کے معجزوں میں سے ایک زندہ معجزہ ہے۔ قرآنِ حکیم نے ہم کو بتایا کہ تمام کائناتِ ارضی و سماوی کا خالق و مالک وہی ایک اللہ ہے یکتا، نہ وہ کسی کی اولاد ہے اور نہ اس کی کوئی اولاد ہے۔ اُس ذاتِ واحد نے اس کائنات کو بے مقصد اور بے فائدہ نہیں بنایا۔ جیسا سورۂ صٓ میں ارشاد ہوا ہے:

وَ مَا خَلَقْنَا السَّمَآءَ وَ الْاَرْضَ وَ مَا بَيْنَهُمَا بَاطِلًاؕ (صٓ. آیۃ ۲۷)

یعنی ہم نے آسمان اور زمین کے درمیان جو کچھ ہے سب کو بے کار اور ناحق پیدا نہیں کیا۔

پھر اس نے انسان کو زمین پر اپنا خلیفہ اور اشرف المخلوقات بنا کر بھیجا اور اس کو بتایا هُوَ الَّذِیْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا (البقرہ: ۲۹)

یعنی وہی تو ہے جس نے تمہارے لیے زمین کی ساری چیزیں پیدا کیں۔

ساتھ ہی اللہ تعالیٰ نے انسان پر واضح فرما دیا کہ اس کی زندگی بے مقصد اور

بے فائدہ نہیں اور وہ اس دنیا میں بیکار پیدا نہیں کیا گیا جیسا کہ سورۂ مؤمنون میں ہے:

اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنَا کُمْ عَبَثًا وَّ اَنَّکُمْ اِلَیْنَا لَا تُرْجَعُوْنَ (آیة: ۱۱۵)

یعنی کیا تم نے سمجھ رکھا ہے کہ ہم نے تمہیں فُضول ہی پیدا کیا ہے اور یہ کہ تم لَوٹ کر ہمارے پاس نہ آؤ گے۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر انسان فُضول اور بیکار پیدا نہیں کیا گیا تو اس کی زندگی کا مقصد کیا ہے؟ اس کا جواب اللہ تعالیٰ نے سُورۃُ الذّٰرِیات میں یوں دیا ہے:

وَ مَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ ۝ مَا اُرِیْدُ مِنْهُمْ مِّنْ رِّزْقٍ وَّمَا اُرِیْدُ اَنْ یُّطْعِمُوْنِ۝ (آیة ۵۶۔۵۷)

یعنی میں نے جن اور انسانوں کو اس کے سوا کسی کام کے لیے پیدا نہیں کیا ہے کہ وہ میری عبادت کریں۔ میں ان سے کوئی رزق نہیں چاہتا اور نہ یہ چاہتا ہوں کہ وہ مجھے کھلائیں۔

ان آیتوں میں یہ بات روزِ روشن کی طرح واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو صرف اور صرف اپنی بندگی یا عبادت کے لیے پیدا کیا ہے۔

یہاں یہ سوال ذہن میں ابھر سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ صرف جن و انس ہی کا خالق تو نہیں وہ تو کائنات کے ذرّے ذرّے کا خالق ہے پھر اس نے صرف جن و انس کے بارے میں کیوں فرمایا کہ میں نے ان کو اپنی عبادت کے سوا اور کسی کام کے لئے پیدا نہیں کیا تو اس اشکال کا جواب یہ ہے کہ زمین پر صرف جن و انس ہی ایسی مخلوق ہیں کہ ان کو عقل و شعور کی نعمت سے بہرہ ور کر کے یہ آزادی بخشی گئی کہ اگر وہ اللہ وَحْدَہٗ لَاشَرِیْک کی عبادت کرنا چاہیں تو کریں اور اگر وہ سرکشی اور کفر و شرک کے راستے پر چل کر اپنی فطرت سے لڑنا چاہیں تو اس کا بھی ان کو اختیار ہے یہ الگ بات ہے کہ اس اختیار اور آزادی کے غلط استعمال کا آخرت میں سخت مُحاسبہ ہوگا۔

آیئے اب دیکھتے ہیں کہ عبادت کا مطلب اور مفہوم کیا ہے تو اس کے لُغوی

معنیٰ ہیں پرستش، عاجزانہ اطاعت اور برضا و رغبت فرمانبرداری۔ بعض لوگ نماز روزہ، حج، زکوٰۃ اور تسبیح وتہلیل ہی کو عبادت سمجھتے ہیں۔ بلاشبہ یہ اُمور عبادت میں شامل ہیں لیکن فی الحقیقت عبادت کا مفہوم بڑا وسیع ہے اس میں اللہ اور رسول ﷺ کے تمام احکام کی بلا چون و چرا اطاعت‘ شریعتِ اسلامیہ کی برضا و رغبت پیروی اور اللہ تعالیٰ کے امرونہی کی دل وجان سے تعمیل بھی شامل ہے۔ اس طرح ایک مؤمن کے تمام اعمالِ صالح عبادت میں داخل ہو جاتے ہیں۔ مثلاً حلال روزی کھانا، حلال روزی کمانے کے لئے تگ ودو کرنا، خدمتِ خلق، بیوی بچوں کی کفالت‘ صلۂ رحمی اکرامِ ضیف یعنی مہمان نوازی، جہاد فی سبیل اللہ، ایفائے عہد، حق گوئی، ماں باپ کی خدمت، عفو و درگزر، غریبوں یتیموں بیواؤں اور حاجت مندوں کی اعانت وغیرہ سبھی چیزیں عبادت میں داخل ہیں اسی طرح جن باتوں سے اللہ تعالیٰ اور رسولؐ نے منع فرمایا ہے مثلاً شرک، دروغ گوئی، غیبت، حسد، تکبُر، عہد شکنی، خیانت، ریاکاری، عصبیت، بُخل، جھوٹی گواہی، ذخیرہ اندوزی بدگمانی‘ مردم آزاری وغیرہ سے اجتناب کرنا بھی عبادت میں داخل ہے۔

گویا ایک مؤمن کی تمام زندگی خلوت میں بھی اور جلوَت میں بھی سراپا عبادت ہوتی ہے۔ قرآنِ پاک کی سورۃ العصر میں ایک انسان کے مقصدِ حیات کو ایک اور انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ اس میں اللہ تعالیٰ نے زمانے کی قسم کھا کر فرمایا ہے کہ انسان گھاٹے میں ہے سوائے ان لوگون کے جو ایمان لائے، جنھوں نے نیک عمل کیے ایک دوسرے کو حق کی نصیحت اور صبر کی تلقین کی۔ یعنی انسان کا مقصدِ حیات چار اُمور سے عبارت ہے۔ پہلا ہے ایمان لانا یعنی اللہ کی وحدانیت، اس کے فرشتوں، اس کے پیغمبروں، اس کی کتابوں، تقدیرِ الٰہی اور یومِ آخرت کو صدقِ دل سے ماننا۔ دوسرا ہے نیک عمل کرنا، ان میں بنیادی ارکانِ اسلام کی پابندی کے علاوہ وہ تمام کام بھی شامل ہیں جن کے کرنے کا اللہ اور رسول ﷺ نے حکم دیا ہے اور ان تمام کاموں سے اجتناب بھی جن سے اللہ اور رسول نے منع فرمایا ہے۔ تیسرا ہے ایک

دوسرے کو حق کی نصیحت کرنا یعنی جب باطل سر اٹھا رہا ہو اور حق کے خلاف کام کیے جا رہے ہوں تو کلمۂ حق کہہ کر باطل کا مقابلہ کرنا، چوتھا ہے ایک دوسرے کو ہر حال میں صبر کرنے یا راہِ حق میں پیش آنے والے مصائب کو ثابت قدمی سے برداشت کرنے کی تلقین کرنا۔

خلاصۂ کلام یہ کہ جس انسان نے ان باتوں پر عمل کیا اس نے اپنے مقصدِ حیات کو پالیا اور یہی قرآنِ حکیم کا منشاء و مقصود ہے۔

بندۂ مؤمن کی پہچان

قرآنِ حکیم اور احادیثِ نبوی میں مؤمنین کے جو اوصاف بیان ہوئے ہیں، ان کی سیرت و کردار کو جو نقشہ کھینچا گیا ہے اور آخرت میں ان کے بلند مرتبے اور اجرِ عظیم کا جس طرح ذکر کیا گیا ہے، اس سے یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہو کر سامنے آتی ہے کہ آخرت میں انسان کی نجات کا دارومدار اس کے سچے مسلمان یا مؤمن ہونے پر ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ غفور و رحیم قادرِ مُطلق چاہے تو کسی کم تر درجے کے مسلمان کو اس کی کسی معمولی نیکی پر بھی بخش دے لیکن بندۂ مؤمن کے لیے اس کا پختہ اور غیر متبدّل وعدہ ہے کہ وہ اس کو ضرور بخش دے گا اور جنّت میں داخل کرے گا۔ یہاں یہ بات ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ مُسلِم اور مؤمن میں لطیف سا فرق ہے وہ یہ کہ ہر بندۂ مؤمن لازماً مسلم ہوتا ہے، لیکن ہر مسلِم کو ہم اس وقت تک صحیح معنوں میں مؤمن نہیں کہہ سکتے جب تک وہ ایمان کے وہ تمام تقاضے پورے نہیں کرتا جو اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کو مطلوب ہیں۔ اگر کسی شخص نے زبان سے اللہ، رسولؐ، قرآن، آخرت تقدیر اور دوسرے ایمانیات کو ماننے کا اقرار کر لیا، ارکانِ اسلام کی پابندی کو بھی اختیار کر لیا جس سے اس کے ماننے کا اظہار ہوتا ہے تو فقہی اور قانونی طور پر اسے لازماً مسلم یا مسلمان کہا جائے گا لیکن اگر وہ زندگی کے مختلف معاملات مثلاً کاروبار، لین دین، اقرباء اور دوسرے مسلمانوں کے ساتھ برتاؤ وغیرہ میں اللہ اور رسولؐ کے احکام کو پیشِ نظر نہیں رکھتا بلکہ رسم و رواج یا اپنے نفس یا خواہشات کی پیروی کرتا ہے تو وہ محض رسمی مسلمان ہے تاہم وہ مسلم معاشرے ہی کا ایک فرد متصوّر ہوگا اور اس کو وہ تمام شرعی، قانونی، اخلاقی اور معاشرتی حقوق حاصل ہوں گے جو اسلام نے ایک مسلم کو دیے ہیں۔ دوسری طرف وہ مسلمان ہے جو اللہ، اس کے فرشتوں، اس کے پیغمبروں، آسمانی کتابوں، ہر خیر و شرّ کی تقدیر، آخرت اور

روزِ قیامت پر صدقِ دل سے ایمان رکھتا ہے، اپنی پوری شخصیت اور وُجود کو اسلام کے تابع کر دیتا ہے۔ اپنی عبادات اور اپنے معاملات اور اپنے اخلاق و عادات کو اس سانچے میں ڈھال لیتا ہے جو اللہ اور اللہ کے رسول کو مطلوب ہے تو وہ بندۂ مؤمن ہے جس کی پوری زندگی کا شعار اور محور یہ فرمانِ خداوندی ہوتا ہے:

اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَ مَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ (الانعام:۱۶۲)

’’یعنی میری نماز اور میرے تمام مراسمِ عُبُودِیّت اور میرا جینا اور میرا مرنا سب کچھ اللہ کے لیے ہے جو ساری کائنات کا مالک ہے۔‘‘

اس آیت کی تشریح رسولِ اکرم ﷺ کے اس ارشاد سے ہوتی ہے:

مَنْ اَحَبَّ لِلّٰہِ وَ اَبْغَضَ لِلّٰہِ وَاَعْطٰی لِلّٰہِ وَمَنَعَ لِلّٰہِ فَقَدِاسْتَکْمَلَ الْاِیْمَانَ
(سُنَنِ ابی داوٗد عن ابی اُمامہؓ)

’’یعنی جس نے کسی سے دوستی و محبت کی تو اللہ کے لیے، اور دشمنی کی تو اللہ کے لیے اور کسی کو دیا تو اللہ کے لیے اور کسی سے روکا تو اللہ کے لیے، اس نے اپنے ایمان کو کامل کر لیا یعنی وہ پورا مؤمن ہو گیا۔‘‘

حضور ﷺ کے اس ارشاد سے صاف ظاہر ہے کہ بندۂ مومن کا ہر قول و فعل اللہ تعالیٰ کی رضا کے تابع ہوتا ہے اور اس کے طرزِ حیات میں ایمانِ کامل نتیجہ کے آثار نمایاں نظر آتے ہیں۔ ایمان کو عَمل سے جُدا نہیں کیا جا سکتا اس لیے کہ عَمل ایمان کا نتیجہ اور ثَمرہ ہے بلکہ یہی وہ علامت ہے جس سے لوگوں کو کسی کے مؤمن ہونے کا پتہ چلتا ہے یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں جا بجا ایمان اور عَملِ صالح کو ساتھ ساتھ اور یکجا بیان کیا ہے۔ قرآنِ حکیم میں بندۂ مؤمن کے جو اوصاف و اعمال بیان ہوئے ہیں اور جو ایک مؤمن کی پہچان ہیں، ان میں سے کچھ یہ ہیں:

سورۂ انفال میں ارشاد ہوا ہے:

’’سچے اہلِ ایمان تو وہی لوگ ہیں جن کے دل اللہ کا ذِکر سن کر لرز جاتے ہیں اور جب اللہ کی آیات ان کے سامنے پڑھی جاتی ہیں تو ان کا ایمان بڑھ جاتا ہے اور وہ اپنے ربّ پر اعتماد رکھتے ہیں، نماز قائم کرتے ہیں اور جو کچھ ہم نے ان کو دیا ہے

> اس میں سے ہماری راہ میں خرچ کرتے ہیں۔ ایسے ہی لوگ حقیقی مؤمن ہیں ان کے لیے ان کے رب کے پاس بڑے درجے ہیں قصوروں سے درگزر ہے اور بہترین رزق ہے"۔ (آیت۔۲)

سورۂ توبہ میں فرمایا گیا ہے:

> "حقیقت یہ ہے کہ اللہ نے مؤمنوں سے ان کے نَفس اور مال جنّت کے بدلے میں خرید لیے ہیں۔ وہ اللہ کی راہ میں مرتے مارتے ہیں ان سے جنّت کا وعدہ اللہ کے ذمے ایک پختہ وعدہ ہے۔ اللہ کی طرف بار بار پلٹنے والے۔ اس کی بندگی بجالانے والے، اس کی حمد کرنے والے، اس کی خاطر زمین میں گھومنے والے، اس کے آگے رکوع وسجود کرنے والے، نیکی کا حکم دینے والے بدی سے روکنے والے اور اللہ کی حدود کی حفاظت کرنے والے، اس شان کے ہوتے ہیں مؤمن جو اللہ سے بیع کا معاملہ کرتے ہیں۔" (آیات۔۱۱۱-۱۱۲)

سورۂ مؤمنون میں ارشاد ہوا ہے:

> "یقیناً فلاح پائی ہے ایمان والوں نے جو اپنی نماز میں خشوع اختیار کرتے ہیں، لغویات سے دور رہتے ہیں، زکوٰۃ دیتے ہیں، اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرتے ہیں اپنی امانتوں اور اپنے عہد وپیان کا پاس رکھتے ہیں اور اپنی نمازوں کی پوری طرح محافظت کرتے ہیں"۔ (آیات۔۱تا۹)

سورۂ الرعد، سورۂ الفرقان، سورۂ الاحزاب اور سورۂ الشوریٰ میں مؤمنین کے یہ اوصاف بھی بیان ہوئے ہیں خیر کرنے والے، علانیہ اور پوشیدہ، صدقہ وخیرات کرنے والے، برائی کو بھلائی سے دفع کرنے والے زمین پر نرم چال چلنے والے، جاہل ان کے منہ آئیں تو ان کو دور سے سلام کہنے والے، سجدے اور قیام میں راتیں گزارنے والے، بے حیائی کے کاموں سے پرہیز کرنے والے، ہمیشہ سچ بولنے والے، غصہ آجائے تو اسے پی جانے اور درگزر کرنے والے۔

مؤمن کی ایک نشانی یہ بھی بیان کی گئی ہے کہ اگر اُس سے بتقاضائے بشری کوئی گناہ سرزد ہو جائے تو معاً اسے اللہ یاد آجاتا ہے وہ توبہ کر کے اپنے قصور کی معافی

چاہتا ہے اور کبھی اپنے کیے پر اصرار نہیں کرتا۔

اب ہم رحمتِ عالم خیر الخلائق ہادیِ برحق ﷺ کے چند ارشادات بیان کرتے ہیں جن میں آپؐ نے اُمّت کو بتایا ہے کہ مؤمن کی پہچان کیا ہے، وہ کن اوصاف کا حامل ہوتا ہے اور کن باتوں سے اس کا دامن صاف ہوتا ہے۔

صحیحین میں حضرت اَنسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، تم میں سے کوئی مؤمن نہیں ہوسکتا جب تک کہ وہ اپنے بھائی کے لئے وہی نہ چاہے جو وہ اپنے لیے چاہتا ہے۔

صحیح مسلم میں حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، مسلم وہ ہے جس کی زبان درازیوں اور دست درازیوں سے مسلمان محفوظ رہیں اور مؤمن وہ ہے جس کی طرف سے لوگوں کی اپنی جانوں اور مالوں کے بارے میں کوئی خوف خطرہ نہ ہو۔

سُنَنِ ابی داؤد میں حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، سب سے زیادہ کامل ایمان اس کا ہے جس کے اَخلاق زیادہ اچھے ہیں۔

صحیح بخاری میں حضرت ابوشُرَیح خُزاعیؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، واللہ (یعنی اللہ کی قسم) وہ مؤمن نہیں۔ واللہ وہ مؤمن نہیں۔ واللہ وہ مؤمن نہیں۔ عرض کیا گیا، یارسولؐ اللہ کون مؤمن نہیں؟ فرمایا، وہ آدمی جس کے پڑوسی اس کی شرارتوں اور آفتوں سے خائف رہتے ہوں۔

اسی طرح کی اور بہت سی احادیث کتبِ احادیث میں ملتی ہیں جن میں بندۂ مؤمن کے کچھ اور اوصاف بھی بیان کیے گئے ہیں مثلاً:

مؤمن لعن طعن کرنے والا نہیں ہوتا اور نہ فحش گو اور بدکلام ہوتا ہے وہ مُخَیَّر اور ایثار پیشہ ہوتا ہے۔ وہ جھوٹا نہیں ہوتا۔ بدکار چور اور خائن نہیں ہوتا۔

وہ دوسرے ہر مؤمن کو اپنا بھائی سمجھتا ہے اس کے ضرر کو اُس سے دفع کرتا ہے اور اس کی غیر حاضری میں اس کے مال اسباب اور گھر کی نگہبانی کرتا ہے۔ دوسروں کو کثرت سے سلام کرنے والا ہوتا ہے۔ حُقُوق العباد ادا کرنے کا خاص

خیال رکھتا ہے وغیرہ وغیرہ۔

قرآن وحدیث سے بھی یہ بات پوری طرح ثابت ہوجاتی ہے کہ مؤمنین اور مؤمنات بہترین خلائق انسان ہیں۔ صرف ذاتی اعتبار ہی سے نہیں بلکہ اجتماعی لحاظ سے بھی کیونکہ اسلام اور کُفر کے درمیان معرکہ آرائی کا موقع آجائے تو بندۂ مؤمن ہر حالت میں اسلام کا ساتھ دے گا خواہ اس میں اس کو کیسی ہی قربانی دینی پڑے۔ وہ اللہ کی راہ میں تمام ذاتی مفادات حتیٰ کہ جان مال اور اولاد بھی خوشی سے قربان کرسکتا ہے۔

حکیم الاُمّت علامہ محمد اقبالؒ نے ''دریا بہ حباب اندر'' کے مصداق ان دو شعروں میں بندۂ مؤمن کی کیا خوب تعریف فرمائی ہے:

ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مؤمن کا ہاتھ غالب وکار آفریں، کار کشا، کارساز
خاکی و نوری نہاد، بندۂ مولا صفات ہر دو جہاں سے غنی، اُس کا دلِ بے نیاز

دعا ہے اللہ تعالیٰ ہم سب کو مؤمن بننے کی توفیق عطا فرمائے اور ہماری زندگی کا ہر لمحہ اپنے خالق ومالک کی رضا کے حصول میں صَرف ہو۔

رحمتِ الٰہی کی وُسعت

صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہُ عنہُ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے جب اپنی مخلوقات کو پیدا کرنے کا ارادہ کیا تو ایک کتاب لکھی جو اُس کے پاس عرش پر موجود ہے۔ اس کتاب میں یہ الفاظ ہیں کہ میری رحمت میرے غصہ پر سبقت لے گئی یا میری رحمت میرے غصہ پر غالب آ گئی۔

یہ حدیثِ قدسی مُتفق علیہ ہے۔ اس سے اہلِ ایمان اندازہ کر سکتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت کا دائرہ کس قدر وسیع ہو سکتا ہے اسی لیے اس نے اپنے بندوں سے فرمایا ہے۔

لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا ؕ اِنَّهٗ هُوَ
الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ○ (الزُّمَر: ۵۳)

"یعنی اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو جاؤ، یقیناً اللہ سارے گناہ معاف کر دیتا ہے وہ تو غفورُ الرحیم ہے۔

فی الحقیقت رحمتِ الٰہی کی وسعت کی کوئی حد و نہایت نہیں۔ اس وُسعت کو احاطہء بیان میں لانا امرِ محال بلکہ ناممکن ہے۔ مگر پنجابی کے ایک صاحبِ دل شاعر "صاحبِ سیف الملوک" میاں محمد بخش رحمۃ اللہ علیہ نے یہ شعر کہہ کر دریا کو کوزے میں بند کر دیا ہے:

جے کر ویکھاں عملاں وَلے کُجھ نہیں میرے پلّے
تے جے کر ویکھاں رحمت وَلے بلّے بلّے بلّے

یعنی اگر اپنے اعمال پر نظر ڈالوں تو اپنا دامن خالی نظر آتا ہے مگر جب تیری رحمت پر نظر ڈالتا ہوں تو اس کی وسعت کی کوئی حد و نہایت دکھائی نہیں دیتی۔ مطلب

یہ ہے کہ تیری رحمت اتنی وسیع ہے کہ میرے عمر بھر کے گناہوں کو ڈھانپ لے گی۔

اگر اللہ تعالیٰ کے اسماءُ الحُسنٰی پر غور فرمائیں تو جہاں بہت سے اسماء سے اُس خالق و مالک کی شانِ یکتائی، بے مثال عظمت اور شانِ ربوبیت و اُلوہیّت کا اظہار ہوتا ہے وہاں بعض اسماء بطورِ خاص اس کی وسعتِ رحمت کو ظاہر کرتے ہیں مثلاً الرَّحمان، الرَّحِیم، الغَفّارُ، الحَلِیمُ، الغَفُورُ، الکَرِیمُ، العَفُوُّ، **اَلرَّؤُف**، المجیب، ان میں سے الرَّحمان اور رحیم ہی کو لیجیے، دونوں رحمت سے مشتق ہیں اور رحمت دو قسم کی ہوتی ہے ایک تو وہ رحمت ہے جو دوست اور دشمن، مسلم اور کافر، مؤمن اور مُلحد، بت پرست اور بُت شِکن سب کے لیے عام ہو اس میں اعضائے بَدَنی، صحتِ بَدَنی، ہوا، پانی، رزق وغیرہ سبھی چیزیں آجاتی ہیں۔ دوسری رحمت وہ ہے جو دوستوں یا فرمانبرداروں کے ساتھ خاص ہو، اس میں دولتِ ایمان، انوارِ الٰہی کا قلب پر نزول، سکون و اِطمینانِ قلب، اعمالِ صالحہ کی توفیق اور اللہ و رسول ؐ سے محبت شامل ہیں۔ حق تعالیٰ کا ایک اور نام الحلیم ہے۔ یہ اِسم قرآنِ حکیم میں غفور، غنی، علیم اور شکور کے اسماء کے ساتھ استعمال ہوا ہے۔ اس کا محلِ استعمال دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ الحلیم وہ ذات ہے جو غصّہ وغضب میں قابو سے باہر نہ ہو۔ وہ اپنے بندوں کو برملا اپنے احکام کی نافرمانی کرتے دیکھتی ہے پھر بھی وہ اپنے غضب پر قابو رکھتی ہے اور قدرتِ اِنتقام رکھنے کے باوجود اِنتقام نہیں لیتی اور گنہگار کو اس کے مجرم ہونے کے باوجود گناہوں کے مواخذہ میں فوراً نہیں پکڑتی۔ وہ ذاتِ رحیم وحلیم تو گنہگاروں کو اتنی ڈھیل دیتی ہے جو ان کے حاشیۂ خیال میں بھی نہیں آسکتی اگر اُس ذاتِ پاک کی رحمت بے انتہا وسیع نہ ہوتی اور وہ ہمارے ہر گناہ پر مواخذہ کرنے لگتا تو روئے زمین پر کوئی مخلوق باقی نہ رہتی جیسا کہ سورۂ النحل میں فرمایا گیا ہے

وَلَوْ يُؤَاخِذُاللّٰهُ النَّاسَ بِظُلْمِهِمْ مَاتَرَكَ عَلَيْهَامِنْ دَآبَّةٍ وَّلٰكِنْ يُّؤَخِّرُ هُمْ
اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ۚ فَاِذَاجَآءَ اَجَلُهُمْ لَا يَسْتَاْ خِرُوْنَ
سَاعَةً وَّلَا يَسْتَقْدِمُوْنَ O (آیۃ:٦١)

یعنی اگر کہیں اللہ لوگوں کو اُن کی زیادتی پر فوراً ہی پکڑ لیا کرتا

تو روئے زمین پر کوئی چلنے والی چیز یا مُتَنَفِّس نہ چھوڑتا لیکن وہ سب کو
ایک وقتِ مقرّرہ تک مہلت دیتا ہے۔ پھر جب وہ وقت آجاتا ہے
تو اس سے ہر کوئی ایک گھڑی بھر بھی آگے پیچھے نہیں ہوسکتا۔

مطلب یہ کہ اس مہلت کے اندر انسان خوابِ غفلت سے بیدار ہو جائے اور توبہ کر لے تو پھر اللہ تعالیٰ کی رحمت اس کے غضب پر سبقت لے جائے گی۔

اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ نے اہلِ ایمان کو بار بار تاکید فرمائی ہے کہ وہ تمام مخلوقِ خدا سے رحمت و شفقت کا سلوک کریں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق کو اپنا کنبہ قرار دیا ہے اور اسی شخص کو اپنی محبت اور رحمت کا مستحق قرار دیا ہے جو اس کی عَیال یعنی مخلوق کے ساتھ احسان اور اچھا سلوک کرے۔ صحیحین میں حضرت جریر بن عبداللہ ؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے لَا یَرْحَمُ اللّٰہُ مَنْ لَّا یَرْحَمُ النَّاسَ یعنی اس شخص پر اللہ کی رحمت نہ ہوگی جو انسانوں پر رحم نہ کھائے گا۔ ایک اور حدیث میں جو حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عَنْہُمَا سے مروی ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ تم زمین والی مخلوق کے ساتھ رحم کا معاملہ کرو آسمان والا تم پر رحمت فرمائے گا۔ (سُنَنِ ابی داؤد ___ جامع ترمذی)

اللہ تعالیٰ نے رسولِ پاک ﷺ کو سارے جہانوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا جیسا کہ اس کا ارشاد ہے:

وَمَا اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِیْنَ (الانبیاء:۱۰۷) ساتھ ہی اس نے آپ کی ذاتِ اقدس کو یہ فرما کر ساری امت کے لیے نمونہ بنایا۔ لَقَدْ کَانَ لَکُمْ فِیْ رَسُوْلِ اللّٰہِ اُسْوَۃٌ حَسَنَةٌ (الاحزاب)

حضور ﷺ ساری مخلوقِ خدا کے لیے خیرِ مجسّم اور پیکر رحمت تھے۔ دوست، دشمن، بوڑھوں، بچوں، مردوں، عورتوں، کافروں، مسلمانوں، چرندوں پرندوں ہر ایک پر رحم فرمایا کرتے تھے بالخصوص اہلِ ایمان کے لیے تو آپؐ سراپا رحمت وشفقت تھے جیسا کہ سورۂ توبہ میں فرمایا گیا ہے:

لَقَدْ جَآءَکُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِکُمْ عَزِیْزٌ عَلَیْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِیْصٌ عَلَیْکُمْ

بِالْمُؤْمِنِیْنَ رَءُوْفٌ الرَّحِیْم (آیۃ:۱۲۸)

''یعنی دیکھو تمہیں میں سے ایک رسول تمہارے پاس آیا۔ تمہارا نقصان میں پڑنا اُس پر گراں گزرتا ہے، وہ تمہاری فلاح کا خواہشمند ہے، ایمان لانے والوں پر وہ بہت ہی مہربان اور رحم کرنے والا ہے۔''

حضور ﷺ امت کو بھی یہی تلقین فرمایا کرتے تھے کہ مخلوقِ خدا کے لیے باعثِ رحمت بنو باعثِ زحمت نہ بنو۔ اپنے عملوں پر بھروسا نہ کرو بلکہ صرف اللہ کی رحمت پر بھروسا کرو اور یہ اللہ جَلّ شَانُہٗ کی خاص رحمت ہے کہ مومن کی ایک نیکی کے بدلے میں دس سے سات سَو تک نیکیاں لکھی جاتی ہیں جبکہ ایک گناہ کے بدلے میں صرف ایک ہی گناہ لکھا جاتا ہے۔

رحمتِ عالَم ﷺ نے اللہ کی رحمت کے بارے میں فرمایا سو فرمایا خود اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

عَذَابِیْٓ اُصِیْبُ بِہٖ مَنْ اَشَآءُ ج وَرَحْمَتِیْ وَسِعَتْ کُلَّ شَیْءٍ ط

(الاعراف:۱۵۶)

''یعنی سزا تو جسے میں چاہتا ہوں دیتا ہوں مگر میری رحمت ہر چیز پر چھائی ہوئی ہے''

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہم سب کے دلوں میں رحمتِ الٰہی کی وسعت پر یقین کامل پختہ سے پختہ تر کر دے اور ہم دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی اس کی رحمت پر بھروسا کریں اس عقیدے کے ساتھ کہ اس کی رحمت سے ناامید ہونا گمراہوں اور کافروں کا کام ہے۔

کائنات کی ہر چیز تقدیر کی پابند ہے

مُسنَدِ احمد، جامع ترمذی اور سُنَنِ ابنِ ماجہ میں حضرت ابی خزامہ رضی اللہ عنہٗ سے روایت ہے کہ میرے والد نے بیان کیا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا، یارسول اللہ! کیا ارشاد ہے اس بارے میں کہ جھاڑ پھونک کے دو طریقے ہیں جن کو ہم دکھ درد میں استعمال کرتے ہیں یا دوائیں جن سے ہم اپنا علاج کرتے ہیں یا مصیبتوں اور تکلیفوں سے بچنے کی وہ تدبیریں جن کو ہم اپنے بچاؤ کے لیے عمل میں لاتے ہیں، کیا یہ چیزیں اللہ کی تقدیر کو ٹال سکتی ہیں۔؟ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ یہ سب چیزیں بھی اللہ کی تقدیر سے ہیں۔

تقدیر جیسے نازک مسلہ پر دانائے کونین ﷺ کا یہ مختصر جواب اتنا جامع اور حکیمانہ ہے کہ تقدیر کے بارے میں مختلف ذہنوں میں پیدا ہونے والے شبہات خود بخود دور ہو جاتے ہیں۔ آپؐ نے امّت کو سمجھایا ہے کہ ہم جن مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے جو تدبیریں اور کوششیں کرتے ہیں اور اس سلسلے میں جن اسباب کا استعمال کرتے ہیں، وہ سب اللہ تعالیٰ کی قضاء وقدر کے ماتحت ہیں گویا اللہ تعالیٰ کی طرف ہی سے یہ مقدّر اور مقرر ہوتا ہے کہ فلاں شخص پر فلاں وقت میں فلاں بیماری آئے گی اور فلاں قسم کی جھاڑ پھونک یا فلاں دوا کے استعمال سے وہ اچھا ہو جائے گا۔ اسی طرح یہ بھی اس کی تقدیر میں ہے کہ فلاں شخص فلاں تدبیر استعمال کرے گا تو خطرے اور نقصان سے محفوظ رہے گا مختصر یہ کہ اسباب تقدیر سے خارج نہیں ہیں بلکہ تقدیر ہی میں لکھا ہوتا ہے کہ دوا استعمال کرو گے تو شفایاب ہو گے۔ ڈھال استعمال کرو گے تو دشمن کے وار سے بچ جاؤ گے۔ وَعلیٰ ہٰذ القیاس

درحقیقت تقدیرِ الٰہی پر ایمان لانا اسلام کی شرائط میں سے ہے یعنی ایک

مسلمان پر لازم ہے کہ وہ تقدیرِ الٰہی پر ایمان لائے۔ قرآنِ حکیم جگہ جگہ مسئلہء تقدیر کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالتا ہے اور بنی نوعِ انسان کی رہنمائی کرتا ہے۔

سورۃ الفرقان میں ارشاد ہوتا ہے:

وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ فَقَدَّرَهٗ تَقْدِيْرًا (آیۃ ۔۲)

"اس نے ہر چیز کو پیدا کیا پھر اس کی تقدیر کو اس کے لیے مقدّر کر دیا۔"

سورۃ الانعام میں فرمایا گیا ہے:

وَعِنْدَهٗ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَآ اِلَّا هُوَ ط وَيَعْلَمُ مَا فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ ط وَمَا تَسْقُطُ مِنْ وَّرَقَةٍ اِلَّا يَعْلَمُهَا وَلَا حَبَّةٍ فِيْ ظُلُمٰتِ الْاَرْضِ وَلَا رَطْبٍ وَّلَا يَابِسٍ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ (آیۃ ۵۹)

ترجمہ: "اسی (اللہ) کے پاس غیب کی کنجیاں ہیں جنہیں اس کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ بحر و بر میں جو کچھ ہے سب سے وہ واقف ہے۔ درخت سے گرنے والا کوئی پتا ایسا نہیں جس کا اسے علم نہ ہو۔ زمین کے تاریک پردوں میں کوئی ایسا دانہ نہیں جس سے وہ باخبر نہ ہو۔ خشک و تر سب کچھ ایک کھلی کتاب میں لکھا ہوا ہے۔"

سورۃ الاحزاب میں ارشاد ہوتا ہے:

وَكَانَ اَمْرُ اللّٰهِ قَدَرًا مَّقْدُوْرًا (آیۃ ۳۸)

"ترجمہ: اللہ کا حکم ایک قطعی طے شدہ فیصلہ ہوتا ہے"

سورۃ التغابن میں فرمایا گیا ہے:

مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِيْبَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ط (آیۃ - ۱۱)

ترجمہ: "کوئی مصیبت کبھی نہیں آتی مگر اللہ کے اِذن ہی سے آتی ہے"

اسی طرح قرآنِ حکیم میں اور بہت سی آیات ہیں جو ہمیں بتاتی ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے کائنات کی ہر شے کی حد اور مقدار مقرر کر دی ہے جس سے کوئی شے تجاوز نہیں کر سکتی، کائنات کا ذرّہ ذرّہ زندانیٔ تقدیر ہے، امرِ الٰہی ازل سے مقرر شدہ ہے۔ قسمتوں کو بنانا اور بگاڑنا اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے، اس کے حکم کے بغیر پتا بھی

نہیں ہل سکتا۔ دنیا میں مصیبتیں اور تکلیفیں نہ تو ہمارے بلانے سے آتی ہیں اور نہ ہمارے ٹالے سے ٹلتی ہیں جو کچھ بھی ہم پر گزرتی ہے اس کے حکم سے گزرتی ہے۔ اللہ کی مشیّت کے مقابلے میں انسان کی کوئی تدبیر ہرگز کارگر نہیں ہو سکتی۔ اس کے فیصلوں کو روکنا کسی کے بس کی بات نہیں۔ انسان کا کوئی خیال ہو یا عمل، نیّت ہو یا ارادہ، کوئی بھی چیز اللہ تعالیٰ کی مقرّر کی ہوئی تقدیر سے باہر نہیں۔ وہ پاک پروردگار کسی جگہ بھی عاجز اور انسان کے کاموں میں بے دخل نہیں بلکہ وہ قادر اور حاکم ہے اور ارض و سما میں اس کے حکم کے سوا کسی اور کا حکم نہیں چل سکتا۔ کوئی قوم نہ اللہ کی دی ہوئی مہلت سے پہلے مِٹ سکتی ہے اور نہ اس کے بعد باقی رہ سکتی ہے۔ وہ جس کو چاہتا ہے اپنی زمین کا وارث بنا دیتا ہے جتنا رزق کسی کی تقدیر میں لکھا ہے وہی اس کو ملتا ہے۔ اس میں کمی بیشی اللہ کے اختیار میں ہے اور یہ بھی تقدیر میں لکھی ہوتی ہے۔ ہدایت اور ضلالت اللہ کے اختیار میں ہے وہ جسے چاہتا ہے، ہدایت دیتا ہے اور جسے گمراہی میں پھینک دیتا ہے اسے کوئی ہدایت نہیں دے سکتا۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر انسان کا ہر عمل اس کی تقدیر میں لکھا ہوا ہے تو کیا اسے مجبورِ محض سمجھنا چاہیے؟ اور اگر وہ مجبورِ محض ہے تو پھر آخرت میں اس کے محاسبے کا کیا جواز ہے؟

اس سوال کا جواب یا اس اِشکال کا حل حضرت ابی خزامہ رضی اللہ عنہٗ کے سوال کے جواب میں رسول اللہ ﷺ کے اس ارشاد سے مل جاتا ہے جس کو اس مضمونِ کے آغاز میں بیان کیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں صحیحین کی ایک حدیث ملاحظہ ہو:

حضرت علی رضی اللہ عنہٗ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، تم میں سے ہر شخص کی دوزخ اور جنّت لکھی جا چکی ہے یعنی اگر وہ (اللہ) چاہتا تو تم سب کو ہدایت دے دیتا۔ لوگوں نے اس پر کہا، یا رسول اللہ! پھر ہم اپنے لکھے ہوئے یعنی تقدیر کا کیوں نہ سہارا لیں اور عمل چھوڑ دیں۔؟

آپؐ نے فرمایا، ”عمل کرو کیونکہ ہر شخص کو اسی بات کی توفیق ملتی ہے جس

کے لیے وہ پیدا کیا گیا ہے۔ جو خوش نصیب ہو اس کو ایسے عمل کی توفیق ملتی ہے جس سے جنت ملے اور جو بد نصیب ہے اس کو ایسے عمل کی توفیق ملتی ہے جس کے نتیجے میں اس کو جہنم ملے۔

اس کے بعد آپؐ نے سورہ وَالَّیْل کی یہ آیات پڑھیں:

فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰی وَاتَّقٰیۙ وَصَدَّقَ بِالْحُسْنٰیۙ فَسَنُیَسِّرُہٗ
لِلْیُسْرٰیۙ وَاَمَّا مَنْۢ بَخِلَ وَاسْتَغْنٰیۙ وَكَذَّبَ بِالْحُسْنٰیۙ فَسَنُیَسِّرُہٗ
لِلْعُسْرٰیۙ (آیات:۵تا۱۰)

اس حدیث میں آنے والی قرآنی آیات کا ترجمہ اور تشریح یہ ہے:

جس نے (راہِ خدا میں) مال خرچ کیا اور تقوٰی کی راہ اختیار کی اور بھلائی کو سچ مانا (یا بہترین بات کی تصدیق کی) اس کو ہم آسان راستے کے لیے سہولت دیں گے (یعنی ہم اس کو جنت دلانے والی نیکی کے کاموں کی توفیق دیں گے) اور جس نے اپنا مال (راہِ خدا میں) دینے میں بخل کیا اور اللہ سے بے نیاز رہا اور بھلائی کو جھٹلایا تو ہم اس کو سخت راستے کے لیے سہولت دیں گے (یعنی اس کو جہنم کا مستحق بنانے والے کاموں کی توفیق دیں گے۔)

تقدیر کے بارے میں قرآنی آیات اور رسولِ اکرم ﷺ کے ارشادات کی روشنی میں جمہور علماءِ اسلام نے یہ مؤقف اختیار کیا ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو ہر شخص کو ہدایت یافتہ ہی پیدا کرتا یا سب انسانوں کو ہدایت دیتا جیسا کہ اس نے فرمایا:

وَلَوْ شَآءَ لَهَدٰىكُمْ اَجْمَعِیْنَ (النحل:۹)

''یعنی اگر وہ اللہ چاہتا تو تم سب کو ہدایت دے دیتا''

لیکن یہ اس کی مشیّت کا تقاضا نہ تھا۔ اس کی مشیّت یہ تھی کہ انسان کو عقل و شعور اور ذرائع علم سے بہرہ ور کر کے اتنا اختیار یا آزادی دی جائے کہ وہ نیکی اور بدی، خیر اور شر، صحیح اور غلط، حق اور باطل میں تمیز کر سکے اور اپنے لیے راہِ عمل کا انتخاب کر سکے۔ حق تعالیٰ نے انسان کو اندر اور باہر کی بے شمار چیزوں پر تصرّف عطا کیا

اور اس کے ظاہر و باطن میں ہر طرف بے شمار ایسے اسباب بھی رکھ دیے جو اُس کے لیے ہدایت کا موجب بھی بن سکتے ہیں اور گمراہی کا موجب بھی۔ ساتھ ہی اس نے انسان کو اپنے ارادے اور اختیار سے اچھا یا برا عمل کرنے کی آزادی دے دی۔ اگر تمام انسان پیدائشی طور پر ہدایت یافتہ ہوتے تو سب چیزیں بے مقصد اور بے معنی ہو جاتیں۔ دراصل انسان کا عمل ہی وہ شے ہے جس کی بنیاد پر اس کا محاسبہ ہوگا۔ اس کا ہر عمل اور آخرت میں اس کی جزا اور سزا ہر بات اس کی تقدیر میں لکھ دی گئی ہے۔ بالُفاظِ دیگر ہر انسان کی تقدیر میں یہ لکھا ہوا ہے کہ وہ اپنے ارادے اور اختیار سے ایسا کرے گا پھر اس سے کیا نتیجہ نکلے گا اور اس کو کیا جزا یا سزا ملے گی۔ اگر انسان کسی مصیبت یا تکلیف میں مبتلا ہوتا ہے اور اس کے نتیجے میں وہ ناکارہ اور معذور ہو جاتا ہے یا مر جاتا ہے تو بھی اس کی تقدیر میں مرقوم ہے اور اگر وہ دعا، توبہ، استغفار یا کسی دوا سے صحت یاب ہو جاتا ہے یا اس کی مصیبت ٹل جاتی ہے تو یہ سب کچھ اس کی تقدیر میں لکھا ہے۔ صحیح مسلم میں حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، ہر چیز تقدیر سے ہے یہاں تک کہ آدمی کا ناکارہ ہونا یا قابل اور ہوشیار ہونا بھی تقدیر ہی سے ہے۔

خلاصہء کلام یہ ہے کہ انسان نہ تو ایسا ''مجبورِ محض'' ہے کہ اپنے ہر بھلے برے کام کا ذمہ دار اللہ تعالیٰ کو ٹھہرائے اور کہے کہ اس کے خالق اور مالک نے اس سے یہ کام زبردستی لیا ہے اس لیے اس کا محاسبہ عدل کے منافی ہوگا لیکن انسان اتنا خود مختار بھی نہیں کہ اپنی عقل اور تدبیر سے ہر کام اپنی مرضی کے مطابق کر سکے۔ ایک مسلمان کا ایمان اس بات پر ہونا چاہیے کہ دنیا میں جو چیز وقوع پذیر ہوتی ہے اور انسان کو مہد سے لحد تک اور آخرت میں جو کچھ پیش آتا ہے وہ تقدیر میں لکھا ہوا ہے۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ انسان اپنے کسی عمل کا ذمہ دار نہیں۔ فی الحقیقت

عمل سے زندگی بنتی ہے، جنّت بھی جہنّم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نُوری ہے نہ ناری ہے

ذِکرِ الٰہی

قرآنِ حکیم اور احادیثِ نبوی میں مومن کے جو اوصاف بیان ہوئے ہیں ان میں سب سے بڑا وصف یہ ہے کہ وہ دُکھ اور سُکھ، تنگدستی اور فارغ البالی، بیماری اور تندرستی ہر حال میں اللہ تعالیٰ کی رضا پر شاکر رہتا ہے اور اس کی حمد وثناء اور تسبیح و تقدیس میں مشغول رہتا ہے۔ سورۂ آلِ عمران میں ارشاد ہوا ہے:

اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّھَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی
الْاَلْبَابِ ۝ۙۚ الَّذِیْنَ یَذْکُرُوْنَ اللّٰہَ قِیٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰی جُنُوْبِھِمْ وَیَتَفَکَّرُوْنَ
فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ (آیۃ:۱۹۰-۱۹۱)

یعنی زمین اور آسمان کی پیدائش میں اور رات اور دن کے باری باری سے آنے میں اُن ہوشمند لوگوں کے لیے بہت نشانیاں ہیں جو اُٹھتے، بیٹھتے اور لیٹتے ہر حال میں اللہ کو یاد کرتے ہیں اور آسمان و زمین کی ساخت پر غور و فکر کرتے ہیں۔

یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ اللہ کو یاد کرنے یا اس کا ذکر کرنے سے کیا مراد ہے۔ فی الحقیقت ذِکرِ الٰہی کا اِطلاق اپنے وسیع معنٰی کے اعتبار سے نماز، تلاوتِ قرآن اور دعاء و استغفار سبھی پر ہوسکتا ہے لیکن مخصوص عرف و اصطلاح میں اللہ جَلَّ شانُہٗ کی توحید و تمجید، تسبیح و تقدیس، شکر و سپاس، اس کی کبریائی اور صفاتِ کمال کے بیان اور دھیان کو ذِکرُ اللہ کہا جاتا ہے لیکن یَذْکُرُوْنَ کے ساتھ یَتَفَکَّرُوْنَ بھی فرمایا گیا ہے۔ اس سے مراد اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں غور و فکر کرنا ہے۔ یہ غور و فکر اللہ کے ذاکر بندوں کو یقیناً اس نتیجے پر پہنچاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کائناتِ ارضی و سماوی کی کسی شے کو بے مقصد پیدا نہیں کیا بلکہ اپنی بندگی کے لیے پیدا کیا ہے اور انسان کے لیے آخرت کی کامیابی اسی بندگی کے ساتھ مشروط ہے۔ گویا ذکر و فکر مومن کی زندگی کا ایک تابندہ اور قابلِ تقلید پہلو ہے اس کی بَرَکات میں سرِ فہرست اللہ کا قُرب اور اس کی رضا ہے۔ یہ قُرب و رضا آخرت میں تو یقیناً کامیابی کی ضمانت ہے دنیا میں بھی ذِکرِ الٰہی تسکینِ روح

اور اطمینانِ قلب کا باعث ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ اَلَا بِذِکْرِ اللّٰہِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْب (الرّعد:۲۸) یعنی جان لو کہ اللہ کے ذکر ہی سے دلوں کو چین اور سکون ملتا ہے۔

علامہ آلوسی رحمۃ اللہ علیہ نے تفسیر ''روح المعانی'' میں لکھا ہے کہ قوتِ فکریہ کی صحت نورِ ذکر پر موقوف ہے کیونکہ عقل ہدایت کے لیے کافی نہیں جب تک ذِکرِ الٰہی کے نور سے منوّر نہ ہو۔ مطلب یہ ہے کہ ذکرِ الٰہی کو فکر پر تقدّم حاصل ہے ہوشمند اور صاحبِ بصیرت وہی بندے ہیں جو ہر حال میں اللہ کا ذکر کرتے رہتے ہیں اور جو ذکرِ اللہ سے غافل ہیں وہ عقل و بصیرت سے محروم ہیں اور ان کی فکر پراگندہ اور ژولیدہ ہوسکتی ہے۔ ذکرِ الٰہی کی اہمیّت کو سمجھنے کے لیے سورۂ عنکبوت میں وارد ہونے والے اس ارشادِ خداوندی کو پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے۔ وَلَذِکْرُ اللّٰہِ اَکْبَرُ (آیۃ:۴۵) ''یعنی یقین کرو کہ اللہ کا ذکر ہر چیز سے بزرگ تر ہے'' اور پھر قرآنِ پاک میں جہاں جابجا اللہ تعالیٰ کا ذکر کثرت سے کرنے کا حکم دیا گیا ہے وہاں اس کے ثمرات بھی واضح طور پر بیان کردیے گئے ہیں۔ پہلا ثمرہ تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنے والے کو اللہ بھی یاد رکھے گا جیسا کہ سورۂ بقرہ میں ارشاد ہوا ہے فَاذْکُرُوْنِیْٓ اَذْکُرْکُمْ دوسرا ثمرہ اطمینانِ قلب ہے اور تیسرا ثمرہ خاص بخشش اور ثوابِ عظیم جیسا کہ سورۂ احزاب میں فرمایا گیا ہے:

وَالذّٰکِرِیْنَ اللّٰہَ کَثِیْرًا وَّ الذّٰکِرٰتِ لا اَعَدَّ اللّٰہُ
لَھُمْ مَّغْفِرَۃً وَّاَجْرًا عَظِیْمًا۔ ○ (آیۃ:۳۵)

''اور کثرت سے اللہ کا ذکر کرنے والے اس کے بندے اور اس کی بندیاں، اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے خاص بخشش اور بڑا اجر مہیّا کر رکھا ہے''

کثرت سے اللہ کا ذکر کرنے کا مطلب ہی یہ ہے کہ ہر مومن اور مومنہ کی زبان پر زندگی کے ہر معاملے میں اور ہر حال میں اللہ تعالیٰ کا نام آتا رہے۔ اس کے لیے وقت کی کوئی قید نہیں جبکہ دوسری جتنی بھی عبادات ہیں ان کے لیے بہر حال کوئی

وقت ہوتا ہے۔ ذکرِ الٰہی کی عبادت ہر وقت جاری رکھی جا سکتی ہے کثرت سے اللہ کا ذکر کرنے والے جب کوئی دوسری عبادت کرتے ہیں تو اُن کو یہی نیک عمل کرنے والے اُن لوگوں سے بہت زیادہ اجر ملتا ہے جو اللہ کا ذکر ہمیشہ نہیں چند خاص اوقات ہی میں کرتے ہیں۔ مُسنَدِ احمد میں حضرت مُعاذ بن اَنَس جہنی رضی اللہ تعالیٰ عنہُ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا کہ یا رسول اللہؐ جہاد کرنے والوں میں سے زیادہ اجر پانے والا کون ہے؟ آپؐ نے فرمایا، جو اُن میں اللہ تعالیٰ کا سب سے زیادہ ذِکر کرنے والا ہے۔ اس نے عرض کیا، روزہ رکھنے والوں میں سب سے بڑھ کر اجر کون پائے گا؟ آپؐ نے فرمایا، جو ان میں سے سب زیادہ اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنے والا ہو۔ پھر اُس شخص نے اسی طرح نماز، زکوٰۃ، حج اور صدقہ ادا کرنے والوں کے مُتعلّق پوچھا اور رسول اللہ ﷺ نے ہر ایک کا یہی جواب دیا کہ جو اللہ تعالیٰ کا سب سے زیادہ ذکر کرنے والا ہو۔

امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے ''دعوات الکبیر'' میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد نقل کیا ہے کہ ہر چیز کی صفائی کے لیے کوئی صیقل ہے اور دلوں کا صیقل (یعنی ان کی صفائی کا مسالہ) اللہ کا ذکر ہے اور اللہ کے عذاب سے بچانے اور نجات دلانے میں اللہ کا ذکر جس قدر مؤثر ہے۔ اتنی کوئی دوسری چیز مؤثر نہیں۔ لوگوں نے عرض کیا، یا رسول اللہ! جہاد فی سبیل اللہ بھی نہیں؟ آپؐ نے ارشاد فرمایا ہاں! وہ جہاد بھی عذابِ خداوندی سے نجات دلانے میں ذِکر کے برابر مؤثر نہیں جس کا کرنے والا ایسی جانبازی سے جہاد کرے کہ تلوار چلاتے چلاتے اس کی تلوار بھی ٹوٹ جائے۔

جس طرح قرآنِ حکیم کی بعض آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کے ذِکر کو ہر چیز کے مقابلے میں عظمت و فوقیت حاصل ہے اسی طرح بہت سی احادیثِ نبوی سے ظاہر ہوتا ہے کہ نماز سے لے کر جہاد تک تمام اعمالِ صالحہ کی روح اور جان اللہ کا ذکر ہے اور یہ ذکر نہایت عاجزی اور خوف کے ساتھ ہونا چاہیے جیسا کہ سورۃ الاعراف میں

فرمایا گیا ہے:

وَاذْکُرْ رَّبَّکَ فِیْ نَفْسِکَ تَضَرُّعًا وَّخِیْفَۃً (آیۃ: ۲۰۵)

''یعنی اپنے رب کا ذِکر کرو اپنے جی میں (یعنی دل سے) گڑگڑا کر اور خوف کی کیفیت کے ساتھ''

قرآن و حدیث میں جس طرح اللہ کے ذکر کی تاکید کی گئی ہے وہاں اہلِ ایمان کو یہ بھی بتایا گیا ہے کہ جو لوگ اولاد، دولت، طاقت اور اقتدار کے گھمنڈ میں یا دنیا کی لذّتوں اور بہاروں میں مست ہو کر اللہ کی یاد سے غافل ہو جائیں گے وہ بڑے گھاٹے اور نقصان میں رہیں گے۔

سورۃ المُنٰفِقُوْن میں ارشاد ہوا ہے:

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تُلْھِکُمْ اَمْوَالُکُمْ وَلَآ اَوْلَادُکُمْ عَنْ ذِکْرِ اللّٰہِ (آیۃ: ۹)

یعنی اے لوگو! جو ایمان لائے ہو تمہارے مال اور تمہاری اولادیں تم کو اللہ کے ذکر سے غافل نہ کر دیں۔

سورۂ نور میں ان لوگوں کا جو ہر حال میں اللہ کا ذکر کرتے ہیں اس طرح ذکر کیا گیا ہے

رِجَالٌ لَّا تُلْھِیْھِمْ تِجَارَۃٌ وَّلَا بَیْعٌ عَنْ ذِکْرِ اللّٰہِ (آیۃ: ۳۷)

''یعنی وہ لوگ جن کو تجارت اور خرید و فروخت اللہ کے ذکر (اللہ کی ی یاد) سے غافل نہیں کرتی''

ایک مسلمان پر لازم ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی یاد سے کسی وقت بھی غافل نہ ہو۔ وہ زندگی کا ہر (جائز اور ضروری) کام معمول کے مطابق کرتا رہے لیکن اپنا دھیان ہمہ دم اس یقین کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی طرف رکھے کہ وہ مجھے دیکھ رہا ہے، وہ میری ہر بات سن رہا ہے، وہ میرے دل کا حال جانتا ہے، وہی بہترین کارساز اور مشکل کشا ہے وہی رازق اور حاجت روا ہے۔ اسلام کا اپنے ہر ماننے والے سے تقاضا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت پر کامل ایمان رکھے اور اپنی کوشش اور تدبیر کے ساتھ توکل اللہ تعالیٰ ہی پر کرے وہ ہر دم اسی کے رحم اور فضل کا امیدوار رہے اور کسی نہ کسی صورت میں اس کا

ذِکر کرتا رہے۔ کوئی کام شروع کرے تو کہے "بِسْمِ اللّٰہِ" کوئی وعدہ کرے تو کہے "اِنْ شَاءَ اللّٰہ" کوئی اس پر احسان کرے تو کہے "جَزَاکَ اللّٰہ" کسی کی موت کی خبر سنے تو کہے "اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن"۔ کہیں گناہ کا سامان یا معصیت کی بات دیکھے تو کہے "اَسْتَغْفِرُ اللّٰہ" اچھائی اور قلب ونظر کو اچھی لگنے والی چیز دیکھے تو کہے "مَاشَاءَ اللّٰہ" رسولِ اکرم ﷺ کا اسمِ گرامی سنے تو کہے "صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمْ" چھینک آئے یا کوئی نعمت/خوشی حاصل ہو تو کہے "اَلْحَمْدُ لِلّٰہ"۔ کسی دوسرے کی چھینک سنے تو جواب میں کہے "یَرْحَمُکَ اللّٰہ"۔ اچھی بات سنے تو کہے "سُبْحَانَ اللّٰہ"۔ خیریت پوچھے جانے پر کہے "اَلْحَمْدُ لِلّٰہ"۔ شیطان سے بچنے کے لیے کہے "اَعُوْذُ بِاللّٰہ"۔ صحابۂ کرام کا نام لے تو کہے "رَضِیَ اللّٰہ تعالٰی عَنْہُ"۔ مرحومین کا نام لے تو کہے "رَحِمَہُ اللّٰہ"۔ کسی کا ڈر ہو یا خوف ہو تو کہے "حَسْبِیَ اللّٰہ"۔

شیخ سعدی شیرازی رحمۃ اللہ علیہ نے کیا خوب لکھا ہے:

"ہر نفسے کہ فرو مے رَوَد ممدِ حیات است
وچوں برمی آید مفرحِ ذات، پس در
ہر نفسے دو نعمت موجود است و بر
ہر نعمتے شکرے واجب"۔

یعنی ہر سانس جو نیچے (اندر) جاتا ہے، وہ زندگی بڑھانے والا ہے اور وہی سانس جب اوپر آتا ہے وہ ذات کو فرحت بخشتا ہے پس ہر سانس میں دو نعمتیں موجود ہیں اور ہر نعمت پر اللہ تعالیٰ کا شکر واجب ہے۔

گویا انسان کی زندگی کا کوئی لمحہ اپنے خالق و مالک کے ذکر اور شکر سے خالی نہیں رہنا چاہیے ذِکرِ الٰہی کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ ذکر کرنے والے کو خود اللہ تعالیٰ یاد رکھتا ہے جیسا کہ سورۂ بقرہ میں ارشاد ہوا ہے:

فَاذْکُرُوْنِیْٓ اَذْکُرْکُمْ وَشْکُرُوْا لِیْ وَلَا تَکْفُرُوْنِ (آیۃ:۱۵۲)

یعنی (اے لوگو!) تم میرا ذکر کرو میں تمہیں یاد رکھوں گا اور میرا شکر ادا کرو، کفرانِ نعمت نہ کرو۔

صحیح بخاری میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جب میرا بندہ مجھے یاد کرتا ہے اور میری یاد میں اس کے ہونٹ ہلتے ہیں تو اس وقت میں اس کے ساتھ ہوتا ہوں۔

گویا ذکرِ الٰہی کرنے والے کو اللہ تعالیٰ کا سایۂ رحمت براہِ راست نصیب ہو جاتا ہے۔

صحیح مسلم میں حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ سے روایت ہے کہ ایک اعرابی (دیہاتی عرب) رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا اور عرض کیا، مجھے کوئی ایسا کلام سکھا دیجیے جس سے میں اپنے ربّ کو یاد کروں۔ آپؐ نے فرمایا کہو

لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ اَللّٰهُ اَكْبَرُ كَبِيْرًا وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ كَثِيْرًا وَسُبْحَانَ اللّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ، لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ. (۱)

اس شخص نے کہا کہ یہ تو اللہ کے لیے ہوا، میرے لیے کیا ہے، میں کیا کہوں، آپؐ نے فرمایا، تم کہو اَللّٰهُمَّ اغْفِرْلِيْ وَارْحَمْنِيْ وَاهْدِنِيْ وَارْزُقْنِيْ (۲)

دعا ہے اللہ تعالیٰ ہم سب کو توفیق دے کہ ہم خوف اور زاری کے ساتھ ہر حال میں اپنے خالق و مالک کا ذکر کرتے رہیں۔

---

(۱) ترجمہ: اللہ کے سوا کوئی اور اِلٰہ (معبود) نہیں وہ اکیلا ہے کوئی اس کا شریک نہیں اللہ سب سے بڑا ہے۔ اس کے لیے شکر اور تعریف ہے۔ اللہ ہر نقص اور عیب سے پاک ہے، سارے جہانوں کا مالک (پالنے والا اور آقا) ہے، اللہ کے سوا کسی کے پاس کوئی قوت نہیں، وہی عزت اور حکمت والا ہے، (اقتدار کا مالکِ مطلق اور اس کو علم اور انصاف کے ساتھ استعمال کرنے والا ہے)۔

(۲) ترجمہ: ''اے اللہ! تو میرے گناہ معاف فرما دے، مجھ پر رحم فرما، مجھے ہدایت نصیب فرما اور مجھے رزق عنایت فرما۔

توبہ

"توبہ" عربی زبان کا (مؤنث) لفظ ہے۔ اس کے ایک معنٰی تو رُجوع کرنے اور پلٹنے کے ہیں اور دوسرے معنٰی یہ ہیں کہ انسان سے جو غلطی سرزد ہوئی ہو، وہ اس پر نادِم ہو اور جس برائی کا وہ مرتکب ہوا ہے یا ہوتا رہا ہے اس سے باز آ جائے اور آئندہ اس کا اِرتکاب نہ کرنے کا عہد کرے۔ گناہ کا ارتکاب کرنے والے کسی بندۂ مسلمان کے توبہ کرنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ اللہ کی نافرمانی یا سرکشی سے باز آ گیا اور طریقِ بندگی کی طرف پلٹ گیا۔ جب اللہ جَلَّ شَانُہٗ 'اپنے آپ کو تَوَّاب کہتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے شرمسار بندے پر رحمت کی نظر کرنے والا 'بڑا توبہ قبول کرنے والا ہے۔ توبہ کِن لوگوں کی قبول ہوتی ہے اور کِن لوگوں کی نہیں ہوتی؟ اس کا جواب سورۃ النِّسَاء میں یوں دیا گیا ہے:

> ترجمہ: یہ جان لو کہ اللہ پر توبہ کی قبولیت کا حق انہی لوگوں کے لیے ہے جو نادانی کی وجہ سے کوئی برا فعل کر بیٹھتے ہیں اور اس کے بعد جلد ہی توبہ کر لیتے ہیں۔ ایسے لوگوں پر اللہ اپنی نظرِ عنایت سے پھر متوجہ ہو جاتا ہے اور اللہ ساری باتوں کی خبر رکھنے والا حکیم و دانا ہے مگر توبہ اُن لوگوں کے لیے نہیں ہے جو بُرے کام کیے چلے جاتے ہیں یہاں تک کہ جب اُن میں سے کسی کی موت کا وقت آ جاتا ہے تو وہ کہتا ہے کہ میں نے توبہ کی اور اسی طرح توبہ ان کے لیے بھی نہیں جو مرتے دم تک کافر رہیں۔ (آیۃ ۱۷-۱۸)

اسی طرح سورۃ الانعام میں ارشاد ہوا ہے:

> جب تمہارے پاس وہ لوگ آئیں جو آیات پر ایمان لاتے ہیں تو ان سے کہو تم پر سلامتی ہے۔ تمہارے رَبّ نے رحم و کرم کا شیوہ اپنے اوپر لازم کر لیا ہے۔ یہ اس کا رحم و کرم ہی ہے کہ اگر تم

> میں کوئی نادانی سے کسی برائی کا ارتکاب کر بیٹھا ہو پھر اس کے بعد توبہ کرے اور اصلاح کرے تو وہ اسے معاف کر دیتا ہے اور نرمی سے کام لیتا ہے۔ (آیۃ ۵۴)

اِن ارشاداتِ ربّانی سے صاف ظاہر ہے کہ توبہ صرف اہلِ ایمان کی قبول ہوتی ہے اور صِرف اُن اہلِ ایمان کی جو قصداً نہیں بلکہ نادانی کی بناء پر قصُور کرتے ہیں اور جب اُن کی آنکھوں سے جہالت کا پردہ ہٹتا ہے تو شرمندہ ہو کر توبہ کر لیتے ہیں۔ ایسے بندے جب بھی اپنے قصُور پر نادم ہو کر اللہ تعالیٰ کی طرف رُجوع کریں گے، اُس کا دروازہ کھلا پائیں گے۔

اِیں دَرگہِ ما دَرگہِ نَومیدی نیست
صد بار اگر توبہ شکستی باز آ

مگر اُن لوگوں کی توبہ قبول نہیں ہوتی جو اللہ کے خوف سے بے نیاز ہو کر تمام عُمر گُناہ پر گُناہ کیے چلے جائیں اور پھر جب مَوت سر پر آ کھڑی ہو اُس وقت اللہ سے معافی مانگنے لگیں۔ رسولِ اکرم ﷺ نے فرمایا ہے کہ اللہ بندے کی توبہ بَس اُسی وقت قبُول کرتا ہے جب تک آثارِ موت شروع نہ ہو جائیں۔ اِس ارشادِ نبَوی ﷺ کے مطابق موت کے وقت انسان کے امتحان یا آزمائش کی مہلت پوری ہو جاتی ہے چونکہ وہ امتحان میں پورا نہیں اترا اس لیے اِس کی توبہ کا وقت بھی گزر گیا۔ اسی طرح جب کوئی شخص دَولتِ ایمان سے محروم رہا اور کُفر کی حالت میں مَرا مَوت کے وقت اس کی توبہ بھی قبول نہیں ہوتی۔ یہاں یہ امر بھی پیشِ نظر رہنا چاہیے کہ اگر کوئی مسلمان توبہ کرتا ہے تو اس توبہ کا تقاضا یہ ہے کہ توبہ کرنے والے سے جو گناہ پہلے سرزد ہو چکے ہوں وہ ان کی تلافی کرنے کی پوری کوشش کرے اور جہاں تلافی کی کوئی صورت ممکن نہ ہو تو اللہ سے بار بار معافی مانگے اور زیادہ سے زیادہ نیکیاں کر کے اُس داغ کو دھوتا رہے جو اُس کے دامن پر لگ چُکا ہے لیکن کوئی توبہ اس وقت تک سچّی توبہ نہیں ہوتی جب تک کہ یہ اللہ اور صرف اللہ کو راضی کرنے کی نیّت سے نہ ہو۔ کسی دوسری وجہ

یا غرض یا کسی مجبوری کی بناء پر کسی بُرے فعل کو چھوڑ دینا توبہ کی تعریف ہی میں نہیں آتا۔

سورۂ ہود میں ہے کہ حضرت شعیب علیہ السّلام نے اپنی قوم کو نصیحت کرتے ہوئے فرمایا:

وَاسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْا اِلَيْهِ ؕ اِنَّ رَبِّيْ رَحِيْمٌ وَّدُوْدٌ ۝ (آیۃ:۹۰)

یعنی اپنے ربّ سے معافی مانگو اور اس کی طرف پلٹ آؤ۔ بے شک میرا ربّ رحیم ہے اور اپنی مخلوق سے مَحبت رکھتا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ اللہ کو اپنے بندوں کا توبہ کرنا بہت محبوب ہے وہ بڑا رحم کرنے والا ہے اور اپنی پیدا کی ہوئی مخلوق سے بے پایاں محبت رکھتا ہے یہی بات رسول اللہ ﷺ نے یہ مثال دے کر واضح فرمائی کہ اگر تم میں سے کسی شخص کا اونٹ ایک لق و دق صحرا میں گم ہو گیا ہو اور اس کے کھانے پینے کا سامان بھی اونٹ پر لدا ہو اور وہ شخص اس کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر مایوس ہو چکا ہو یہاں تک کہ زندگی سے ناامید ہو کر ایک درخت کے نیچے لیٹ گیا ہو اور عین اس حالت میں وہ یکایک دیکھے کہ اُس کا اونٹ اُس کے سامنے کھڑا ہے تو اُس وقت جیسی خوشی اس کو ہوگی اس سے بہت زیادہ خوشی اللہ تعالیٰ کو اپنے بھٹکے ہوئے بندے کے توبہ کرنے سے ہوگی۔ ایک اور حدیث میں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ نبی ﷺ کی خدمت میں کچھ قیدی گرفتار ہو کر آئے۔ ان میں ایک عورت بھی تھی جس کا شیر خوار بچہ بچھڑ گیا تھا۔ وہ مامتا کی ماری ایسی بے چین تھی کہ جس بچے کو پا لیتی اسے چھاتی سے چمٹا کر دودھ پلانے لگتی تھی، نبی ﷺ نے اس کا حال دیکھ کر ہم لوگوں سے پوچھا، کیا تم لوگ یہ توقع کر سکتے ہو کہ یہ ماں اپنے بچے کو خود اپنے ہاتھوں سے آگ میں پھینک دے گی؟ ہم نے کہا، ہرگز نہیں خود پھینکنا تو کُجا اگر بچہ خود گرتا ہو تو وہ اپنی حد تک اسے بچانے کے لیے اپنی جان کی بازی لگا دے گی۔ حضور ﷺ نے فرمایا، اللہ کا رحم اپنے بندوں پر اس سے بہت زیادہ ہے جو یہ عورت اپنے بچے کے لیے رکھتی ہے۔

یہ اللہ تعالیٰ کی شانِ رحیمی ہے کہ اس کے بندے بار بار گناہ کرتے ہیں اور

بار بار توبہ کرتے ہیں لیکن وہ ان کی لغزشوں سے ہر بار درگزر کر کے ان کی توبہ قبول کر لیتا ہے کیونکہ اس کو اپنی مخلوق سے بے انتہا محبت ہے اور اس کی رحمت کی بھی کوئی حد نہیں فی الحقیقت اللہ تعالیٰ کی رحمت اس قدر وسیع ہے کہ اس کو احاطہء بیان میں لانا ناممکن ہے اسی لیے اس ذاتِ رحیم وکریم نے ارشاد فرمایا ہے:

لَاتَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ط اِنَّ اللّٰـهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا ط اِنَّهٗ هُوَالْغَفُوْرُ الرَّحِيْم (الزُّمر آیۃ: ۵۳)

یعنی اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو جاؤ، یقیناً اللہ سارے گناہ معاف کر دیتا ہے وہ تو غفورُ الرَّحیم ہے۔

یہاں یہ بات بھی ذہن میں رکھنی چاہیے کہ صرف اہلِ ایمان کی توبہ قبول کرنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اگر کوئی غیر مسلم کفر و شرک سے تائب ہو کر اسلام قبول کر لے تو اس کی توبہ قبول نہ ہوگی۔ عہدِ رسالت میں بے شمار ایسے واقعات ملتے ہیں کہ جو لوگ زمانہء جاہلیّت میں نہایت گھناؤنے جرائم (ڈاکا زنی، دختر کُشی قتل وغارت وغیرہ) کے مرتکب ہوئے تھے انہوں جب اسلام قبول کیا تو رحمتِ عالم ﷺ نے ان کو کھلے لفظوں میں بشارت دی کہ اسلام سے پہلے کے ان کے تمام گناہ اللہ تعالیٰ نے معاف کر دیے۔ گویا رحمتِ الٰہی کی وسعت ان لوگوں پر بھی محیط ہے جو کفر و شرک ترک کر کے دینِ حق قبول کرتے ہیں۔ دعا ہے کہ اللہ ہم سب کو تمام صغیرہ اور کبیرہ گناہوں سے بچنے اور ان سے توبہ کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

خیر وشرّ میں اِمتیاز

اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں پر جو بے حساب اور بے شمار احسانات فرمائے ہیں، اُن میں سب سے بڑا احسان یہ ہے کہ اس نے انسانوں کو خیر اور شرّ میں تمیز کرنے کے لیے عقل عطا فرمائی ہے۔ خیر اور شرّ دونوں بڑے وسیع المعانی الفاظ ہیں خیر کا مطلب ہے نیکی، بھلائی، اچھائی، اَمن، سلامتی، بہتر اور شرّ کے لُغوی معنٰی ہیں، کُفر، شِرک، بدی، گناہ، ظلم، شرارت، فساد اور فتنہ انگیزی۔ شرّ کا لفظ ان اسباب کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے جو نقصان، تکلیف ضرر اور دُکھ کا باعث ہوتے ہیں مثلاً بیماری، بھوک، کسی حادثے یا لڑائی میں زخمی ہونا، آگ سے جل جانا، سانپ بچھو وغیرہ کسی زہریلے کیڑے سے ڈسا جانا، اولاد یا کسی دوسرے عزیز کی موت کے غم میں مبتلا ہونا۔ یوں تو اللہ تعالیٰ نے اہلِ ایمان کو ہر قسم کے شرّ سے پناہ مانگنے کی تلقین فرمائی ہے لیکن جس شرّ کو خصوصی طور پر خیر سے مُمیّز کیا جاتا ہے وہ افعالِ شرّ ہیں یعنی کفر، شرک، بدی، گناہ، ظلم، فساد اور فتنہ انگیزی۔ قرآنِ حکیم ہمیں بتاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السّلام یا انسانِ اوّل کی تخلیق کے ساتھ خیر اور شرّ کی تخلیق بھی کر دی، اس کو خیر اور شرّ کا انجام بھی بتا دیا اور یہ اختیار بھی دے دیا کہ وہ اپنی عقل کی مدد سے خیر وشرّ اور صحیح و غلَط میں امتیاز کرے اور ان میں سے جس پر چاہے عمل کرے۔ خیر اور شرّ ایک دوسرے کی ضِد ہیں اس لئے روزِ آفرینش ہی سے ان میں کشمکش شروع ہو گئی جو آج تک جاری ہے اور قیامت تک جاری رہے گی۔ حکیم الاُمّت علامہ اقبالؒ کا یہ شعر اسی کشمکش کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

ستیزہ کار رہا ہے اَزَل سے تا اِمرُوز
چراغِ مُصطفوِیؐ سے شرارِ بو لَہبی

اس شعر میں چراغِ مصطفویؐ سے مراد خیر اور شرارِ بولَہبی سے مراد شرّ ہے۔

اِصطلاحی طور پر ہم خیر کو اسلام یا معروف یعنی اعمالِ نیک اور شرّ کو کفر و شرک یا منکر یعنی اعمالِ بد بھی کہہ سکتے ہیں۔ حضرتِ آدم پہلے انسان اور پہلے مسلمان یا صاحبِ خیر تھے جن کو سب سے پہلے ابلیس کے شرّ سے واسطہ پڑا، جو ہوا سو ہوا، پھر آدم علیہ السّلام یعنی مسلمِ اوّل نے اپنی اولاد کو بھی اسلام کی تعلیم دی۔ پہلے تو ساری اولاد نے اس تعلیم پر عمل کیا پھر ان میں ایسے لوگ پیدا ہو گئے جنہوں نے اسلام کی تعلیم بھلا ڈالی، کسی نے پتھروں، درختوں، سانپوں سورج اور چاند ستاروں کو اپنا معبود بنا لیا، کوئی خود خدا بن بیٹھا اور کسی نے کہا کہ میں آزاد ہوں جو میری مرضی ہوگی وہی کروں گا چاہے اللہ کا حکم کچھ بھی ہو۔ اس طرح دنیا میں کفر و شرک کے شرّ کا آغاز ہو گیا۔ جب یہ شرّ پھیلنے لگا تو اللہ تعالیٰ نے ہر ملک ہر علاقے اور ہر قوم کی طرف اپنے نبی اور رسول بھیجے کہ وہ بگڑے ہوئے لوگوں کو سمجھائیں اور انہیں راہِ حق پر لانے کی کوشش کریں یہ سلسلہ ہزار ہا سال تک چلتا رہا یہاں تک کہ آخر میں ہمارے رسولِ کریم ﷺ خاتم الانبیاء والمرسلین اور رحمۃٌ لِلعالمین بن کر اس دنیا میں تشریف لائے آپؐ کسی خاص علاقے یا قوم کے لئے نہیں بلکہ روئے زمین کے تمام انسانوں کی ہدایت کے لئے مبعوث ہوئے جیسا کہ قرآنِ حکیم میں ارشاد ہوا ہے:

وَمَآ اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا کَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّ نَذِيْرًا وَّلٰکِنَّ اَکْثَرَ النَّاسِ
لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ (سوۂ سبا: آیة ۲۸)

یعنی اے نبی ہم نے آپ کو روئے زمین کے تمام انسانوں کے لئے بشیر و نذیر بنا کر بھیجا ہے مگر اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے دینِ اسلام کو آپؐ پر مکمل کر دیا قرآنِ پاک اللہ کی آخری کتاب ہے جو آپؐ پر نازل ہوئی آپ کی شریعت آخری شریعت ہے اور آپؐ اللہ کے آخری نبی اور رسول ہیں۔ بلاشبہ دوسرے انبیاء اور رسول بھی اسلام ہی کے پیغامبر تھے اور وہ اپنی قوموں کو خیر ہی کی طرف بلاتے اور شرّ سے بچنے کی تلقین کرتے تھے لیکن قرآنِ حکیم اور حاملِ قرآن ﷺ نے جس وضاحت کے

ساتھ خیر اور شرّ کے درمیان حدِ فاصل کھینچی پہلی کسی شریعت میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ اُمّتِ محمّدیہ کے بیشتر افراد بڑی حد تک خیر اور شر کے فرق کو ضرور جانتے ہیں مثلاً انہیں معلوم ہے کہ نماز روزہ اور دوسری عبادات، صدق و دیانت، سخاوت وایثار، صبر وشکر، خدمتِ خلق، عیادت وتعزیت، حلم وتحمل، صلۂ رحمی، اطاعتِ والدین، بزرگوں کا ادب، ہمسایوں سے حسنِ سلوک، اِکرامِ ضیف وغیرہ اعمالِ خیر ہیں اور تکبّر، حسد، شرک، غیبت، چوری، بدعہدی، دروغگوئی، نشہ بازی، فتنہ و فساد، ناپ تول میں کمی، اِسراف، خیانت، والدین کی نافرمانی، حرام خوری، وغیرہ اعمالِ شرّ ہیں۔ سورۃ البلد میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے:

اَلَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ عَيْنَيْنِ ۝ وَلِسَانًا وَّ شَفَتَيْنِ ۝ وَهَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ ۝

(آیات ۸- ۹- ۱۰)

یعنی کیا ہم نے انسان کو دو آنکھیں۔ اور ایک زبان اور دو ہونٹ نہیں دیے۔ اور نیکی اور بدی کے دونوں نمایاں راستے اس کو نہیں دکھا دیے۔

مطلب یہ کہ کیا ہم نے انسان کو علم اور عقل کے ذرائع نہیں دیے جن سے وہ خیر اور شرّ میں تمیز کرے۔ دو آنکھوں سے مراد گائے بھینس کی آنکھیں نہیں بلکہ وہ انسانی آنکھیں جنہیں کھول کر آدمی دیکھے تو اسے ہر طرف وہ نشانات نظر آئیں جو نیکی اور بدی کا فرق سمجھاتے ہیں۔ زبان اور ہونٹوں سے مُراد محض بولنے کے آلات نہیں بلکہ نفسِ ناطِقہ ہے جو ان کی پشت پر سوچنے سمجھنے کا کام کرتا ہے اور پھر ان سے اظہارِ مافی الضمیر کا کام لیتا ہے۔ اور ہم نے انسان کو عقل وفکر کی طاقتیں عطا کر کے اسے چھوڑ نہیں دیا کہ اپنا راستہ خود تلاش کرے بلکہ اس کی رہنمائی بھی کی اور اس کے سامنے بھلائی اور برائی، خیر اور شرّ دونوں کے راستے نمایاں کر کے رکھ دیے تا کہ وہ خوب سوچ سمجھ کر ان میں سے جس کو چاہے اپنی ذمّہ داری پر اختیار کرے۔ اب اللہ جلّ شانہٗ کی شانِ کرم دیکھیے کہ اس نے خیر اور شرّ میں تمیز کرنے کے لئے قوتِ احساس بھی عطا کر دی یعنی انسان (بالخصوص

ایک مسلمان) کا ضمیر نیک کام کر کے راحت محسوس کرتا ہے اور بدی کا کام کر کے آزردہ ہوتا ہے۔ پھر اس نے اہلِ ایمان کو یہ بھی بتا دیا کہ ہر نیکی کا اُجر دس گُنا اور ہر بدی کا بدلہ اسی کے برابر دیا جائے گا جیسا کہ سورۃُ الاُنعام میں ارشاد ہوا ہے:

مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا وَ مَنْ جَآءَ بِالسَّيِّئَةِ
فَلَا يُجْزٰى اِلَّا مِثْلَهَا وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ٥ (آیة - ١٦٠)

یعنی جو اللہ کے حُضور نیکی لے کر آئے گا اس کے لیے دس گنا اجر ہے اور جو بدی لے کر آئے گا اس کو اتنا ہی بدلہ دیا جائے گا جتنا اس نے قصور کیا ہے اور کسی پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔

دعا ہے اللہ تعالیٰ ہمیں شَرّ سے بچائے خیر کا راستہ اختیار کرنے کی توفیق دے اور اپنے نیک بندوں کے ساتھ ہمارا خاتمہ کرے۔ آمین ثم آمین۔

رَبَّنَا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَ كَفِّرْ عَنَّا سَيِّاٰتِنَا وَتَوَفَّنَا مَعَ الْاَبْرَار

اسلامی معاشرہ میں فرد کے فرائض

نیکی کی ترویج

دینِ اسلام محض عقائد و عبادات کے مجموعے کا نام نہیں بلکہ یہ ایک مکمل اور جامع نظامِ حیات ہے۔ اس میں انسانی زندگی کے ہر پہلو اور ہر رُخ کے لیے ابدی ہدایات اور احکام موجود ہیں، جو ایک مسلمان کی دنیاوی اور اُخروی زندگی کے تمام دائروں اور گوشوں پر حاوی ہیں۔ ان کی روشنی میں جو معاشرہ تشکیل پاتا ہے اسے حُسنِ کردار کی مظہر انفرادیت اور اجتماعیت کا نہایت حسین امتزاج کہا جا سکتا ہے۔ اسلام جہاں معاشرے کے ہر فرد کے حقوق و فرائض متعیّن کرتا ہے وہاں وہ مسلمانوں سے یہ مطالبہ بھی کرتا ہے کہ تم میں ہمیشہ ایک ایسی جماعت رہنی چاہیے جو لوگوں کو نیکی کی طرف بلائے، انہیں اچھے کاموں پر لگائے اور برائی سے روکے۔ ظاہر ہے کہ جماعت افراد ہی سے تشکیل پاتی ہے۔ اس لیے بنیادی طور پر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ فرد ہی پر عائد ہوتا ہے، گویا ہر فرد ہے مِلّت کے مقدر کا ستارہ۔

اسلام ''نیک بنو اور نیکی پھیلاؤ'' کا علَمبردار ہے۔ اس لیے کوئی شخص اس وقت تک سچا مسلمان نہیں کہلا سکتا جب تک وہ اُن چار صفات کا حامل نہ ہو جو اللہ تعالیٰ نے دنیا اور آخرت میں انسان کی کامیابی کے لیے ضروری قرار دی ہیں۔ یہ صفات ہیں ایمان، اعمالِ صالح، دوسروں کو حق کی نصیحت اور صبر کی تلقین کرنا۔ قرآنِ حکیم کی سورۃ العصر میں اللہ تعالیٰ نے زمانے کی قسم کھا کر کہا ہے کہ ان صفات سے تہی دامن شخص ہمیشہ خسارے میں رہے گا۔ خسارہ فلاح کی ضد ہے اس لیے فرمانِ الٰہی کا صاف مطلب یہ ہے کہ ایسا انسان دنیا اور آخرت میں ناکام و نامراد رہے گا۔ یہاں یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ قرآنِ حکیم کا تصوّرِ فلاح محض دنیوی خوشحالی کا نام نہیں ہے بلکہ یہ دنیا سے لے کر آخرت تک انسان کی حقیقی کامیابی پر حاوی ہے اور یہ حقیقی کامیابی اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی کا حاصل ہونا ہے۔ اگر ان صفات پر الگ الگ غور کریں

تو معلوم ہوگا کہ یہ اسلامی معاشرے کے ہر فرد کے ہر پہلو کی داخلی نگران اور خارجی معیار ہیں، خلوت ہو یا جلوت، گھر ہو یا میدان، تجارت ہو یا سیاست، امن ہو یا جنگ، تنگ دستی ہو یا آسودہ حالی، سفر ہو یا قیام، ہر حالت میں یہ صفات انسان کو راہِ راست پر رکھیں گی۔

سب سے پہلی صفت ایمان ہے۔ ایمان لانے کا مطلب ہے اللہ وَحْدَہٗ لَاشَرِیک، اس کے پیغمبروں، ملائکہ، کتبِ الٰہیہ اور آخرت کو ماننا۔۔۔ یہ ایمان ہی ہے جو اَخلاق اور سیرت و کردار کے لیے ایک مضبوط بنیاد فراہم کرتا ہے جس پر ایک پاکیزہ زندگی کی عمارت قائم ہو سکتی ہے۔ ورنہ جہاں سرے سے ایمان ہی نہ ہو وہاں انسان کی زندگی بظاہر کتنی ہی خوشنما کیوں نہ ہو، اس کی حیثیت ایک ایسے جہاز کی ہے جس کا کوئی لنگر نہ ہو اور جو موجوں کے تھپیڑوں کے ساتھ بہتا چلا جائے۔ یومِ آخرت پر عقیدہ دل میں اللہ کا خوف پیدا کرتا ہے، یہی ایمان کی روح ہے۔

دوسری صفت نیک کاموں پر عمل کرنا ہے۔ نیک کاموں کی تعریف یہ ہے کہ اللہ اور رسولؐ نے جن کاموں کے کرنے کا حکم دیا ہے وہ کیے جائیں اور جن کاموں سے منع کیا ہے ان سے باز رہا جائے۔ اعمالِ صالح یا نیک کاموں میں سے چند کے عنوانات یہ ہیں: سچ بولنا، عہد کا پورا کرنا، پڑوسیوں کے ساتھ اچھا سلوک کرنا، نرمی سے بات کرنا، عفو و درگزر کرنا، اللہ کی راہ میں خرچ کرنا، والدین کی خدمت کرنا، صلۂ رحمی، مہمان نوازی امانت داری، تواضع اور انکسار، بڑوں کا ادب کرنا، چھوٹوں پر شفقت، سچی گواہی دینا، عدل کرنا، رحم و کرم کرنا، اخلاص کے ساتھ اللہ کی عبادت کرنا، مخلوقِ خدا کی بے غرض خدمت کرنا، جن کاموں سے اللہ تعالیٰ نے منع کیا ہے، اللہ کی رضا کے لیے ان سے رک جانا بھی نیکی ہے۔ ایسے کاموں میں سے چند کے عنوانات یہ ہیں:

بدعہدی، بخل، قطعِ رحمی، ظلم، چوری، بے حیائی، بدچلنی، سود خوری، تکبّر، غصہ، فتنہ و فساد، قتلِ ناحق، ریاکاری، رشوت دینا اور لینا، خیانت، بدگمانی، دروغ گوئی،

ناپ تول میں کمی، غیبت، خوشامد، تمسخر، فضول خرچی، جوئے بازی، شراب خواری اہانتِ نفسِ انسانی۔

نیکی کی ترویج کے لیے محسنِ انسانیت ہادیِ برحق ﷺ کے چند ارشادات ملاحظہ فرمائیے:

حضرت اَنس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ قسم اُس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے' کوئی بندہ سچا مومن نہیں ہوسکتا جب تک کہ وہ مسلمان بھائی کے لیے وہی نہ چاہے جو اپنے لیے چاہتا ہے۔ (صحیحین)

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ہر مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے نہ تو خود اس پر ظلم وزیادتی کرے نہ دوسروں کا نشانۂ ظلم بننے کے لیے اس کو بے مدد چھوڑے۔ اور جو کوئی اپنے ضرورت مند بھائی کی حاجت پوری کرے گا' اللہ تعالیٰ اس کی حاجت روائی کرے گا اور جو کسی مسلمان کو کسی تکلیف اور مصیبت سے نجات دلائے گا اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کو مصیبت اور پریشانی سے نجات عطا فرمائے گا اور جو کسی مسلمان کی پردہ داری کرے گا اللہ تعالیٰ قیامت سے دن اس کی پردہ داری کرے گا۔ (صحیحین)

حضرت جریر بن عبداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا' اس شخص پر اللہ کی رحمت نہ ہوگی جو اس کے پیدا کیے ہوئے انسانوں پر رحم نہ کھائے گا اور ان کے ساتھ ترحّم کا معاملہ نہ کرے گا۔ (صحیحین)

حضرت انس اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ساری مخلوق اللہ تعالیٰ کی عیال (گویا اس کا کنبہ) ہے اس لیے اللہ کو زیادہ محبوب اپنی مخلوق میں وہ آدمی ہے جو اللہ کی عیال (یعنی اس کی مخلوق) کے ساتھ احسان اور اچھا سلوک کرے۔ (شعب الایمان، بیہقی)

غور فرمائیے کہ اگر ہم میں سے ہر فرد رحمتِ عالم ﷺ کے ان ارشادات کو اپنی زندگی کا شعار بنالے تو سارا معاشرہ نیکی کی خوشبو سے کیوں نہ مہک اٹھے گا اور اس

میں خود بخود ہی باطل سوز اجتماعیت کیوں نہ پیدا ہو جائے گی۔ خسارے سے بچنے کے لیے تیسری اور چوتھی صفتیں قرآن نے یہ بتائی ہیں کہ ایمان لانے اور نیک عمل کرنے والے لوگ ایک دوسرے کو حق کی نصیحت اور صبر کی تلقین کریں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اول تو ایمان لانے والوں اور نیک عمل کرنے والوں کو فرد فرد بن کر نہیں رہنا چاہیے بلکہ ان کے باہمی ربط وضبط سے ایک صالح معاشرہ وجود میں آنا چاہیے۔ دوسرے یہ کہ اس معاشرے کے ہر فرد پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ اسے بگڑنے سے بچائے اور اس کے تمام افراد ایک دوسرے کو حق اور صبر کی تلقین کریں۔ حق کا لفظ باطل کی ضد ہے اور بالعموم یہ لفظ دو معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ ایک صحیح اور سچی بات اور دوسرے وہ حق جس کا ادا کرنا انسان پر واجب ہو خواہ وہ اللہ کا حق ہو یا بندوں کا۔ چنانچہ ایک دوسرے کو حق کی نصیحت کا مطلب یہ ہے کہ اسلامی معاشرے میں اگر حق کے خلاف کام کیے جا رہے ہوں تو خاموشی کے ساتھ اس کا تماشا نہ دیکھیں بلکہ حق کی قوت کے ساتھ اس کا مقابلہ کریں۔ معاشرے کا ہر فرد نہ صرف خود حق کے تقاضے پورے کرے بلکہ دوسروں کو بھی اس طرزِ عمل کی تلقین کرے۔ یہ وہ چیز ہے جو معاشرے میں حق کی سربلندی اور نیکی کی ترویج کی ضامن ہے اور اس کو اخلاقی انحطاط سے بچاتی ہے۔ بعض اوقات باطل اتنا طاقتور ہوتا ہے کہ اس کا مقابلہ کرنا سخت دشوار ہوتا ہے اور اس سلسلے میں حق کے علمبردار بے پناہ مصائب و آلام سے دوچار ہو سکتے ہیں۔ ان کو یہ سب کچھ صبر و استقامت سے برداشت کرنا ہوگا۔ اسی لیے معاشرے کے تمام افراد کے لیے ضروری ہے کہ وہ ایک دوسرے کی ہمت بندھاتے رہیں اور ان حالات کو صبر سے برداشت کرنے کی نصیحت کرتے رہیں۔ صبر کی تلقین کا دوسرا مطلب یہ ہے کہ معاشرے کا کوئی فرد کسی مصیبت میں مبتلا ہو، کسی اذیت ناک بیماری کا شکار ہو جائے یا اس کا کوئی پیارا ہمیشہ کے لیے داغِ مفارقت دے جائے تو اس کو نصیحت کی جائے کہ صبر سے کام لے، جزع فزع نہ کرے اور اللہ کی رضا کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دے۔ یہی وہ راستہ ہے جس پر چل کر اسلامی معاشرے کا کوئی فرد نیکی کی ترویج میں ممد و معاون ثابت ہو سکتا ہے۔ دُعا ہے اللہ تعالیٰ ہم میں سے ہر ایک کو نیک بننے اور نیکی پھیلانے کی توفیق دے۔ آمین

اِخلاصِ عمل

دانائے کونین رحمتِ دو عالم ﷺ کے ذریعے بنی نوعِ انسان کو اخلاقِ حَسنہ کی جو تعلیم و ہدایت ملی ہے اس کی روحِ رواں اخلاصِ عمل ہے۔ اخلاصِ عمل کا مطلب یہ ہے کہ ہر اچھا کام یا کسی کے ساتھ اچھا برتاؤ صرف اس لئے اور اس نیت سے کیا جائے کہ ہمارا خالق اور پروردگار ہم سے راضی ہو ہم پر برکت اور رحمت نازل فرمائے اور ہم کو اپنے غضب اور ناراضی سے محفوظ فرمائے۔ کوئی بھی نیک کام صدقِ دل اور حُسنِ نیت سے کیا جائے وہ اگرچہ دیکھنے میں کتنا ہی معمولی کیوں نہ ہو مگر فی الحقیقت وہ ایسا بیج ہوتا ہے جس کے ایک دانہ سے کبھی تو بار آور درخت پھوٹ نکلتا ہے اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ اس ایک دانے سے کئی کئی پودے نکلتے ہیں جن میں سے ہر ایک میں کئی کئی خوشے اور ہر خوشے میں اَن گِنت دانے ہوتے ہیں۔ اس کے برعکس وہ نیک کام جس کی بنیاد اِخلاص پر نہ ہو اس کی مثال ایسی ہے جیسے کسی نے پتھر پر بیج رکھ دیا ہو اور اس امید پر تکیہ لگا بیٹھا کہ اس سے پودا پھوٹے گا جس میں پھل آئے گا یہ فریبِ عمل ہے۔ اور اس پر ایسی امید لگانا قطعاً بیکار ہے۔ قرآنِ حکیم اور ارشاداتِ نبوی میں اخلاصِ عمل پر بے انتہا زور دیا گیا ہے اور ہمیں بتایا گیا ہے کہ جس کام میں اِخلاص نہ ہو اور وہ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے بجائے محض دکھاوے کے لئے کیا جائے کہ لوگ واہ واہ کریں وہ خواہ کتنا اچھا ہو بارگاہِ الٰہی میں ہرگز مقبول نہ ہوگا۔ مقبول ہونا تو ایک طرف یہ آخرت میں رسوائی اور عذاب کا موجب ہوگا کیونکہ مخلوق کے دکھاوے اور دنیا میں شہرت اور ناموری کے لیے کوئی نیک کام کرنا ایمان و توحید کے منافی اور ایک قسم کا شرک ہے۔

مُسنَد احمد میں حضرت شداد بن اوس انصاری رضی اللہ عنہُ سے روایت

ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا، آپؐ فرماتے تھے جس نے دکھاوے کے لیے نماز پڑھی اس نے شرک کیا اور جس نے دکھاوے کیلئے صدقہ وخیرات کیا اس نے شرک کیا۔ اس حدیثِ پاک سے معلوم ہوا کہ کوئی اچھے سے اچھا عمل بھی اِخلاص سے خالی ہو اور اس کا مقصد رضائے الٰہی نہ ہو بلکہ نام ونمود یا کوئی اور ایسا ہی جذبہ اس کام کا مُحرِّک ہو تو اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس کی کوئی قدر و قیمت نہیں بلکہ اسے ایک قسم کا شرک سمجھا جائے گا۔ حقیقی شرک تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات یا اس کے افعال اور اس کے خاص حقوق میں کسی دوسرے کو شریک کیا جائے یا اللہ کے سوا کسی اور کی عبادت کی جائے۔ یہی شرکِ حقیقی یا شرکِ اکبر ہے جس کے بارے میں قرآنِ حکیم میں واضح طور پر فرمایا گیا ہے کہ اس کا کرنے والا ہرگز ہرگز نہیں بخشا جائے گا لیکن بعض اعمال ایسے ہیں جو اگرچہ اس معنٰی میں شرک نہیں ہیں لیکن ان میں شرک کا تھوڑا بہت شائبہ ضرور ہے ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ کوئی شخص اللہ کی عبادت یا کوئی اور نیک کام اللہ کی خوشنودی کے بجائے اس غرض سے کرے کہ لوگ اس کو عبادت گزار اور نیکوکار سمجھیں اِسی کو ''رِیا'' کہا جاتا ہے یہ اگرچہ حقیقی شرک نہیں ہے لیکن اس میں شرک کا شائبہ ضرور ہوتا ہے اور یہ ایک قسم کا نفاق اور سخت درجہ کا گناہ ہے۔ ایک حدیث میں اس کو شرکِ اصغر کہا گیا ہے۔ جیسا کہ مُسند احمد میں حضرت محمود بن لبید رضی اللہ عنہُ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، مجھے تمہارے بارے میں سب سے زیادہ خطرہ شرکِ اصغر کا ہے بعض صحابہؓ نے عرض کیا یا رسولؐ اللہ! شرکِ اَصغر کا کیا مطلب ہے؟ آپؐ نے ارشاد فرمایا ''رِیا'' یعنی کوئی کام لوگوں کے دکھاوے کیلئے کرنا۔

دوسری طرف اِخلاص کی یہ اہمیّت ہے کہ اگر کوئی شخص محض اللہ کی رضا جوئی کے لیے کسی نیک کام کی نیّت کرے لیکن یہ کام انجام دینے سے پہلے ہی اس کو موت آجائے تو اللہ تعالیٰ اس کو نیک کام کا پورا اجر وثواب دیگا۔ کیونکہ وہ

دلوں اور نیتوں کا حال خوب جانتا ہے۔

چنانچہ سرورِ عالم ﷺ کا ارشاد ہے۔ اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّيَّات.

"یعنی (سب انسانی) اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے۔"

اگر ایک شخص میں بظاہر ایمان بھی ہے اور اس کے اعمال بھی اچھے ہیں لیکن بدقسمتی سے یہ اعمالِ صالح اِخلاص سے خالی ہیں (یعنی ان اعمال سے اس کا مقصد اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی نہیں بلکہ اپنے آپ کو نیک اور پرہیزگار کہلوانا ہے) تو نہ اس کا ایمان اس کو کوئی فائدہ دے گا اور نہ اس کے ان نیک کاموں کا کوئی اجر ملے گا الٹا اس کو رِیاکاری کی سزا ملے گی۔ جو لوگ اچھے اعمال و اخلاق کا مظاہرہ دنیا والوں کی داد و تحسین اور شہرت طلبی کے لیے کرتے ہیں، عین ممکن ہے ان کو دنیا میں یہ مقصد حاصل ہو جائے لیکن وہ اللہ کی رضا اور رحمت سے محروم رہیں گے اور انکی اس محرومی کا پورا ظہور آخرت میں ہوگا۔ گویا ایک مسلمان کی سیرت اور کردار کی صحیح خطوط پر تشکیل صرف اسی صورت میں ممکن ہوسکتی ہے جب اس کے تمام کاموں میں اِخلاص کار فرما ہو۔ ان کاموں میں عبادت بھی شامل ہے اور خدمتِ خلق بھی، باہمی میل جول بھی شامل ہے اور صلہء رحمی بھی، عیادت اور تعزیت بھی شامل ہے اور مہمانوں کی تکریم اور خدمت بھی۔

رسولِ اکرم ﷺ فرمایا کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ اسی عمل کو قبول کرتا ہے جو خاص اُسی کے لیے ہو اور صرف اُسی کی خوشنودی اس سے مطلوب ہو، وہ خالق و مالک تمہاری صورتوں اور مالوں کو نہیں، بلکہ تمہارے دلوں اور کاموں کو دیکھتا ہے۔ اسلام میں اخلاصِ عمل کو جو غیر معمولی اہمیت حاصل ہے اس کا اندازہ حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی صحیح مسلم کی اُس حدیث سے کیا جا سکتا ہے جس میں وارد ہوا ہے کہ قیامت کے دن سب سے پہلے تین شخصوں کے متعلق عدالتِ الٰہی سے جہنم کا فیصلہ سنایا جائے گا۔ سب سے پہلے ایک ایسا شخص اللہ

کے سامنے پیش کیا جائے گا جو بظاہر جہاد میں شہید ہوا ہوگا۔ اللہ تعالیٰ پہلے اپنی نعمتیں اس کو جتائے گا اور پھر اس سے پوچھے گا کہ بتاؤ تو نے ان نعمتوں کا کیا حق ادا کیا اور کیا عمل کئے؟ وہ کہے گا خداوندا! میں نے تیری راہ میں جہاد کیا اور اپنی جانِ عزیز تیری خاطر قربان کی۔ حق تعالیٰ فرمائے گا تو جھوٹ بولتا ہے تو نے صرف اس لئے جہاد کیا تھا کہ تو بہادر مشہور ہو جائے۔ سو دنیا میں تیری بہادری کا چرچا ہو چکا۔ پھر اللہ تعالیٰ کے حکم سے اس کو اوندھے منہ جہنم میں ڈال دیا جائے گا۔

اس کے بعد ایک عالمِ دین وقرآن کی پیشی ہوگی۔ اللہ تعالیٰ اس کو بھی اپنی بخشی ہوئی نعمتیں بتائے گا وہ سب کا اقرار کرے گا۔ پھر حق تعالیٰ اس سے پوچھے گا کہ تو نے میری نعمتوں کا کیا حق ادا کیا اور کیا عمل کیے؟ وہ عرض کرے گا یا اللہ میں نے تیری کتاب کے علم کو پڑھا اور دوسروں کو پڑھایا اور تیری رضا ہی کے لیے تیری کتاب قرآن میں مشغول رہا۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا تو جھوٹ بولتا ہے تو نے تو عالم، قاری اور عابد کہلانے کے لیے یہ سب کچھ کیا تھا سو دنیا میں تیرے عالم، عابد اور قاریٔ قرآن ہونے کا چرچا ہو چکا۔ پھر بحکمِ خدا اسے بھی جہنم میں ڈال دیا جائے گا۔

اس کے بعد تیسرا شخص پیش کیا جائے گا جس کو اللہ نے دنیا میں بھرپور دولت دی ہوگی۔

اللہ تعالیٰ اس کو بھی اپنی نعمتیں جتلائے گا۔ پھر پوچھے گا تو نے اس مال و دولت سے کیا کام لیا؟ وہ عرض کرے گا۔ الٰہی جس جس راستے میں اور جن جن کاموں میں خرچ کرنا تجھے پسند ہے میں نے تو تیرا دیا ہوا مال ان سب ہی میں تیری رضا جوئی کے لیے خرچ کیا۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا، تو جھوٹ بولتا ہے تو نے تو صرف اس لئے مال خرچ کیا تھا کہ دنیا تجھ کو سخی کہے، سو دنیا میں تیری سخاوت کا چرچا خوب ہوا۔ پھر اس کو بھی اوندھے منہ جہنم میں ڈال دیا جائیگا۔

بعض لوگ اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ اگر وہ کوئی بُرا کام اچھی نیّت سے کریں گے تو ان کا یہ بُرا کام عملِ صالح میں شمار ہوگا جس کا ان کو اجر ملے گا۔ مثلاً کوئی آدمی اس نیت سے چوری کرتا ہے کہ جو مال اس سے حاصل ہوگا اس سے وہ غریبوں اور محتاجوں کی مدد کرے گا، ایسے لوگوں کو جان لینا چاہیے کہ جو کام فی نفسہٖ بُرے ہیں اور جن سے اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ نے منع فرمایا ہے ان میں حُسنِ نیّت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا وہ تو بہر صورت قبیح اور غضبِ الٰہی کا موجب ہیں۔

ایک مومن کا شعارِ زندگی یوں بیان کیا گیا ہے۔

اِنَّ صَلَاتِیْ وَ نُسُکِیْ و مَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۝
(الانعام۔ آیۃ ۱۶۲)

''یعنی میری نماز، میرے تمام مراسمِ عبودیت، میرا جینا اور میرا مرنا سب اللہ رب العالمین کے لیے ہے''۔

گویا ایک سچے مسلمان کا ہر کام رضائے الٰہی کے حصول کے لیے ہوتا ہے۔ اس کا اٹھنا بیٹھنا، چلنا پھرنا، جاگنا سونا، ہنسنا رونا، کھانا پینا، رزقِ حلال کمانے کے لیے تگ و دو کرنا، مخلوق کی خدمت کرنا وغیرہ اور اس کے سوا تمام مراسمِ عبودیت نماز، روزہ، زکوٰۃ، قربانی، غرض اس کا جینا مرنا سب اللہ ہی کے لیے ہوتا ہے۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اخلاصِ عمل کی توفیق عطا فرمائے اور ہم ہر نیک کام اس لیے کریں کہ ہمارا خالق و مالک ہم سے راضی ہو، ہم پر اپنی رحمت فرمائے اور اس کی ناراضی اور غضب سے ہم محفوظ رہیں۔ آمین ثم آمین

اسلامی ریاست میں جان، مال اور آبرو کے تحفّظ کی ضمانت

اسلام دینِ فطرت اور مکمل ضابطہء حیات ہے۔ یہ جس طرح زندگی کے تمام شعبوں میں بنی نوعِ انسان کی رہنمائی کرتا ہے اسی طرح وہ اسلامی رِیاست کے دینی، سیاسی وتمدّنی نِظام کے اصول وضوابط بھی صراحت کے ساتھ مُعیّن کرتا ہے۔ اس نظام میں اصل مُطاع اللہ تعالیٰ ہے اور باقی سب کچھ اُس کے بعد ہے۔ مسلمان کی انفرادی زندگی اور مسلمانوں کا اجتماعی نِظام دونوں کا مرکز ومحور اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری اور طاعت ہے۔ اسلامی نظام کی دوسری بنیاد رسولؐ کی اطاعت ہے۔ کیونکہ رسولؐ ہی کے ذریعے ہم تک اللہ کی اطاعت کے احکام وفرامین پہنچے ہیں پس رسولؐ کی اطاعت اللہ کی اطاعت ہی کی عملی صورت ہے مختصر یہ کہ اسلامی نظام میں اللہ کا حُکم اور رسولؐ کا طریقہ بُنیادی قانون اور آخری سَنَد (Final Authority) کی حیثیت رکھتا ہے۔ گویا تمام مسائلِ زندگی میں کتاب اللہ اور سنّتِ رسول اللہ ﷺ کو سَنَد، مرجع اور حرفِ آخر تسلیم کرنا، اسلامی رِیاسُت کی وہ لازمی خصوصیت ہے جو اسے دوسری ریاستوں سے ممیز کرتی ہے۔ قرآن وسُنّت کی روشنی میں اسلامی ریاست کی عمارت میں جو چیز بنیادی اینٹ کا درجہ رکھتی ہے وہ احترامِ انسانیت ہے۔ اسی سے امن وسلامتی، صُلح وآشتی، اُخوّت ومساوات، اتحاد واتفاق، عدل وانصاف اور رواداری کے سوتے پھوٹتے ہیں اور ریاست کے ہر فرد کو جان مال اور آبرو کے تحفّظ کی ضمانت ملتی ہے۔ رحمتِ عالم ﷺ کی بعثت سے پہلے احترامِ انسانیّت نام کی کسی چیز کا وجود دنیا میں نہ تھا انسانی جان کی قدر وقیمت مکھی اور مچھّر کے برابر بھی نہ تھی۔ ایک انسان کی ادنیٰ خواہش پر ہزاروں جانیں قربان کردی جاتی تھیں، بتوں کے استھانوں پر انسانی خون اور گوشت کے چڑھاوے

چڑھائے جاتے تھے۔

سرورِ عالم ﷺ نے بنی نوعِ آدم تک یہ ارشادِ خداوندی پہنچایا:

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيٓ اٰدَمَ وَحَمَلْنٰهُمْ فِى الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلٰى كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا ۝ (بنی اسرائیل: ۷۰)

"یعنی یہ ہمارا کرم ہے کہ ہم نے بنی آدم کو بزرگی دی اور انہیں خشکی اور تری میں سواریاں دیں اور ان کو پاکیزہ چیزوں سے رزق دیا اور اپنی بہت سی مخلوقات پر نمایاں فوقیت بخشی"۔

آپ ﷺ نے لوگوں کو بتایا کہ خالقِ کائنات نے انسان کو اپنا خلیفہ ٹھہرایا ہے اور انسان کائنات کا سب سے قابلِ احترام اور لائقِ محبت وجود ہے۔ اس کے ساتھ ہی آپؐ نے دنیا کو وحدتِ انسانیت کا مہتم بالشان تصوّر دیا جس نے وطنیت، قومیت، عصبیّت اور لسانیت وغیرہ کے بتوں کو پاش پاش کر دیا اور عالمگیر امن و آشتی کی عمارت کے لیے بنیاد فراہم کر دی۔

اللہ تعالیٰ نے قرآنِ پاک میں ارشاد فرمایا ہے:۔

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا ۭ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ (الحجرات آیۃ: ۱۳)

ترجمہ: "لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور پھر تمہاری قومیں اور برادریاں بنا دیں تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو۔ درحقیقت تم میں سب سے عزت والا وہ ہے جو تمہارے اندر سب سے زیادہ پرہیزگار ہے۔"

رسولِ رحمت ﷺ نے حجۃ الوداع کے تاریخ ساز موقع پر اس ارشادِ خداوندی کی توضیح یوں فرمائی:

"لوگو! تمہارا پروردگار ایک ہے اور تمہارا باپ بھی ایک ہے تم سب آدم کی اولاد ہو اور آدم مٹی سے بنے تھے کسی عربی کو کسی عجمی پر اور کسی عجمی کو کسی عربی پر اور کسی گورے کو کسی کالے اور کسی کالے کو کسی گورے پر کوئی فضیلت نہیں ہے بجز تقویٰ کے، تم میں سے زیادہ عزت اور کرامت والا اللہ کے نزدیک وہی ہے جو اللہ سے ڈرنے والا

ہے۔"

اس کے ساتھ ہی آپؐ نے ارشاد فرمایا:

"سارے مسلمان بھائی بھائی ہیں اور تم سب ایک اُمّت ہو تمہارے خون، مال اور عزتیں ایک دوسرے پر ہمیشہ کے لیے حرام کر دی گئی ہیں میرے بعد گمراہ نہ ہو جانا کہ آپس میں کُشت و خون کرنے لگو۔"

اللہ اور رسولؐ کے ان ارشادات سے روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ اسلام ہر انسان کے لیے چند بنیادی حُقُوق مقرر کرتا ہے اور ہر حال میں ان کے احترام کا حکم دیتا ہے خواہ وہ انسان اسلامی ریاست کی حُدُود میں رہتا ہو یا اس سے باہر، انسانی خون ہر حال میں مُحترَم ہے اور حق کے بغیر یعنی قصاص یا فساد پھیلانے کے سوا کسی اور وجہ سے نہیں بہایا جا سکتا۔ سورۂ مائدہ میں ارشاد ہوا ہے:

مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِي الْاَرْضِ فَكَاَ نَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا ؕ وَمَنْ اَحْيَاهَا فَكَاَ نَّمَا اَحْيَا النَّاسَ جَمِيْعًا ؕ (آیۃ ۳۲)

"یعنی جس نے کسی انسان کو خون کے بدلے یا زمین میں فساد پھیلانے کے سوا کسی اور وجہ سے قتل کیا اس نے گویا تمام انسانوں کو قتل کر دیا اور جس نے کسی کی جان بچائی اس نے گویا تمام انسانوں کی جان بچائی مطلب یہ ہے کہ جو شخص کسی کی ناحق جان لیتا ہے اس کا دل حیات انسانی کے احترام سے خالی ہے اور وہ پوری انسانیت کا دشمن ہے اس کے برعکس جو شخص کسی انسان کی زندگی بچاتا ہے وہ پوری انسانیت پر احسان کرتا ہے۔"

دوسروں کی جان لینا تو کُجا اسلام میں اپنی جان کو ختم کرنے سے بھی سختی کے ساتھ منع کیا گیا ہے یعنی خود کُشی کو حرام قرار دیا گیا۔

اسلامی ریاست کی انتظامیہ اور عامۃ المسلمین کے لیے رحمتِ عالم ﷺ کے یہ ارشادات بھی مشعلِ راہ ہیں۔

ا۔ مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور جس کے ہاتھ سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں۔ (صحیح بُخاری و صحیح مسلم)

۲۔ اللہ کے بندو! ایک دوسرے کے بھائی بن جاؤ۔ مسلمان مسلمان کا بھائی ہے نہ اس پر ظلم کرے، نہ اس کی مدد کرنے سے گریز کرے اور نہ اس کو حقیر جانے۔ ہر چیز مسلمان کی مسلمان پر حرام کردی گئی ہے اس کا خون، اس کا مال اور اس کی عزّت (یعنی کسی مسلمان کو قتل کرنا یا اس کا مال غصب کرنا یا اس کی عزّت و آبرو کے درپے ہونا)
(صحیح مسلم)

۳۔ خدا کی قَسم تم میں سے کوئی شخص اُس وقت تک مومن نہیں ہوسکتا جب تک وہ اپنے مسلمان بھائی کے لیے وہی بات پسند نہ کرے جو وہ اپنے لیے کرتا ہے۔
(صحیحین)

۴۔ مسلمان اپنے مسلمان بھائی کا آئینہ ہے اور مومن مومن کا بھائی ہے اسے نقصان سے بچاتا ہے اور اس کے حقوق کی غائبانہ حفاظت کرتا ہے۔
(ابوداؤد و ترمذی)

۵۔ مسلمان مسلمان کا بھائی ہے اُس پر ظلم کرے نہ اسے نقصان پہنچنے دے، جو شخص اپنے مسلمان بھائی کی حاجت روائی کی کوشش کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کا حاجت روا بن جاتا ہے اور جو شخص کسی مسلمان کی مصیبت اور پریشانی دور کردے اللہ تعالیٰ قیامت کے مصائب اور غموں میں سے اس کا کوئی بڑا غم دور کردے گا۔ (صحیحین)

۶۔ مؤمن کا قتل اللہ کے نزدیک دنیا کے تہ و بالا ہونے سے بڑھ کر ہے۔
(نسائی)

۷۔ مسلمان کو گالی دینا گناہ ہے اور اسے قتل کرنا کُفر ہے (صحیح بخاری)

۸۔ کوئی شخص اپنے مسلمان بھائی کی طرف ہتھیار سے اشارہ بھی نہ کرے۔
(صحیح مسلم)

ان احکام و ارشادات سے یہ نہ سمجھا جائے کہ اسلامی ریاست صرف مسلمانوں کی جان و مال اور آبرو کے تحفظ کی ضامن ہے۔ اسلام نے اسلامی ریاست کے غیر مسلموں کے لئے بھی واضح حُقوق معیّن کیے ہیں۔ اسلامی اصطلاح میں ایسے غیر مُسلموں کو ذِمّی کہا جاتا ہے یعنی وہ لوگ جن کی حفاظت کا اسلامی رِیاست نے بطورِ

خاص ذمہ لیا ہے۔ ذمّی کی جان و مال اور آبرو بالکل مسلمان کی جان و مال اور آبرو کی طرح محترم ہے۔ فوجداری اور دیوانی قوانین میں مُسلم اور ذِمّی کے درمیان کوئی فرق نہیں۔ کوئی غیر مُسلم حکومت اپنی مُسلم رعایا پر چاہے کتنے ہی ظلم توڑے ایک اسلامی ریاست کے لئے اس کے جواب میں اپنی غیر مُسلم رعایا پر ذرا سی زیادتی کرنا بھی جائز نہیں۔

حافظ ابنِ کثیرؒ نے اپنی تفسیر میں رسولِ اکرم ﷺ کا یہ ارشاد نقل کیا ہے کہ جس نے کسی معاہد (ذِمّی) کو قتل کیا وہ جنت کی بُو سے بھی محروم رہے گا۔

آنحضور ﷺ نے مدینہ مُنوّرہ کو مرکز بنا کر اسلامی ریاست کی تاسیس فرمائی تو ریاست کے تمام مسلم اور غیر مسلم باشندوں کو وہ تمام بنیادی حقوق عطا فرمائے جو قُرآن نے مُعیّن کیے ہیں مثلاً جان و مال، عزّت و آبرو کا تحفّظ، نجی زندگی کا تحفظ، مذہبی دل آزاری سے تحفظ، عبادت گاہوں کا تحفّظ، عقیدہ کی آزادی کا تحفظ وغیرہ۔

صحیح بخاری میں حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ ایک دن ہمارے پاس سے ایک جنازہ گزرا۔ رسول اللہ ﷺ اس کو دیکھ کر کھڑے ہو گئے اور ہم لوگ بھی آپ کے اِتباع میں کھڑے ہو گئے۔ پھر ہم نے عرض کیا، یا رسولؐ اللہ! یہ تو ایک یہودی کی میّت تھی آپؐ نے فرمایا، کیا وہ ایک فردِ انسانی نہ تھا اس واقعہ سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کی رحمتِ عالم ﷺ کے نزدیک ایک انسان کی بلا لحاظ مذہب و عقیدہ کیا قدر و قیمت تھی۔ آپؐ کا یہی اُسوہ ایک اسلامی ریاست پر یہ فرض عائد کرتا ہے کہ وہ اپنے تمام باشندوں کی جان، مال اور آبرو کا تحفّظ مسلم اور غیر مسلم کی تفریق کے بغیر کرے۔

اسلام میں عدل کی اہمیت

صحیح مسلم میں حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ وہ لوگ جو اپنے حکم میں اور اپنے گھر والوں میں اور ان لوگوں کے ساتھ جن کے وہ حاکم ہیں، عدل کرتے ہیں، قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے نزدیک نور کے منبروں پر بیٹھے ہوں گے۔

اس حدیثِ پاک میں دانائے کونین صلی اللہ علیہ وسلم نے نہایت بلیغ پیرائے میں عدل کی اہمیّت واضح فرمائی ہے اور اُمّت کو بتایا ہے کہ وہ لوگ جو اپنے تمام معاملات میں فیصلہ کرتے وقت یا کسی کو کوئی حکم دیتے وقت عدل سے کام لیتے ہیں اور اپنے اہلِ خانہ کے حقوق بھی انصاف سے پورے کرتے ہیں اور اگر وہ حاکم ہیں تو اپنی رعیت اور ماتحتوں کے ساتھ بھی عدل وانصاف کا برتاؤ کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ آخرت میں ان کو اتنا بلند مرتبہ عطا کرے گا کہ وہ حق تعالیٰ کے نزدیک نور کے منبروں پر بیٹھے ہوں گے۔

فی الحقیقت عدل وانصاف کسی بھی حکومت اور معاشرے کے لیے ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا ہے۔ اسلام دینِ فطرت ہونے کے اعتبار سے عدل وانصاف پر غیر معمولی زور دیتا ہے۔ چنانچہ قرآنِ حکیم میں جا بجا عدل کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور اہلِ ایمان کو بتایا گیا ہے کہ اللہ عدل کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔

سورۃ الحدید کی پچیسویں آیت میں ارشاد ہوا ہے کہ ہم نے اپنے رسولوں کو روشن دلیلیں دے کر بھیجا اور اس کے ساتھ ہم نے اتاری کتاب اور میزان یعنی قواعدِ عدل تاکہ لوگ عدل پر قائم ہوں ---- اس ارشادِ ربانی سے یہ بات واضح ہے کہ رسولوں اور نبیوں کی بعثت کا ایک اہم مقصد یہ تھا کہ انسانی زندگی کا انفرادی اور اجتماعی

دونوں طرح کا نظام عدل پر قائم ہو۔ انفرادی نظامِ عدل یہ ہے کہ انسان حقوق اللہ اور حقوق العباد پورے انصاف اور نیک نیتی کے ساتھ پورے کرے۔ ''عباد'' میں نہ صرف اس کے اہلِ خانہ بلکہ دوسرے رشتہ دار، پڑوسی، اہلِ محلّہ یا اہلِ بستی، غربا اور حاجت مند بھی شامل ہیں اور اجتماعی نظامِ عدل یہ ہے کہ معاشرے کی تشکیل ایسے اصولوں پر کی جائے جو ظلم و تعدّی، جارحیت اور زیادتی کا راستہ روکیں۔ اجتماعی زندگی کے تمام پہلو اِفراط و تفریط سے خالی اور باہم متوازن ہوں اور معاشرے کے تمام طبقے انصاف کے ساتھ اپنے حقوق پائیں اور اپنے فرائض اخلاصِ نیت کے ساتھ ادا کریں۔ معاشرے میں عدل و انصاف اور توازن و ہم آہنگی ہی کا دوسرا نام اجتماعی یا سماجی عدل ہے جسے انگریزی میں سوشل جسٹس کہا جاتا ہے۔ عدل کی ایک قسم لیگل جسٹس یا عدلِ قانونی بھی ہے لیکن حقیقت میں یہ کوئی مقصود بالذّات یا علاحدہ قسم نہیں ہے بلکہ عدل کے حصول کا ایک ذریعہ ہے۔

اسلامی نقطۂ نگاہ سے یہ طریقہ بھی نہایت سہل، فعال، تیز، مؤثر اور مساویانہ ہونا چاہیے۔ قرآنِ حکیم میں عدل کو تقوٰی کی نزدیک ترین راہ بتایا گیا ہے۔ تقوٰی سے مراد پرہیز گاری یا نفس کی وہ کیفیت ہے جو خوفِ خدا، احساسِ ذمہ داری اور آخرت کی جوابدہی کے احساس سے عبارت ہے۔ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم رحمۃٌ لِّلعَالَمِین اور خَاتَم الرُّسُل وَالاَنبیاء تھے۔ آپؐ نے عدل و انصاف کو جس معراج پر پہنچایا اور اس کے جو پیمانے قائم فرمائے ان کے نتیجے میں جو نظام برپا ہوا اس سے پوری کائنات پر رحمت کی گھٹائیں اُمڈ آئیں۔ تاریخِ عالم اس برکتوں اور رحمتوں والے نظام کی مثال پیش کرنے سے عاجز ہے۔

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا عدل اپنے بیگانے، دوست دشمن، مسلم غیر مسلم، امیر غریب سب کے لیے یکساں اور بلا امتیاز تھا۔ آپؐ فرمایا کرتے تھے کہ جو شخص لوگوں کو عصبیت کی دعوت دے وہ ہم میں سے نہیں۔ ایک مرتبہ حضرت واثلہ بن اسقع رضی اللہ عنہ نے عرض کیا، یا رسول اللہؐ! عصبیت کیا ہے؟ فرمایا، ظلم میں اپنی قوم کا

مددگار ہونا۔ سیرتِ طیبہ میں متعدد ایسے واقعات ملتے ہیں کہ آپؐ کے پاس کوئی مقدمہ لایا گیا جس میں ایک فریق مسلم تھا اور دوسرا غیر مسلم۔ آپؐ نے شہادتیں سننے کے بعد غیر مسلم کے حق میں فیصلہ صادر فرما دیا۔ صحیح بخاری میں ہے کہ فتحِ مکہ کے موقع پر قریش کے معزز قبیلے بنو مخزوم کی ایک خاتون فاطمہ بنتِ اسود سے چوری کی لغزش سرزد ہوگئی اور وہ پکڑی گئیں۔

چوری کی سزا قطعِ ید تھی۔ بنو مخزوم کے لوگ گھبرائے ہوئے محبوب رسولؐ حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما کے پاس گئے اور ان سے درخواست کی کہ وہ حضورؐ سے اس خاتون کے لیے رعایت کی سفارش کریں۔ حضرت اسامہ رضی اللہ عنہٗ نے حضورؐ سے اس خاتون کے لیے رعایت کی سفارش کی تو آپؐ کے روئے انور پر غصہ کے آثار پیدا ہوئے اور آپؐ نے فرمایا، کیا تم مجھ سے اللہ کی قائم کی ہوئی حدود کے بارے میں گفتگو کرتے ہو؟ حضرت اسامہ رضی اللہ عنہٗ لرز اٹھے اور عرض کیا، یا رسول اللہؐ! میرے لیے اللہ سے مغفرت طلب فرمائیے۔

شام ہوئی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم خطبہ دینے کے لیے کھڑے ہوئے اور فرمایا، پہلے لوگ اس وجہ سے ہلاک ہوئے کہ جب ان میں کوئی معزز یا امیر آدمی چوری کرتا تو اس کو چھوڑ دیتے اور جب ان کا کوئی کمزور یا غریب آدمی چوری کرتا تو اس پر حد قائم کرتے۔ قسم اُس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے کہ اگر فاطمہ بنتِ محمدؐ بھی چوری کرتی تو میں اس کا ہاتھ کاٹ دیتا۔ یہ تھی حضورؐ کی **شانِ عدل**۔

غزوۂ خیبر کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک جاں نثار حضرت عبداللہ بن سہل رضی اللہ عنہٗ کھجوروں کی بٹائی کے لیے خیبر گئے تو کسی نے انھیں وہاں شہید کر دیا۔ حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہٗ کے چچا حضرت مُحَیِّصہؓ اور بھائی حضرت عبدالرحمٰنؓ نے حضورؐ کی خدمت میں استغاثہ دائر کیا اور یہودِ خیبر کو حضرت عبداللہؓ کا قاتل ٹھہرایا مگر وہ کوئی عینی شہادت پیش نہ کر سکے۔ اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہودِ خیبر کے خلاف کوئی کارروائی نہ کی اور حضرت عبداللہؓ کا خون بہا اپنے پاس سے ادا کر

دیا۔ حضورؐ کی سیرتِ طیبہ پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ عدل آپؐ کی جہانبانی کا بنیادی اصول تھا اور آپؐ دوسروں پر ہی نہیں بلکہ اپنی ذاتِ اقدس پر بھی اس کا اطلاق فرمایا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ مالِ غنیمت تقسیم کرتے وقت ایک صاحب آپؐ کو چمٹ گئے۔ آپؐ نے اپنے ہاتھ کی چھڑی سے ان کو ٹہوکا دیا جس سے ان کے منہ پر خراش آ گئی۔ حضورؐ نے ان سے فرمایا: ''مجھ سے بدلہ لے لو''۔ انھوں نے عرض کیا: ''یا رسول اللہؐ میں نے معاف کر دیا''۔

یہی وہ عدل ہے جس کا اسلام عَلَم بَردار ہے۔ دعا ہے اللہ تعالیٰ ہم سب کو راہِ عدل اختیار کرنے کی توفیق دے۔ آمین۔

صِلَہ ءِ رَحمی

اسلام محض عبادات و عقائد کے مجموعے کا نام نہیں بلکہ یہ ایک مکمل نِظامِ حیات ہے جس میں زندگی کے ہر شعبے کے لیے اَبدی ہدایت و احکام موجود ہیں۔ دینِ اسلام اپنے انقلاب آفریں مُعاشَرتی نِظام میں حقوق العباد کی ادائیگی پر بہت زور دیتا ہے۔ حُقوق العِباد کا ایک خاص الخاص پہلو ''صِلہ ء رحمی'' ہے۔ فی الحقیقت ''صِلہ ءرحمی'' اَخلاقِ حسنہ ہی کی ایک شاخ ہے وہی اَخلاقِ حَسَنہ جس کی تکمیل کے لیے خاتم الانبیاء و المرسلین ﷺ مبعوث ہوئے تھے۔ صلہء رحمی کا مطلب ہے قرابت داروں کے ساتھ حُسنِ سلوک۔ اسلام کی اخلاقی تعلیم میں قرابت داروں کے حُقوق ادا کرنے اور اُن کے ساتھ اچھا سُلوک کرنے پر دوسرے تمام مذاہب کی نسبت زیادہ زور دیا گیا ہے۔ انسانوں کی باہمی قرابت اور رشتہ داری کے تعلق کو اللہ تعالیٰ کے اسمِ پاک رحمان اور اُس کی صفت رحمت سے خاص نسبت ہے۔ سُنَنِ ابی داوٗد میں حضرت عبدالرّحمٰن بن عوف رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا، آپؐ فرماتے تھے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کا ارشاد ہے کہ میں اللہ ہوں، میں الرّحمٰان ہوں میں نے رشتہء قرابت کو پیدا کیا ہے اور اپنے نام رحمٰن کے مادّہ سے نکال کر اس کو رحم کا نام دیا ہے پس جو اسے جوڑے گا میں اس کو جوڑ دوں گا اور جو اس کو توڑے گا میں اس کو توڑ دوں گا۔ اس حدیثِ مبارکہ کا مطلب یہ ہے کہ انسانی رشتوں اور باہمی قرابت کے کچھ فطری تقاضے اور حُقوق ہیں جن کا عنوان اللہ تعالیٰ نے رحم مقرر کیا ہے پس جو بندہ صلہء رحمی کرے گا اس کے لیے اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ وہ اُس کو جوڑے گا یعنی اس کو اپنا بنا لے گا اور اس پر اپنی برکتیں اور رحمتیں نازل کرے گا اور جس شخص کا دل جذبہء رحم سے خالی ہو گا اور وہ صلہء رحمی کی بجائے قطعِ رَحمی کرے گا، اللہ اس کو اپنی رحمت اور فضل سے محروم کر دے گا۔

قرآنِ مجید میں جابجا صلہء رحمی یا قرابت داروں کے حقوق ادا کرنے کا حکم دیا گیا ہے مثلاً سورۃ النّسآء میں ارشاد ہوا ہے:

وَاعۡبُدُااللّٰہَ وَلَا تُشۡرِکُوۡا بِہٖ شَیۡئًاوَّ بِالۡوَالِدَیۡنِ اِحۡسَانًا وَّبِذِی الۡقُرۡبٰی
(النّسآء:۳۶)

"اللہ کی عبادت کرو اور کسی کو اس کا شریک نہ بناؤ اور ماں باپ اور قرابت داروں سے نیکی کرتے رہو"

سورۂ روم میں فرمایا گیا ہے: فَاٰتِ ذَاالۡقُرۡبٰی حَقَّہٗ "تو قرابت داروں کو اس کا حق ادا کرو" (آیۃ:۳۸)

سورۂ بنی اسرائیل میں حکم ہوا ہے: وَاٰتِ ذَاالۡقُرۡبٰی حَقَّہٗ "اور قرابت داروں کو اس کا حق ادا کر" (آیۃ:۲۶)

سورۃ النّحل میں ارشاد ہوا ہے:

اِنَّ اللّٰہَ یَاۡمُرُ بِالۡعَدۡلِ وَالۡاِحۡسَانِ وَاِیۡتَآیِٔ ذِی الۡقُرۡبٰی

"یعنی بیشک اللہ تعالیٰ عدل و احسان اور قرابت داروں کو دینے یعنی صلہء رحمی کا حکم دیتا ہے" (آیۃ:۹۰)

اللہ تعالیٰ کے واضح اور تاکیدی احکام کی روشنی میں ہر صاحبِ ایمان پر لازم ہے کہ اپنے والدین اور اہل و عیال کی کفالت کے بعد دوسرے رشتہ داروں کے ساتھ بھی صلہء رحمی کرے۔ اس کی دو صورتیں ہیں ایک یہ کہ اپنی کمائی سے غریب اور حاجت مند رشتے داروں کی مالی مدد کی جائے اور دوسری یہ کہ اپنے وقت اور زندگی کا کچھ حصّہ ان کے کاموں میں لگائیں۔ صلہء رحمی کا یہ نیک عمل نہ صرف اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کا باعث ہوگا اور آخرت میں میزانِ اعمال میں نیکیوں کے پلڑے کو جھکانے کا موجب بنے گا بلکہ اس سے دُنیوی برکات بھی حاصل ہوں گی جیسا کہ اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے۔

صحیحین میں حضرت اَنَس بن مالک رضی اللہ عنہٗ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، کہ جو کوئی چاہے کہ اُس کے رزق میں فراخی اور کشادگی

ہو اور دنیا میں اُس کے قدم تادیر ہوں (یعنی اُس کی عمر دراز ہو) تو وہ (اہلِ قربت کے ساتھ) صلۂ رحمی کرے۔

گویا رحمتِ عالَم ﷺ نے اہلِ ایمان کو بشارت دی ہے کہ مالی امداد کی صورت میں رشتے داروں کے ساتھ صلہء رحمی کرنے سے ان کے مال میں کمی نہ ہوگی بلکہ اس میں برکت ہوگی اور اُن کے رزق میں اضافہ ہوگا۔ عمر میں برکت سے متعلق حُضور ﷺ کے ارشاد پر اسبابی نقطہء نگاہ سے غور کریں تو عام مشاہدہ اور تجربہ ہے کہ خاندانی جھگڑے اور تنازعے حُقوقِ قرابت کا پاس نہ رکھنے کی بناء پر پیدا ہوتے ہیں اور یہ آدمی کے لیے ذہنی پریشانی اندرونی کُڑھن اور گھٹن کا باعث بنتے ہیں۔ ایسے تفکُّرات لامحالہ صحت اور کاروبار ہر چیز پر نہایت برا اثر ڈالتے ہیں لیکن جو لوگ اہلِ قرابت سے نیکی اور صلہء رحمی کا برتاؤ کرتے ہیں اُن کی زندگی روحانی آسودگی، طمانیت اور خوشدلی کے ساتھ گزرتی ہے اور ہر لحاظ سے اُن کے حالات بہتر رہتے ہیں پھر اہلِ قرابت کی مدد کرنے میں دوہرا ثواب ہے ایک صدقہ کا اور دوسرا صلہء رحمی کا۔ بعض دفعہ کوئی شخص اپنے کسی حاجت مند اور مستحق رشتے دار کے ساتھ صلہء رحمی کو اس بات سے مشروط کر دیتا ہے کہ اس نے بھی ان کے ساتھ کوئی نیکی کی ہو۔ یہ طرزِ عمل صلہء رحمی کے جذبے کے منافی ہے۔ صحیح بخاری میں حضرت عبداللہ بن عُمر رضی اللہ تعالیٰ عنہُما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص رشتے داروں کے احسان کا بدلہ چُکاتا ہے وہ صلہء رحمی کرنے والا نہیں بلکہ صلہء رحمی کا حق ادا کرنے والا دراصل وہ ہے جو اس حالت میں بھی صِلۂ رحمی کرے جب وہ اس کے ساتھ قطع رحمی (حق تلفی) کا معاملہ کریں۔

صحیح مسلم میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہُ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں عرض کیا، اے اللہ کے رسول! میرے رشتہ دار ہیں، میں ان کے ساتھ ملاپ (یعنی حسنِ سُلوک) کرتا ہوں اور وہ مجھ سے قطعِ تعلُّق کرتے ہیں میں ان سے نیکی کرتا ہوں اور وہ مجھ سے برائی کرتے ہیں، میں اُن سے بردباری اور درگزر کا معاملہ کرتا ہوں اس کے برعکس وہ مجھ سے جہالت سے پیش آتے

ہیں اور گالیاں دیتے ہیں۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، اگر ایسا ہی ہے جیسا تو کہتا ہے تو گویا تو ان کے منہ پر جلتی راکھ یعنی بھوبھل ڈالتا ہے اور ہمیشہ اللہ تعالیٰ کی مدد تیرے شاملِ حال رہے گی جو تجھ کو ان پر غالب رکھے گی جب تک تو اس طرزِ عمل یا عادت پر قائم رہے گا۔

صلہء رحمی کی ضد قطعِ رَحمی ہے یعنی رشتے داروں سے برا سلوک کرنا یا اُن سے تعلقات توڑ لینا۔ یہ اتنا بڑا گناہ ہے کہ انسان کی آخرت برباد کر دیتا ہے۔ صحیحین میں حضرت جُبَیر بن مُطعِم رضی اللہ عنہُ سے رَوایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ قطع رَحمی کرنے والا جنت میں نہ جا سکے گا۔ ایک اور حدیث میں وارد ہوا ہے کہ اُس قوم پر رحمت نہیں اترتی جس میں قطعِ رَحمی کا چلن ہو۔ (مشکوٰۃ)

اللہ تعالیٰ کے تاکیدی احکام اور رحمتِ عالَم ﷺ کے ان ارشادات سے بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اسلام میں صلہء رَحمی یعنی رشتے داروں اور اہلِ قرابت کے ساتھ حُسنِ سُلوک کی کتنی اہمیت ہے اور اس میں کوتاہی یعنی ان کو حاجت مند جانتے ہوئے بھی ان کی مدد نہ کرنا یا ان سے قطعِ تعلق کرنا کتنا بڑا گناہ اور کتنی بڑی محرومی ہے۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہم سب کے دلوں میں صلہء رحمی کا جذبہ پیدا کرے اور ہمیں توفیق دے کہ ہم حاجت مند اہلِ قرابت کی دامے دِرمے قدَمے سخنے ہر طرح سے مدد کرنے پر ہمیشہ کمر بستہ رہیں۔

راست گفتاری
جنّت کی کُنجی ہے

قرآنِ حکیم اور احادیثِ نبوی میں مومنین کی جو صفات بیان کی گئی ہیں ان میں ایک اہم صِفت راست گفتاری یعنی سچ بولنا ہے۔ بندۂ مومن کسی بھی حالت میں صدق و راستی کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتا اگرچہ سچ بولنے کے نتیجے میں اس کو کتنی ہی تکلیف اٹھانی پڑے (یہاں تک کہ اس کی جان بھی چلی جائے)۔ قرآنِ پاک میں مومنوں کو ہر حال میں سچ بولنے اور جھوٹ سے بچنے کا حکم دیا گیا ہے خواہ یہ سچ (راست گفتاری) اُن کی اپنی ذات یا نزدیکی رشتہ داروں ہی کے خلاف کیوں نہ ہو۔

سورۃ النّساء میں ارشاد ہوا ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ وَلَوْ عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ اَوِ الْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ (آیۃ:۱۳۵)

یعنی اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو! انصاف پر قائم رہو اور اللہ واسطے کے گواہ بنو خواہ تمہاری یہ (سچی) گواہی تمہاری اپنی ذات یا تمہارے والدین یا تمہارے نزدیکی رشتے داروں ہی کے خلاف ہو۔

سورۂ بقرہ میں فرمایا گیا ہے:-

لَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُوا الْحَقَّ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ (آیۃ:۴۲)

"یعنی سچ میں جھوٹ نہ ملاؤ اور نہ سچ کو جان بوجھ کر چھپاؤ"

سورۂ توبہ میں حکم دیا گیا ہے:-

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَكُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ (آیۃ:۱۱۹)

''یعنی اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور سچوں کے ساتھ ہو جاؤ''

گویا سچے لوگ ایک جماعت ہوتے ہیں اور مسلمان صرف سچوں کی جماعت ہی میں شامل ہوسکتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بعض اوقات سچ بولنا تلوار کی دھار پر چلنے کے مترادف ہوتا ہے اور سچے آدمی کو بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے لیکن سچے لوگ کسی مشکل اور خطرے سے نہیں ڈرتے اور راست گفتاری یا حق گوئی کا فریضہ ادا کر کے رہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان سے اجرِ عظیم کا وعدہ کر رکھا ہے جیسا کہ سورۂ احزاب میں ارشاد ہوا ہے:-

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَقُوْلُوْا قَوْلًا سَدِيْدًا ۙ يُّصْلِحْ لَكُمْ اَعْمَا لَكُمْ
وَ يَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ ؕ (آیۃ: ۷۰)

یعنی اے ایمان والو! اللہ سے ڈرتے رہو اور بات وہ کہو جو ٹھیک (سچی، حقیقت پر مبنی) ہو۔ اس سے اللہ تمہارے اعمال درست کردے گا اور تمہارے قصوروں سے درگزر فرمائے گا۔

رسولِ اکرم ﷺ نے بھی راست گفتاری کی بے انتہا تاکید فرمائی ہے اور اس کو ایمان کا حصہ قرار دیا ہے۔ صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، اے لوگو! سچ بولنے کو اپنے اوپر لازم کرلو اور ہمیشہ سچ بولو کیونکہ سچ بولنا نیکی کی راہ پر ڈال دیتا ہے اور نیکی بہشت میں پہنچا دیتی ہے اور جب کوئی آدمی ہمیشہ کے لیے سچائی کو اختیار کر لیتا ہے اور ہر حال میں سچ بولتا ہے تو اللہ کے پاس وہ صِدِّیق یعنی بڑا سچا لکھا جاتا ہے اور جھوٹ بولنے سے بچو کیونکہ جھوٹ بولنے کی عادت آدمی کو بدی کی راہ پر ڈال دیتی ہے اور یہ بدی اس کو دوزخ میں پہنچا دیتی ہے۔ جب آدمی جھوٹ بولنے کا عادی ہو جاتا ہے اور ہمیشہ جھوٹ بولتا ہے وہ اللہ کے پاس بڑے جھوٹوں (کذّابین) میں لکھا جاتا ہے۔

مشکوٰۃ شریف کی حدیث (عن صفوان بن سلیم رضی اللہ عنہٗ) میں آیا ہے کہ

ایک دفعہ رسول اللہ ﷺ سے پوچھا گیا، یارسول اللہ! کیا مومن بزدل بھی ہوسکتا ہے؟ آپؐ نے فرمایا، ہاں ہوسکتا ہے۔ پھر آپؐ سے پوچھا گیا، اے اللہ کے رسول! کیا مومن بخیل بھی ہوسکتا ہے؟ آپؐ نے فرمایا، ہاں ہوسکتا ہے۔ پھر پوچھا گیا، یارسول اللہ! مومن کبھی جھوٹا بھی ہوسکتا ہے؟ آپؐ نے فرمایا، نہیں۔

اس حدیثِ پاک کی روشنی میں ہمیں اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ جھوٹ اور ایمان کبھی اکٹھے نہیں ہوسکتے۔ جھوٹ بولنا نہ صرف اللہ تعالیٰ کی ناراضی کا موجب ہے بلکہ یہ دنیا میں (جھوٹ بولنے والے) آدمی کو بدنام اور ذلیل کردیتا ہے اور لوگ اس کو ناقابلِ اعتبار سمجھ کر حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ ایک حدیث میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہٗ نے رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد بھی امت تک بھی پہنچایا ہے کہ جھوٹ بولنے سے آدمی کا رزق گھٹ جاتا ہے۔ (صحیح بخاری و مسلم)

بعض لوگ جو کچھ کسی سے سنتے ہیں بغیر تحقیق کیے (کہ جو بات سنی ہے وہ صحیح ہے یا غلط) اسے دوسروں کے سامنے بیان کردیتے ہیں۔ آنحضور ﷺ نے فرمایا ہے کہ ایسا طرزِ عمل بھی آدمی کو جھوٹا بنانے کے لیے کافی ہے۔ (عن ابوہریرہؓ۔ صحیح مسلم)

رسولِ اکرم ﷺ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ جابر حاکم (سلطان) کے سامنے کلمہءِ حق (سچی بات) کہنا جہاد (کا درجہ رکھتا) ہے۔ اگر ہم اپنی تاریخ پر نظر ڈالیں تو معلوم ہوگا کہ ہمارے بزرگ حق گوئی سے کبھی گریز نہیں کرتے تھے اور سچ کی خاطر اپنی جان کی پروا بھی نہیں کرتے تھے۔ یہاں ہم صرف دو مثالیں ہی پیش کرنے پر اکتفا کرتے ہیں۔

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے ایک مسئلے میں قرآن اور حدیث کے مطابق فتویٰ دیا۔ حاکمانِ وقت کو یہ فتویٰ پسند نہ آیا انہوں نے امام صاحبؒ پر بڑا زور ڈالا کہ وہ یہ فتویٰ بدل دیں (یعنی ان کی مرضی کے مطابق) فتویٰ دیں مگر امام صاحبؒ نے صاف انکار کردیا۔ اس پر حکومت نے ان پر بڑی سختیاں کیں یہاں تک کہ ان کے مونڈھے اکھڑوا ڈالے لیکن امام صاحب اپنے مبنی برحق موقف پر قائم رہے اور کسی

صورت میں اس کو بدلنے پر تیار نہ ہوئے۔

حضرت امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ نے حاکمانِ وقت کی یہ بات ماننے سے انکار کر دیا کہ قرآنِ پاک مخلوق ہے اس کے برعکس انہوں نے اعلان کیا کہ قرآن اللہ کا لافانی کلام ہے اور یہ فانی مخلوق کی طرح مخلوق نہیں ہے۔ اس اعلان کی پاداش میں حاکمانِ وقت نے ان کو گرفتار کر لیا پھر ان کے پاؤں میں بیڑیاں ڈال کر ان کو بازار میں پھرایا اور اتنے کوڑے مارے کہ اگر کبھی ہاتھی کو پڑتے تو وہ چیخ مار کر بھاگ جاتا لیکن امام صاحبؒ نے تمام اذیتیں نہایت صبر و استقامت سے جھیلیں اور اپنے اعلان سے سرِ مُو پیچھے نہ ہٹے۔

حضرت مجدد الفِ ثانی شیخ احمد سرہندی رحمۃ اللہ علیہ نے جلال الدین اکبر بادشاہ کے خود ساختہ دینِ الٰہی کے خلاف آواز بلند کی، جہانگیر کو سجدہ کرنے سے انکار کیا اور انسان کے آگے سجدہ کرنے کو اسلام کی رو سے ناجائز ہونے کا اعلان کیا۔ جہانگیر نے ان کو قلعہ گوالیار میں قید کر دیا مگر وہ بادشاہ کے ناجائز احکام کے خلاف اپنے موقف پر قائم رہے آخر بادشاہ راہِ راست پر آ گیا اور اپنے خلافِ شریعت احکام منسوخ کر دیے۔

فی الحقیقت سچائی اور راست گفتاری ایک شمعِ نور ہے وہ جس دل میں فروزاں ہوتی ہے وہ کبھی جھوٹ نہیں بولتا بلکہ کوئی ایسی بات بھی زبان سے نہیں نکالتا جس میں جھوٹ کی ذرا سی آمیزش بھی ہو۔ اگر وہ کسی سے عہد و پیمان یا وعدہ کرتا ہے تو اس کو ہر حال میں پورا کرتا ہے یہ بھی سچائی ہی کی ایک شاخ ہے جبکہ جھوٹا وعدہ کرنا بد اخلاقی اور گناہ کی بات ہے۔

جھوٹ بول کر کوئی دنیوی فائدہ حاصل کرنا نہ صرف شرعاً گناہ ہے بلکہ اخلاقی جرم بھی ہے۔ ایک حدیث میں رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد روایت کیا گیا ہے کہ جب کوئی جھوٹ بولتا ہے تو اس کی بدبو سے فرشتے اس سے میل بھر (یا کوس بھر) دور چلے جاتے ہیں۔ (عن ابنِ عمرؓ جامع ترمذی)

دعا ہے اللہ ہم سب کو ہمیشہ سچ بولنے کی توفیق عطا فرمائے۔

اللہ پر توکُّل

اللہ پر توکل کا مطلب یہ ہے کہ ہر حال میں اللہ تعالیٰ پر بھروسا کیا جائے۔ اس بھروسا کی ایک صورت یہ ہے کہ آدمی اپنے کام میں دل و جان سے لگا رہے، اس کو پورا کرنے کی کوشش کرے مگر اپنی کوشش کے نتیجے کو اللہ تعالیٰ پر چھوڑ دے اور بھلائی کی امید رکھے۔ اس کے ساتھ اسے یہ یقین بھی ہو کہ کامیابی اس کی اپنی کوشش کی وجہ سے نہیں بلکہ اللہ کی مہربانی سے حاصل ہوئی ہے اور کوشش جو وہ کر رہا ہے اس لیے کر رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کوشش کرنے کا حکم دیا ہے۔

توکل کی دوسری صورت یہ ہے کہ اللہ کے سوا کسی سے نہ ڈرے۔ بڑی سے بڑی مصیبت میں بھی اللہ پر بھروسا رکھے اور ہمت سے اس مصیبت کا مقابلہ کرے اگر کوئی اس پر ظلم کرتا ہے تو اللہ کے بھروسے پر ظالم کا مقابلہ کرے۔ اگر مقابلہ کرنے کی طاقت نہیں رکھتا تو پھر بھی اللہ پر بھروسا کرے اور یقین کرے کہ اللہ اس کی مدد کریگا۔

بعض لوگ توکل کا مطلب یہ سمجھتے ہیں کہ انسان عمل اور کوشش کو چھوڑ دے اور یہ کہہ کر ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا رہے کہ میرا خدا پر توکل ہے۔ ایسے لوگ غلطی پر ہیں۔ توکل بے عملی کاہلی اور سستی کا نام نہیں ہے۔ جو شخص یہ چاہے کہ میں کچھ کام نہ کروں اور کامیاب ہو جاؤں، گھر سے نہ نکلوں اور دنیا بھر کی سَیر ہو جائے، کھیتی نہ بوؤں اور مجھے اپنے کھیت میں لہلہاتی ہوئی فصل نظر آ جائے، سیڑھی پر قدم نہ رکھوں اور مکان کی چھت پر پہنچ جاؤں، محنت نہ کروں اور دنیا بھر کی دولت سمٹ کر میرے گھر میں آ جائے۔۔۔ تو یہ امیدیں اس کے دل کو تو بہلا سکتی ہیں لیکن کبھی پوری نہیں ہو سکتیں۔

اللہ تعالیٰ نے کامیابی کے لئے ایک قاعدہ یا قانون بنا دیا ہے جو کبھی تبدیل

نہیں ہوسکتا۔ ہماری مشکلوں کا حل، ہمارے ارادوں میں کامیابی اور ہماری امیدوں کا پورا ہونا اسی قانون کے ماتحت ہے۔ وہ قانون یہ ہے کہ جب تک انسان کوشش نہیں کرے گا اس کو کامیابی حاصل نہیں ہوسکتی۔ بغیر کوشش کے توکل کا آسرا ڈھونڈنا قدرت کے اس قانون کے خلاف ہے۔ انسان کو چاہیے کہ وہ اپنی طرف سے جس قدر ہاتھ پاؤں ہلا سکتا ہو ہلاتا جائے یا جتنی بھی دوڑ دھوپ اور محنت کرسکتا ہے کرتا جائے۔ اس کے بعد نتیجہ خدا پر چھوڑ دے کیونکہ توکل کا درجہ کوشش اور عمل کے بعد شروع ہوتا ہے۔ ایسا توکل دل کو بہت مضبوط بنا دیتا ہے اور حالات کتنے ہی ناموافق کیوں نہ ہوں، انسان ناامیدی کا شکار نہیں ہوتا۔ جب وہ مانتا ہے کہ قدرت ساری کی ساری اللہ کے ہاتھ میں ہے تو پھر اس کا اس بات پر بھی یقین ہوتا ہے کہ اللہ جب چاہے حالات بدل سکتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہر واقعہ کے پیچھے کوئی سبب ضرور ہوتا ہے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ تمام اسباب کا پیدا کرنے والا بھی اللہ تعالیٰ ہے۔ جب اسے کسی شخص یا قوم کو کامیابی عطا کرنا ہوتی ہے تو وہ ایسے اسباب پیدا کر دیتا ہے جن کے نتیجے میں وہ کامیابی حاصل ہوجاتی ہے مگر یہ بھی ممکن ہے کہ ہم وہ حالات نہ دیکھ سکیں یا ہم نہ سمجھ سکیں۔ خود اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ جب تم کسی کام کا پکا ارادہ کرلو تو اللہ پر بھروسا رکھو، اللہ توکل کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔

توکل کرنے والے اور توکل نہ کرنے والے میں یہ فرق ہوتا ہے کہ توکل کرنے والا خواہ سخت کوشش کے بعد کامیابی حاصل کرے وہ اس کامیابی کو خدا کی مہربانی کا نتیجہ سمجھتا ہے۔ اور اگر سخت کوشش کے بعد بھی اسے کامیابی نظر نہ آئے تو وہ بددل نہیں ہوتا اور اللہ کے بھروسے پر کوشش جاری رکھتا ہے۔ دوسری طرف توکل نہ کرنے والا اپنی کامیابی کو اپنی کوشش کا نتیجہ سمجھتا ہے۔ ایسے شخص کو اگر کامیابی حاصل نہ ہو یا اس کے حاصل ہونے میں دیر لگ جائے تو وہ بددل ہوکر کوشش چھوڑ دیتا ہے۔ اگر غور کریں تو معلوم ہوگا کہ توکل عمل اور کوشش پر ابھارتا ہے اور توکل نہ کرنا اس خطرے میں مبتلا کر دیتا ہے کہ بددل ہوکر عمل اور کوشش کو چھوڑ دیا جائے۔ چنانچہ جو لوگ یہ سمجھتے

ہیں کہ تدبیر اور کوشش کے بغیر ہی اللہ پر بھروسا رکھا جائے، ان کو اللہ کے قانون کے مطابق کامیابی حاصل ہونا بہت مشکل ہے بلکہ کامیابی کے بجائے ان کو نقصان پہنچ جانے کا ڈر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جتنے پیغمبر بھیجے ان سب کو توکل کا مکمل نمونہ بنایا لیکن تدبیر اور کوشش سے غافل رہنے پر کسی کو کامیابی کی امید نہ دلائی۔

حضرت نوح علیہ السّلام ساڑھے نو سو سال تک لوگوں کو حق کی طرف بلاتے رہے۔ اُن کی قوم نے اُن کا مذاق اڑایا لیکن وہ بددل نہ ہوئے اور ہمیشہ اللہ پر توکل کیا۔ آخر اللہ نے پانی کا ایک زبردست عذاب بھیجا جس میں حضرت نوحؑ اور ان کے ساتھیوں کے علاوہ باقی سب لوگ غرق ہو گئے۔ طوفان آنے سے پہلے حضرت نوحؑ نے ایک بہت بڑی کشتی تیار کی تھی۔ یہی کشتی انھیں اور ان کے ساتھیوں کو بچانے کا ذریعہ بنی۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت نوحؑ نے اللہ پر توکل تو کیا لیکن تدبیر اور کوشش کو نہ چھوڑا۔ حضرت ہود علیہ السّلام، حضرت ابراہیم علیہ السّلام، حضرت موسیٰ علیہ السّلام، حضرت شعیب علیہ السّلام، حضرت لوط علیہ السّلام اور دوسرے سب پیغمبر بھی ہر حال میں اللہ پر توکل کرتے تھے لیکن ساتھ ہی لوگوں کی ہدایت کے لئے تدبیر اور کوشش بھی کرتے تھے۔

ہمارے رسولِ پاک ﷺ کو بھی اللہ پر پورا بھروسا تھا۔ آپؐ ہر مصیبت کو بڑے حوصلے سے برداشت کرتے اور کسی قسم کے خوف کو اپنے دل میں جگہ نہ دیتے آپؐ نے لوگوں کو اسلام کی طرف بلانا شروع کیا تو انہوں آپؐ کو بہت ستایا اور آپؐ کے پیارے ساتھیوں پر بھی بہت ظلم ڈھائے لیکن آپؐ نے کچھ پروا نہ کی اور اللہ کے بھروسے پر لوگوں کو برابر اسلام کی طرف بلاتے رہے۔ آخر اللہ نے جب آپؐ کو مکّہ سے ہجرت کر جانے کا حکم دیا تو پہلے تین دن آپؐ غارِ ثور میں ٹھہرے۔ کافر آپؐ کو تلاش کرتے کرتے غار کے منہ تک پہنچ گئے۔ آپؐ کے پیارے ساتھی حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہُ نے ان کے پاؤں دیکھ لیے اور گھبرا کر آپؐ سے کہا

''یارسول اللہ ﷺ اگر یہ ذرا جھک کر دیکھیں گے تو ہم ان کو نظر آ جائیں گے''۔

آپؐ نے حضرت ابوبکر صدیقؓ کو تسلی دی اور فرمایا: ''گھبراؤ نہیں اللہ ہمارے ساتھ ہے''۔

اور پھر واقعی اللہ نے آپؐ کو بچالیا۔ کافر آپؐ کو دیکھ ہی نہ سکے۔ اور واپس چلے گئے۔

مدینہ میں ایک رات کو کچھ صحابہؓ آپؐ کے گھر کے گرد پہرا دے رہے تھے۔ آپؐ نے گھر سے سرِ اقدس باہر نکال کر فرمایا

''لوگو! اپنے اپنے گھروں کو واپس چلے جاؤ میری حفاظت میرا رب فرمائے گا''۔

ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ ایک لڑائی سے واپس آتے ہوئے ایک درخت کے نیچے سو گئے۔ ایک کافر بدو ننگی تلوار ہاتھ میں لیے آپؐ کو شہید کرنے کے ارادے سے آیا اور گستاخی کے ساتھ آپؐ کو جگا کر پوچھا: ''اب تم کو کون بچائے گا''۔

آپؐ نے فرمایا ''اللہ!''

یہ سن کر بدو کانپنے لگا اور تلوار اس کے ہاتھ سے گر گئی۔

ایک دفعہ صحابہؓ نے ایک شخص کو گرفتار کر کے آپ کے سامنے پیش کیا اور عرض کی کہ یہ آپ پر چھپ کر حملہ کرنا چاہتا تھا۔ آپؐ نے فرمایا ''اس کو چھوڑ دو'' یہ مجھ کو قتل کرنا بھی چاہتا تو نہیں کر سکتا تھا۔ اللہ میری حفاظت کرنے والا ہے''۔

ایک مرتبہ رسولِ پاک ﷺ کی خدمت میں ایک بدو حاضر ہوا۔ وہ اونٹ پر سوار ہو کر آیا تھا۔ اس نے آتے ہی عرض کی:

''یارسول اللہ! میں اپنے اونٹ کو یونہی کھلا چھوڑ کر اللہ پر توکّل کر لوں تو میرا اونٹ مجھ کو مل جایا کریگا، یا اسے باندھ بھی رکھوں اور اللہ پر بھی توکّل کروں''۔

آپؐ نے فرمایا: ''اونٹ کو باندھ کر بھی رکھو اور اللہ پر بھی توکّل کرو''۔

سچ تو یہ ہے کہ جو شخص بھی اللہ پر توکل کرتا ہے وہ نہ کسی کے سامنے ہاتھ پھیلاتا ہے اور نہ کسی مصیبت میں ہمت ہارتا ہے۔ وہ بہادر اور نڈر رہتا ہے اور مایوسی کو کبھی اپنی قریب نہیں آنے دیتا۔ اس کو اپنی کوشش کا نتیجہ جلد حاصل ہو یا نہ ہو، وہ خدا کی مرضی پر راضی رہتا ہے۔ اور اسی پر بھروسا کرتے ہوئے اپنی کوشش کو جاری رکھتا ہے۔ کوشش اور محنت کے بغیر کسی چیز کی آرزو کرنا توکل نہیں ہے۔ حضرت علیؓ کا قول ہے کہ ''جس کسی نے کوئی عزت اور بلندی کی جگہ بغیر کوشش کے اور تکلیف کے حاصل کرنی چاہی تو اس نے اپنی تمام عمر ایک ناممکن چیز حاصل کرنے میں ضائع کی''۔

حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اپنی ذات پر بھروسا کرنے کا حکم دے کر اسے حوصلے اور طاقت کا بہت بڑا خزانہ عطا فرما دیا ہے۔ یہ انسان کی بدنصیبی ہوگی کہ وہ اس خزانے سے فائدہ نہ اٹھائے۔

اسلام میں عورتوں کے حقوق

ہر مسلمان کا اس بات پر پختہ اور کامل ایمان ہے کہ خَاتمِ الانبیاء وَالمُرسلین ﷺ کو اللہ جَلّ شانہٗ نے سارے جہانوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا۔ جیسا کہ قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے:

وَ مَا اَرۡسَلۡنٰكَ اِلَّا رَحۡمَةً لِّلۡعٰلَمِيۡنَ

یعنی (اے نبی!) ہم نے آپ کو سارے جہانوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا

حُضُور ﷺ کی حیاتِ طیّبہ پر ایک نظر ڈالی جائے تو معلوم ہو گا کہ آپؐ مخلوقِ خدا کی ہر جنس کے لیے سراپا رحمت ہی رحمت اور خیر ہی خیر تھے۔ آپؐ کا ابرِ رحمت دوستوں، دشمنوں، بوڑھوں، جوانوں، بچوں، بے زبان جانوروں، غریبوں، یتیموں، اپاہجوں، زیردستوں، مردوں اور عورتوں پر ہر وقت جھوم جھوم کر برستا رہتا تھا۔

حُضُور ﷺ کی بعثت کے وقت اِس عَالَمِ رنگ و بُو میں ایک ایسی مخلوق بھی تھی جسے دنیا کی تمام قوموں میں بہت ذلیل اور حقیر سمجھا جاتا تھا حالانکہ وہ انسانی زندگی کی گاڑی کے دو پہیوں میں سے ایک پہیہ تھی۔ ہماری مراد طبقۂ اناث یعنی عورتوں سے ہے۔

عورت کو اللہ تعالیٰ نے مرد کی ساتھی بنا کر پیدا کیا تھا۔ دُکھ سُکھ ہر حال میں وہ مردوں کے ساتھ رہی لیکن رفتہ رفتہ ایسا وقت آ گیا کہ مردوں نے اس کی قدر و قیمت اور اہمیّت کو قصّۂ پارینہ بنا دیا۔ عیسائی عورت اور گناہ کو ایک چیز سمجھتے تھے۔ رومی عورت کو غلام یا نوکر سمجھتے تھے اور اس پر ہر طرح کی سختی کرنے کو جائز قرار دیتے تھے۔ ہندو عورت کو اپنی روحانی ترقی میں بڑی رُکاوٹ جانتے تھے۔ یہودی عورت کو بعض خاص حالتوں میں گھر سے نکال دیتے تھے۔ عرب میں عورت کو جوتی کی نوک کے برابر سمجھا جاتا تھا۔ کسی کے گھر میں بیٹی پیدا ہوتی تو اس کو بڑی ذِلّت اور بے عزّتی کا باعث سمجھا جاتا۔ اکثر بے رحم لوگ بیٹی پیدا ہوتے ہی اسے زندہ زمین میں دفن کر دیتے تھے یا کسی

کنوئیں میں پھینک دیتے تھے۔ رسولِ اکرم ﷺ نے مبعوث ہو کر عورت کو اتنا بلند مقام دیا کہ اس کے قدموں کے نیچے جنت رکھ دی۔ آپ نے عورت کو ماں، بیوی، بیٹی اور بہن ہر حیثیت میں اتنی عزت دی اور اتنے حقوق عطا فرمائے کہ دنیا کی کسی دوسری قوم میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ قرآنِ حکیم میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو ماں باپ کے ساتھ اچھا سلوک کرنے اور ان کی عزت کرنے کا حکم دیا ہے اس سلسلے میں رسولِ اکرم ﷺ نے بھی ماں باپ کی فرمانبرداری اور خدمت کرنے کی بار بار تاکید فرمائی ہے۔

آپؐ نے جہاں باپ کی ناراضی کو اللہ کی ناراضی قرار دیا ہے (یعنی باپ کو ناراض کرنے سے اللہ تعالیٰ ناراض ہو جاتا ہے) وہاں مسلمانوں کو یہ بھی بتایا ہے کہ ماں کے قدموں میں تمہاری جنت ہے مطلب یہ کہ ماں کی خدمت کرنے والا جنت کا حقدار بن جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کے گناہ (ماں کی خدمت کے عوض) بخش دے گا اور اس کو جنت میں داخل کر دے گا۔

صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں حضرت مغیرہ رضی اللہ عنہُ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے، بے شک اللہ تعالیٰ نے تم پر اپنی ماؤں کی نافرمانی کرنے اور ان کے حق غصب کرنے کو حرام قرار دیا ہے۔

عورت بیوی کی حیثیت میں ہو تو اللہ تعالیٰ نے مردوں کو حکم دیا ہے:

وَ عَاشِرُوْ هُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ یعنی ان عورتوں کے ساتھ اچھے طریقے سے زندگی گزارو۔ (سورۂ نساء آیۃ: ۱۹)

رسولِ پاک ﷺ نے بھی بیویوں کے ساتھ اچھا سلوک کرنے کی تاکید فرمائی ہے۔ آپؐ کا ارشاد ہے کہ مسلمانوں میں وہی شخص کامل الایمان ہے جس کا اخلاقی برتاؤ سب کے ساتھ بہت اچھا ہو خصوصاً اپنی بیوی کے ساتھ جس کا سلوک لطف و محبت کا ہو۔ (جامع ترمذی عن عائشہؓ)

آپؐ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ کوئی ایمان والا شخص اپنی مومنہ بیوی سے نفرت نہیں کرتا اگر اس کی کوئی عادت اچھی نہیں تو دوسری کوئی عادت اچھی ہو گی (یا عادتیں اچھی ہوں گی)۔ (صحیح مسلم۔ عن ابو ہریرہؓ)

ایک دفعہ حضور ﷺ سے پوچھا گیا کہ یا رسول اللہ! کسی شخص کی بیوی کا اس کے شوہر پر کیا حق ہے تو آپؐ نے فرمایا، اس کا حق یہ ہے کہ جب تُو کھائے تو اسے کھلائے، اور جب تو پہنے تو اسے پہنائے اور اس کے چہرے پر نہ مارے اور اس کو بددعا کے الفاظ نہ کہے اور اگر اس سے ترکِ تعلق کرے تو صرف گھر میں کرے۔

(ابوداؤد-عن حکیم بن معاویہؓ)

حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، تم میں سب سے بہتر وہ ہے جو اپنی عورتوں کے لیے بہتر ہے۔

(ابنِ ماجہ)

بیوہ عورت کے بارے میں حضور ﷺ کا ارشاد ہے کہ اس کے لیے دوڑ دھوپ کرنے والا (یعنی اس کی خبر گیری کرنے والا) مجاہد فی سبیل اللہ کی طرح ہے اور اس کے برابر ہے جو دن بھر روزہ رکھے اور رات بھر نماز پڑھے۔ (صحیحین عن ابو ہریرہؓ)

عورت بیٹی کی حیثیت میں ہو تو رسولِ اکرم ﷺ نے جہاں اس کو نہایت سختی کے ساتھ، زندہ درگور کرنے یا قتل کرنے سے منع فرمایا ہے وہاں اس کو اچھے طریقے سے پالنے پوسنے کا حکم دیا ہے اور ایسا کرنے کو جنت حاصل کرنے کا ذریعہ بتایا ہے۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کی رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، جس کے ہاں بیٹی پیدا ہو پس وہ نہ اسے زندہ درگور کرے اور نہ ذِلت کی حالت میں رکھے اور نہ اولادِ نرینہ (یعنی بیٹوں) کو اس پر ترجیح دے تو اللہ تعالیٰ اس کو جنت میں داخل کرے گا۔

(ابوداؤد)

حضور ﷺ نے یہ بھی فرمایا ہے جس کسی نے تین یا دو بیٹیوں یا ایک بیٹی کی بھی پیار محبت کے ساتھ پرورش اور تربیت کی یہاں تک کہ اللہ نے انہیں بے نیاز کر دیا (یعنی وہ شادی کے بعد اپنے شوہر کے گھر پہنچ گئیں) تو ایسے شخص کے لیے اللہ نے جنّت واجب کر دی۔ (مشکوٰۃ شریف عن ابنِ عباسؓ)

حضورؐ نے بہنوں کے ساتھ بھی اچھا سلوک کرنے کی ہدایت فرمائی ہے۔

(ادب المفرد عن کلیبؓ و مقدامؓ بن معدی کرب)

اسلام نے عورتوں کو اور جو بڑے بڑے حقوق عطا کیے ہیں ان میں سے کچھ یہ ہیں:-

۱۔ شادی کے لیے عورت کی رضا مندی ضروری ہے اس کی مرضی کے خلاف یا اس کی رضا مندی کے بغیر کسی کو اس کا نکاح کرنے کا حق نہیں۔

۲۔ عورت (خواہ وہ کتنی مالدار ہو) شوہر سے ہر حال میں نفقہ پانے کی حقدار ہے۔

۳۔ عورت باپ، شوہر اور اولاد سے (بعض صورتوں میں دوسرے قریبی رشتے داروں سے) وراثت پانے کی حقدار ہے۔

۴۔ عورت شوہر سے شرعاً، اخلاقاً اور قانوناً مہر پانے کی حق دار ہے۔

۵۔ ناکارہ، ظالم اور ناپسندیدہ شوہر سے جان چھڑانے کے لیے عورت کو خُلع کا حق دیا گیا ہے۔

۶۔ بیوہ، مطلّقہ یا فسخِ نکاح والی عورت کو دوسرے نکاح کا حق دیا گیا ہے۔

۷۔ وراثت اور مہر سے حاصل شدہ رقم کی عورت کو (بلا شرکتِ غیرے) مالک قرار دیا گیا ہے۔ اگر وہ یہ رقم تجارت میں لگا کر یا محنت مزدوری کر کے کچھ حاصل کرتی ہے تو وہ بھی اس کی ملکیت قرار دیا گیا ہے۔

۸۔ فوجداری اور دیوانی مقدمات میں اور جان مال عزت اور آبرو کے تحفظ میں عورت کو مرد کے برابر رکھا گیا ہے۔

۹۔ عورت کو علم حاصل کرنے کی نہ صرف اجازت دی گئی بلکہ ان کی تعلیم و تربیت کو اسی طرح ضروری قرار دیا گیا جس قدر مردوں کی تعلیم و تربیت ضروری ہے۔

۱۰۔ عبادت اور تزکیۂ نفس کے ذریعے عورت بڑے سے بڑا روحانی درجہ اسی طرح حاصل کر سکتی ہے جس طرح مرد۔

۱۱۔ عورت کا عمومی دائرۂ کار وہی مقرر کیا گیا جو اس کی جسمانی ساخت اور فطری صلاحیتوں سے ہم آہنگ ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اسلام نے عورت کو اس کی ہر حیثیت میں جو اونچا مقام اور

حقیقت یہ ہے کہ اسلام نے عورت کو اس کی ہر حیثیت میں جو اونچا مقام اور احترام دیا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ عورتوں کے حقوق ادا کرنا جہاں ہر سچے مسلمان کی دینی، اخلاقی اور قانونی ذمہ داری ہے وہاں یہ اللہ تعالیٰ کو راضی کرنے کا ذریعہ بھی ہے۔

…… ☆ …… ☆ ……

۱۔ حضرت ابو مسعود بدری رضی اللہ عنہٗ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جب آدمی اپنے گھر والوں پر آخرت میں اجر پانے کی نیت سے خرچ کرتا ہے تو یہ اس کے لیے صدقہ بن جاتا ہے۔

(صحیحین)

۲۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہٗ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جب آدمی کے پاس دو بیویاں ہوں اور اس نے ان کے حقوق میں انصاف اور برابری نہ رکھی تو قیامت کے دن وہ اس حال میں آئے گا کہ اس کا آدھا دھڑ گر گیا ہوگا۔

(ترمذی)

۳۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہٗ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ بوڑھوں، کمزوروں اور عورتوں کا حج اور عمرہ کرنا ثواب میں جہادِ کبیر (جہاد فی سبیل اللہ) کے برابر ہے۔

(نسائی)

خیر کی راہ۔ رَحم

اسلام سلامتی امن ہمدردی اور بھائی چارے کا دین ہے۔ یہ زندگی کے ہر شعبے میں انسان کو خیر اور بھلائی کی راہ دکھاتا ہے۔ اس پر چل کر انسان اپنی دنیا بھی سنوار سکتا ہے اور آخرت بھی۔ اسلام نے اللہ تعالیٰ کو راضی کرنے کے لیے نیکی کے جن کاموں کا بطورِ خاص حکم دیا ہے، ان میں رحم کو بنیادی حیثیت حاصل ہے خود اللہ جَلَّ شانُہٗ کا ایک صفاتی نام الرَّحِیم ہے یعنی بڑا رحم کرنے والا، رحم سے بھرا ہوا۔ اُس ذاتِ پاک کا ایک اور صفاتی نام ''الرَّحْمٰن'' ہے اس کا مطلب بھی ہے بڑا رحم کرنے والا۔ ہر مسلمان کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ ہر اچھا کام شروع کرنے سے رحمٰن اور رحیم کا نام لے یعنی بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْم پڑھے۔ رحمٰن اور رحیم دونوں ہی رحمت سے مشتق ہیں۔ اسلام چونکہ انسانیت کے لیے دینِ رحمت ہے اور خَاتَمُ الْاَنْبِیَاء وَالْمُرْسَلِیْن ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے دونوں جہانوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا:

وَمَا اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِیْنَ (الانبیا:۱۰۷)

(اور ہم نے آپ کو دونوں جہانوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا)

اس لیے دینِ حق اسلام کے عَلَم بردار اور رسولِ رحمت ﷺ کا کلمہ پڑھنے والے سبھی اہلِ ایمان آپس میں بھی ایک دوسرے کے لیے (رحیم) ہوں گے اور دوسرے انسانوں کے لیے بھی کیونکہ رسولِ اکرم ﷺ نے فلاحِ آخرت یا جنت میں داخلے کے لیے رحم دلی کو لازمی شرط قرار دیا ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہُ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، قسم ہے اُس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے کہ جنّت میں سوائے رحم کرنے والے کے کوئی نہ جائے گا، لوگوں نے کہا، ہم سب رحم کرنے والے ہیں، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، نہیں (کوئی شخص جنّت کا مستحق نہیں ہوگا) جب تک وہ عوام النّاس پر رحم نہ کرے۔ (کنز العمال)

قرآنِ حکیم میں صحابہ کرامؓ (مؤمنین) کی امتیازی صفات یہ بیان کی گئی ہیں:

مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ، وَالَّذِيْنَ مَعَهٗٓ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ
بَيْنَهُمْ تَرٰهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا سِيْمَا
هُمْ فِيْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ (الفتح:۲۹)

ترجمہ:۔ محمد اللہ کے رسول ہیں اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں وہ کُفّار پر سخت اور آپس میں رحیم ہیں تم جب دیکھو گے انہیں رکوع و سجود اور اللہ کے فضل اور اس کی خوشنودی کی طلب میں مشغول پاؤ گے۔ سجدوں کے اثرات ان کے چہروں پر موجود ہیں جن سے وہ الگ پہچانے جاتے ہیں۔

اس آیتِ مبارکہ میں مؤمنین کی امتیازی صفت یہ بیان کی گئی ہے کہ وہ آپس میں رحیم و شفیق ہیں، ان کی سختی جو کچھ بھی ہے دشمنانِ دین کے لیے ہے۔ اگر غور کریں تو معلوم ہوگا کہ دشمنانِ دین کے مقابلے میں مومنین کی سختی بھی اُن (کُفّار) کی بہتری کے لیے ہے۔ مقصد اس کا یہ ہے کہ وہ راہِ راست پر آ جائیں اور اپنی عاقبت سنوار لیں۔ یہ سختی ایسی نہیں ہے کہ ان کو زبردستی اپنا مذہب بدلنے پر مجبور کیا جائے ایسا کرنے سے اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا ہے لَآ اِکْرَاہَ فِی الدِّیْنِ داعیِ حق کی صفت یہ ہے کہ وہ نرم مزاج اور رحم دل ہوتا ہے۔ یہاں سختی سے مراد یہ ہے کہ مُؤمنین میدانِ جنگ میں کُفّار کے مقابلے میں ثابت قدم رہتے ہیں نیز یہ کہ کُفّار کی ترغیب و تحریص کو سختی سے ردّ کر دیتے ہیں اور دینِ حق سے منحرف ہونے کا خیال تک دل میں نہیں لاتے

رسولِ اکرم ﷺ کی شانِ رحیمی اللہ تعالیٰ نے یوں بیان فرمائی ہے:

لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ
حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ (التوبہ:۱۲۸)

ترجمہ:۔ (تمہارے پاس خود تم ہی میں سے ایک ایسا رسول آیا ہے جسے ہر وہ چیز شاق گزرتی ہے جو تم کو تکلیف (نقصان) پہنچائے، جو تمہاری بھلائی

کا بے حد خواہشمند اور اہلِ ایمان پر نہایت شفیق اور مہربان ہے۔)

رحم کا مطلب ہے ترس، دردمندی، مہربانی، ہمدردی، کرم، رحمت۔ اللہ تعالیٰ نے رسولِ اکرم ﷺ کی حیاتِ طیبہ کو مسلمانوں کے لیے بہترین نمونہ قرار دیا۔ چنانچہ آپ تمام مخلوقِ خدا سے بڑھ کر رحم دل اور نرم مزاج تھے۔ آپؐ دوست، دشمن، بوڑھے، جوان، بچے، مرد، عورت، کافر، مسلمان حتّٰی کہ بے زبان جانور ہر ایک پر رحم فرماتے تھے۔ کسی کو مصیبت میں دیکھ کر آپ کو بہت دُکھ ہوتا تھا اور آپؐ اُس کا دکھ درد دُور کرنے کے لیے جو کچھ بھی ہو سکتا تھا کرتے تھے۔ آپؐ نے لوگوں کو بتایا کہ اللہ تعالیٰ جو رحمان اور رحیم ہے اُس کو وہی بندے محبوب ہیں جو لوگوں پر رحم کرتے ہیں، وہ اپنے ان بندوں کو اپنی بے پایاں رحمتوں سے نوازے گا۔ سُنَنِ ابی داوٗد اور جامع ترمذی میں حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

لوگوں (اللہ کی مخلوق) پر رحم کرنے اور ترس کھانے والوں پر اللہ تعالیٰ (رحمٰن) کی خاص رحمت ہوگی۔ دیکھو؛ تم زمین والی مخلوق پر رحم کرو، تم پر آسمان والا رحمت کرے گا۔

اس حدیث میں بڑے بلیغ انداز میں تمام مخلوق پر جس سے انسان کا واسطہ پڑتا ہے، رحم کھانے کی ترغیب دی گئی ہے کیونکہ دوسروں کے ساتھ ترحّم کا معاملہ کرنے والا اللہ تعالیٰ کی رحمتِ خاص کا مستحق ہو جاتا ہے۔ اس کے برعکس جو شخص بے رحم ہے مخلوقِ خدا پر ظلم کرتا ہے یا کسی محتاج سائل یا مصیبت میں مبتلا کسی انسان پر رحم نہیں کھاتا اس کے لیے سخت وعید آئی ہے وعید یہ کہ وہ اللہ کے رحم و کرم سے محروم ہو جاتا ہے۔ صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں حضرت جریر بن عبداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہُ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

”جو شخص اللہ کے بندوں پر رحم نہیں کرتا اللہ اس پر رحم نہیں کرتا“

اسی طرح جامع ترمذی میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہُ سے روایت ہے

کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے کہ جس شخص کے دل سے رحم ہٹایا جاتا ہے وہ یقیناً بدبخت ہوتا ہے۔ (ترمذی باب رحمت الناس)

مولانا الطاف حسین حالی رحمتہ اللہ علیہ نے ''مسدسِ حالی'' میں اس مضمون کو یوں بیان کیا ہے:

خدا رحم کرتا نہیں اس بشر پر — نہ ہو درد کی چوٹ جس کے جگر پر
کسی کے گر آفت گزر جائے سر پر — پڑے غم کا سایہ نہ اُس بے اثر پر
کرو مہربانی تم اہلِ زمین پر
خدا مہرباں ہو گا عرشِ بریں پر

رسولِ اکرم ﷺ کا یہ ارشاد کہ جو لوگ دوسرے قابلِ رحم انسانوں پر رحم نہیں کھاتے اور ان کی تکلیف اور ضرورت کو محسوس کر کے اپنی استطاعت کے مطابق ان کی مدد اور خدمت نہیں کرتے، وہ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے محروم ہو جاتے ہیں، معروف عالمِ دین مولانا محمد منظور نعمانی رحمتہ اللہ علیہ نے اس ارشادِ نبوی کی یوں تشریح کی ہے:۔

''واضح رہے کہ چوروں، ڈاکوؤں اور اس طرح کے دوسرے مجرموں کو سزا دینا اور قاتلوں کو قصاص میں قتل کرنا، ترحّم کی اس تعلیم و ہدایت کے خلاف نہیں ہے بلکہ یہ بھی عوام کے ساتھ ترحّم ہی کا تقاضا ہے اگر مجرموں کو تعزیری قانون کے مطابق سخت سزائیں نہ دی جائیں تو بیچارے عوام ظالموں کے مظالم اور مجرمین کے جرائم کا اور زیادہ نشانہ بنیں گے۔ قرآنِ پاک میں ارشاد فرمایا گیا ہے:

وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يّٰاُولِي الْاَلْبَابِ (البقرہ:۱۷۹)

ترجمہ:۔ اے اہلِ دانش قصاص کے قانون میں تمہارے لیے زندگی کا سامان ہے''

(معارف الحدیث جلد ششم صہ ۷-۱۴۶)

یہاں یہ بات بھی ذہن میں رکھنی چاہیے کہ عفو و درگزر اور صلۂ رحمی (یا رحم) رحم دلی ہی کی شاخیں ہیں لیکن موضوع کی وسعت کے پیشِ نظر ان کا ذکر الگ کیا جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مخلوقِ خدا کے ساتھ اچھا سلوک خواہ از راہِ ترحم کیا جائے یا صرف رضائے الٰہی (اللہ تعالیٰ کی خوشنودی) کی خاطر دونوں صورتوں میں ایک نہایت اعلیٰ عَملِ خیر ہے جو خاصانِ خدا میں شامل کرا سکتا ہے۔ حضرت اَنس بن مالک اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:۔

''ساری مخلوق اللہ تعالی کی عَیال (گویا اس کا کنبہ) ہے۔ اس لیے اللہ کو زیادہ پیارا اپنی مخلوق میں وہ آدمی ہے جو اللہ کی عَیال (یعنی اس کی مخلوق) کے ساتھ احسان اور اچھا سلوک کرے۔ (شعب الایمان للبیہقی)

رحمتِ عالَم ﷺ نے ''رحم'' کو صرف انسانوں ہی کے لیے مختص نہیں فرمایا بلکہ حیوانوں پر بھی رحم کھانے کی تاکید فرمائی ہے۔ حضورؐ کی بعثت کے وقت عرب میں رواج تھا کہ لوگ زندہ اونٹ کی کوہان اور زندہ دُنبے کی چکتی کاٹ کر کھا جاتے تھے۔ حضورؐ نے کسی بھی زندہ جانور کا کوئی عضو کاٹنے سے منع فرمایا اور ایسا کرنے والے پر لعنت بھیجی۔ (صحیح بخاری)

ایک حدیث میں حضورؐ کا یہ ارشاد بھی آیا ہے کہ ''جس کسی نے کسی جانور کا مُثلہ کیا (یعنی کان ناک دُم چکتی وغیرہ کاٹ کر اس کی صورت بگاڑ دی) اللہ تعالیٰ اس مُثلہ کرنے والے کا قیامت کے دن مُثلہ کرے گا''۔ (مُسندِ احمد)

عرب میں یہ دستور بھی تھا کہ لوگ جانوروں کو باندھ کر ان پر نشانہ بازی کی مشق کرتے تھے اور جانوروں کو آپس میں لڑایا بھی کرتے تھے۔ حضور ﷺ نے ان دونوں کاموں سے لوگوں کو سختی سے منع فرمایا۔ (صحیح مسلم، ابوداؤد و ترمذی)

ان کے علاوہ حیوانوں پر رحم اور ان سے اچھا سلوک کرنے کے بارے میں اور بہت سی احادیث وارد ہوئی ہیں۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضور ﷺ نے اس سلسلے میں چند اصول مقرر فرمائے تھے اور مسلمانوں کو ان پر عمل کرنے کا حکم دیا تھا۔

ان اصولوں کا خلاصہ یہ ہے۔

۱۔ ہر جانور سے وہی کام لینا چاہیے جس کے لیے وہ پیدا کیا گیا ہے۔ (صحیح بخاری)

۲۔ ہر جاندار (بشمول حیوانات) سے اچھا سلوک کرنا موجب ثواب ہے۔
(صحیح بخاری)

(ان میں ضرر پہنچانے والے درندے سانپ بچھو وغیرہ
موذی جانور شامل نہیں ان کو مارنا جائز ہے)

۳۔ کسی جانور کو ضرورت کے بغیر مارنا (قتل کرنا یا ذبح کرنا) بہت بڑا گناہ ہے۔
(مستدرک حاکم)

۴۔ کسی جانور کو (ضرورتاً) ذبح کرتے وقت اچھا طریقہ اختیار کرنا چاہیے، چھری کو تیز کر لینا اور ذبیحے کو آرام پہنچانا چاہیے۔ (صحیح مسلم)

۵۔ جانوروں کے منہ پر نہ مارو اور نہ اس پر داغ دو (نہ اس کو داغو) ایسا کرنے والا ملعون ہے۔ (ابوداؤد)

۶۔ جانوروں کو بھوکا پیاسا مت رکھو۔ (صحیح مسلم)

۷۔ پرندوں کے گھونسلوں سے ان کے انڈے مت اٹھاؤ اور نہ ان کے بچے پکڑو۔
(مسلم۔ ابوداؤد)

۸۔ ذبح کیے جانے والے جانور کے سامنے چھری تیز نہ کرو بلکہ اس کو پچھاڑنے سے پہلے ہی اسے تیز کر لو۔ (مستدرک حاکم)

۹۔ چیونٹیوں کو آگ میں مت جلاؤ۔ آگ کی سزا دینا صرف اللہ تعالیٰ کو سزاوار ہے۔
(ابوداؤد، مُسند احمد)

(اس ارشادِ نبویؐ کی روشنی میں کسی دوسرے جاندار کو بھی آگ میں جلانا جائز نہیں)

۱۰۔ حیوانوں اور پرندوں کو کنکر اور پتھر نہ مارو اور نہ ان پر غلیل چلاؤ۔ اس سے نہ شکار ہو سکتا ہے، اور نہ دشمن شکست کھا سکتا ہے البتہ اس سے کسی کا دانت ٹوٹ سکتا ہے اور آنکھ پھوٹ سکتی ہے۔ (بخاری)

مختصر یہ کہ رحم دلی ایک ایسی صفت ہے جو کسی انسان کو اللہ تعالیٰ کا محبوب اور جنت کا مستحق بنا سکتی ہے ہم سب کو دعا کرنی چاہیے کہ اگر ہمارے دلوں میں سختی ہے تو ہمارا ربّ جو رحیم اور کریم ہے، اسے نرمی میں بدل دے، اور ہمیں مخلوقِ خدا پر رحم اور شفقت کرنے کی توفیق دے۔

حدیثِ نبویؐ

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، ایک مسلمان کے دوسرے مسلمان پر چھ ۶ حق ہیں اوّل یہ کہ جب ملاقات ہو تو سلام کرے دوسرے یہ کہ جب ایک دوسرے کو دعوت پر بلائے تو وہ دعوت قبول کرے تیسرے یہ کہ جب وہ نصیحت (یا مشورے) کا طالب ہو تو اس سے دریغ نہ کرے چوتھے یہ کہ جب اس کو چھینک آئے اور وہ الحمدُ لِلّٰہ کہے تو یہ اس کو یرحمک اللہ کہے۔ پانچویں یہ کہ جب بیمار ہو تو اس کی عیادت کو جائے چھٹے یہ کہ جب وہ فوت ہو جائے تو اس کے جنازے کے ساتھ جائے۔ (صحیح مسلم)

حدیثِ نبویؐ

حضرت عُمر بن خطّاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ سے پوچھا گیا کہ سب سے اچھا عمل کون سا ہے؟ آپؐ نے فرمایا، کسی مسلمان کا دل خوش کر دینا بڑے ثواب کا کام ہے۔ اگر بھوکا ہے کھانا کھلا دو، اُس کے پاس کپڑے نہ ہوں تو کپڑے پہنا دو یا اس کی کوئی ضرورت اٹکی ہوئی تو اسے پوری کر دو۔

(ترغیب بحوالہ طبرانی)

برداشت اور تَحَمُّل

اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو جن بھلائی اور نیکی کے کاموں یعنی اعمالِ خیر کا حکم دیا ہے ان میں ایک نیک عمل برداشت اور تحمل کا ہے۔ برداشت اور تحمل کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ اللہ کی راہ میں یا دین کی خاطر خواہ کتنی ہی مصیبتیں اور کٹھنائیاں پیش آئیں ان کو صبر اور حوصلے کے ساتھ برداشت کیا جائے، اللہ تعالیٰ پر پورا بھروسا رکھا جائے اور کسی بھی حالت میں مایوس نہ ہوا جائے۔

دوسرا مطلب یہ ہے کہ اگر گھر کے کسی ملازم یا ملازمہ سے، کسی دوست یار سے یا کسی مسلمان بھائی سے کوئی قصور ہو جائے جس کے سبب غُصّہ آ جائے تو اس غُصّے کو پی لیا جائے یعنی اس پر قابو پا کر قصوروار کو معاف کر دیا جائے۔ اسی طرح زبان یا ہاتھ سے برائی کرنے والے کی بدگوئی یا برائی کو بھی برداشت کر لیا جائے اگرچہ اس سے بدلہ لینے کی طاقت اور وسائل بھی ہوں۔ اس طرزِ عمل کو بھی برداشت اور تحمل کہا جائے گا یا عفو و درگزر اور یہ صفت اللہ تعالیٰ کو بہت پسند ہے۔ سورۂ آل عمران میں فرمایا گیا ہے:

وَ الْکَا ظِمِیْنَ الغَیْظَ وَ الْعَافِیْنَ عَنِ النَّاسِ ط وَ اللّٰہُ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ.

(آیت ۱۳۴)

یعنی جو لوگ غُصّے کو پی جاتے ہیں اور دوسروں کے قصور معاف کر دیتے ہیں ایسے نیک لوگ اللہ کو بہت پسند ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا اپنا ایک پاک نام بھی "الحلیم" ہے یعنی اللہ جَلَّ شانُہٗ بہت حِلم والا ہے، وہ گناہوں کو معاف کرنے میں بڑا حلیم ہے، گناہوں کی سزا جلد نہیں دیتا، گنہگاروں کا رِزق بند نہیں کرتا، ان کی صحت و عافیت کو تباہ نہیں کرتا بلکہ ان کو اپنی

اصلاح اور توبہ کی مہلت دیتا ہے۔

برداشت، تحمل اور عفو و درگزر بھی حِلم ہی کی شاخیں ہیں۔ جو مسلمان اللہ تعالیٰ کے ''اَلحَلِیم'' ہونے پر ایمان رکھتا ہے اس کا فرض بنتا ہے کہ وہ حِلم، تحمل اور برداشت کو اپنی زندگی کا اصول اور اپنی عادت بنالے کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کو راضی کرنے کا بہترین ذریعہ ہے۔

ہمارے رسولِ پاک ﷺ قرآن مجید کی چلتی پھرتی تفسیر تھے آپ کے عمل اور قرآنِ حکیم میں اللہ تعالیٰ کے نازل کیے ہوئے احکام میں مطلق کوئی فرق نہ تھا اسی لیے اللہ تعالیٰ نے آنحضور ﷺ کی حیاتِ اطہر کو مسلمانوں کے لیے بہترین نمونہ قرار دیا ہے۔ جیسا کہ قرآنِ حکیم میں ارشاد ہوا ہے:

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ'' (الاحزاب)

حضور ﷺ کے حِلم و تحمل اور آپ کی برداشت کی کوئی انتہا نہ تھی۔ اس کا جو نمونہ آپؐ نے اُمت کے سامنے پیش کیا اگر سارے مسلمان اس کو مشعلِ راہ بنائیں تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ باہمی نفرت اور جھگڑے فساد ہمیشہ کے لیے ختم نہ ہو جائیں اور رحمتِ عالم ﷺ کے سارے نام لیوا اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ'' کی تصویر نہ بن جائیں۔ اُمّ المؤمنین حضرت عائشہ صِدّیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنی ذات کے لیے کبھی کسی سے انتقام نہیں لیا، آپ برائی کے بدلے برائی نہ کرتے بلکہ معاف فرما دیتے اور درگزر کرتے تھے

(ابوداؤد، ترمذی)

آنحضور ﷺ کی سیرتِ طیبہ پر ایک نظر ڈالیں تو معلوم ہوگا کہ کوئی سختی اور مصیبت ایسی نہ تھی جو آپؐ نے کافروں اور منافقوں کے ہاتھوں نہ جھیلی ہو۔ انہوں نے آپ کی ایذا رسانی میں کمینگی کی انتہا کر دی یہاں تک کہ آپ کو اپنا وطن اور گھر بار چھوڑنا پڑا۔ آپؐ نے یہ سب کچھ بڑے صبر اور تحمل کے ساتھ برداشت کیا اور جب فتحِ مکہ کے موقع پر اللہ تعالیٰ نے آپ کو ان پر غلبہ دے دیا اور غلبہ بھی ایسا کہ آپؐ کے ایک

اشارے پر وہ سب خاک وخون میں لوٹائے جا سکتے تھے لیکن آپؐ نے یہ فرما کر سب کو معاف فرما دیا ”میں تم سے وہی کہوں گا جو یوسف (علیہ السّلام) نے اپنے بھائیوں سے کہا تھا، آج تم پر کوئی الزام (ملامت) نہیں، جاؤ تم سب آزاد ہو“۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہُ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، موسیٰ ابنِ عمران علیہ السّلام نے اللہ تعالیٰ سے سوال کیا کہ اے میرے پروردگار تیرے نزدیک سب سے عزیز آدمی کون ہے، اللہ تعالیٰ نے جواب دیا، وہ شخص جو انتقام پر قادر ہو اور معاف کر دے۔ (مشکوٰۃ)

حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے (قبیلہ) عبدالقیس کے سردار اشجؓ سے فرمایا کہ تم میں دو خصلتیں ایسی ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ پسند کرتا ہے ایک حلم اور دوسری آہستگی۔ (جامع ترمذی)

ایک دفعہ ایک بدُّو آیا اور حضور ﷺ کی چادر مبارک اس زور سے کھینچی کہ اس کا کنارہ آپ کی گردن مبارک میں کُھب گیا اور آپؐ کو بہت تکلیف ہوئی۔ پھر اس نے گستاخانہ بڑے تُند لہجے میں کہا:

”اے مُحمّد! یہ میرے دو اونٹ ہیں ان پر لادنے کے لیے مجھے سامان دو، تیرے پاس جو مال ہے وہ نہ تیرا ہے نہ تیرے باپ کا“

حُضور ﷺ نے بڑی نرمی سے فرمایا:

”مال تو اللہ کا ہے، میں اُس کا بندہ ہوں مگر جو سلوک تم نے میرے ساتھ کیا ہے کیا اس پر تم سزا سے نہیں ڈرتے؟

بدّو نے کہا، نہیں۔

آپؐ نے پوچھا، کیوں؟

وہ بولا، مجھے پورا یقین ہے کہ تم بدی کا بدلہ بدی سے نہیں دیتے۔

اس کا جواب سن کر حُضور ﷺ مسکرانے لگے اور اس کے اونٹوں پر کھجوریں اور جَو لدوا دیے۔

ایک دفعہ رسولِ اکرم ﷺ نے لوگوں میں کچھ مال تقسیم کیا۔ ایک شخص نے آپ ﷺ کی تقسیم پر اعتراض کیا اور گستاخانہ کہا، اے اللہ کے رسول! اللہ سے ڈریں اور انصاف کریں۔ یہ بات سخت غصہ دلانے والی تھی لیکن آپ ؐ نے بڑے تحمل سے کام لیا اور صرف یہ فرما کر اس کو معاف کر دیا،

"اگر اللہ کا رسول انصاف نہیں کرے گا تو اور کون کرے گا...... اللہ تعالیٰ موسیٰ علیہ السّلام پر رحمت فرمائے، ان کی قوم نے اس سے بھی بڑھ کر اُن کو ستایا تھا"

ایک صحابی زیدؓ بن سعنہ اسلام قبول کرنے سے پہلے یہودی تھے۔ اُسی زمانے میں ایک دفعہ حضور ﷺ نے ان سے کچھ قرض لیا اور ایک مقرّرہ تاریخ تک اسے واپس کرنے کا وعدہ کیا لیکن زید نے مقرّرہ تاریخ سے پہلے ہی آ کر قرض کی واپسی کا مطالبہ کیا۔ اُن کا روّیہ سخت قابلِ اعتراض تھا کیونکہ انہوں نے آپ ﷺ کی چادر مبارک پکڑ کر کھینچی اور نہایت گستاخی سے کہا: "تم ٹال مٹول کر کے میری رقم مار لوگے"۔ اس کے علاوہ بھی کچھ اشتعال انگیز باتیں کہیں۔ اتفاق سے اس وقت حضرت عُمر فاروق رضی اللہ عنہُ بھی وہاں موجود تھے۔ ان کو زید کی گستاخانہ گفتگو سن کر غصہ آ گیا، وہ تلوار کھینچ کر زید کی طرف بڑھے اور کڑک کر کہا:

"او اللہ کے دشمن! تو اللہ کے رسولؐ کے بارے میں ایسی بُری باتیں کہتا ہے"

رسولِ اکرم ﷺ نے مسکرا کر حضرت عُمرؓ کو روکا اور فرمایا:

"اے عمر! تمہیں چاہیے تھا کہ مجھے قرضہ ادا کرنے کے لیے کہتے اور زید کو نرمی سے کام لینے کی تلقین کرتے"

اس کے بعد فرمایا:

"زید کا قرضہ میری طرف سے ابھی ادا کر دو اور اس کو بیس صاع (ایک وزن ہوتا تھا ایک صاع ۲ کلو ۱۷۶ گرام گیہوں کے وزن کے برابر) زیادہ دے دو"

زیدؓ حضور ﷺ کا حُسنِ اخلاق اور تحمل دیکھ کر اسی وقت مشرّف بہ اسلام

ہو گئے اور گڑ گڑا کر حضورؐ سے معافی چاہی آپؐ نے بلا تامّل معاف فرما دیا۔

حضرت عُمیر بن وہب رضی اللہ عنہٗ قبولِ اسلام سے پہلے رسولِ اکرم ﷺ کے سخت دشمن تھے ایک دفعہ آپؐ کو شہید کرنے کے ارادے سے مدینہ مُنوّرہ آئے لیکن پکڑے گئے۔ جب ان کو حضورؐ کے سامنے پیش کیا گیا تو آپ نے ان کو ملامت کیے بغیر بالکل معاف فرما دیا، آپ کے اس کریمانہ اخلاق کا عُمیر پر ایسا اثر ہوا کہ وہ حلقہ بگوشِ اسلام ہو گئے

اس طرح کے بیسیوں واقعات حُضُور ﷺ کی حیاتِ اطہر میں ملتے ہیں۔

کسی کی برائی اور زیادتی کو برداشت کرنا اور برائی یا زیادتی کرنے والے کو معاف کر دینا بڑا دل گُردے کا کام ہے۔ ایسا کرتے ہوئے بعض اوقات اپنی ذِلّت کا احساس ہوتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ عفو و درگزر بہت بڑی نیکی ہے اور ایسا کرنے والے کی عزّت کم نہیں ہوتی بلکہ بڑھتی ہے۔ صحیح مسلم میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہٗ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، اگر کوئی شخص کسی کا قصور معاف کرے تو اللہ تعالیٰ اس کی عزت بڑھاتا ہے۔

یہاں یہ بات بھی ذہن میں رکھنی چاہیے کہ اگر کوئی شخص واقعی مظلوم ہے اور وہ ناحق ظلم اور زیادتی کا شکار ہوا ہے تو اللہ تعالیٰ نے اسے مجبور اور پابند نہیں کیا کہ وہ لازماً عفو و درگزر سے کام لے۔ وہ بدلہ بھی لے سکتا ہے جیسا کہ سورۂ النحل میں ارشاد ہوا ہے:

وَ اِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوْا بِمِثْلِ مَا عُوْقِبْتُم بِهٖ ط (آیت ۱۲۶)

(اور اگر تم لوگ بدلہ لینے لگو تو بس اسی قدر لے لو جس قدر تم پر زیادتی کی گئی ہو)

یہاں بدلہ لینے کی اجازت کے ساتھ یہ پابندی عائد کر دی گئی ہے کہ بدلے کی مقدار اسی قدر ہو جس قدر زیادتی کی گئی ہو...... اکثر حالات میں بدلہ لیتے وقت کسی معیّن حد پر رہنا ممکن نہیں ہوتا اور حد سے بڑھ کر بدلہ لینے والا خود ظالم بن جاتا ہے اسی

لیے بدلہ لینے کی اجازت کے ساتھ یہ بھی فرمایا گیا ہے

وَ لَئِنۡ صَبَرۡتُمۡ لَهُوَ خَيۡرٌ لِّلصّٰبِرِيۡنَ (النحل ـ ۱۲۶)

(لیکن اگر تم صبر کرو تو یہ یقیناً صبر کرنے والوں ہی کے حق میں بہتر ہے)

گویا بدلہ لینے کی قدرت حاصل ہونے پر عفو و درگزر سے کام لینا اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کا باعث ہے۔ اس خوشنودی کی صورت کیا ہوگی سورۃ النّسآء میں اس کو یوں بیان کیا گیا ہے:

اِنۡ تُبۡدُوۡا خَيۡرًا اَوۡ تُخۡفُوۡهُ اَوۡ تَعۡفُوۡا عَنۡ سُوۡٓءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَفُوًّا قَدِيۡرًا (آیۃ ـ ۱۴۹)

یعنی تم علانیہ نیکی کرو یا چھپا کر کرو یا دوسرے کی برائی معاف کردو تو بے شک اللہ بھی بے حد معاف کرنے والا ہے وہ بڑا قدرت رکھنے والا ہے۔

مطلب یہ کہ تم کسی کی برائی سے درگزر کروگے اور اسے معاف کردوگے تو اللہ کی صِفت بھی یہی ہے کہ وہ بڑا معاف کرنے والا ہے وہ تمہارے لیے بھی معافی کا دروازہ کھول دے گا (یعنی تمہارے گناہوں سے بھی درگزر فرمائے گا) کیونکہ معاف کرنے کا اجر اللہ نے اپنے ذمّے لے رکھا ہے جیسا کہ سورہ الشّوریٰ میں ارشاد ہوا ہے

وَ جَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثۡلُهَا ۚ فَمَنۡ عَفَا وَ اَصۡلَحَ فَاَجۡرُهٗ
عَلَى اللّٰهِ ؕ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيۡنَ ○ (آیۃ ـ ۴۰)

برائی کا بدلہ ویسی ہی برائی ہے پھر جو کوئی معاف کردے اور اصلاح (صلح) کرے تو اس کا اجر اللہ کے ذِمّے ہے۔ بے شک اللہ ظالموں کو پسند نہیں کرتا۔

سُورۃ النّور میں ارشاد ہوا ہے:

وَلۡيَعۡفُوۡا وَ لۡيَصۡفَحُوۡا ؕ اَلَا تُحِبُّوۡنَ اَنۡ يَّغۡفِرَ اللّٰهُ لَكُمۡ ؕ وَ اللّٰهُ غَفُوۡرٌ رَّحِيۡمٌ (آیۃ ـ ۲۲)

ترجمہ: تمہیں چاہیے کہ (قصوروار کو) معاف کردو اور درگزر کرو، کیا تم نہیں چاہتے کہ اللہ تمہیں (تمہارے قصور) معاف کرے اور اللہ بخشنے والا مہربان

ہے۔ (اللہ تعالیٰ کی صِفت یہ ہے کہ وہ غفور اور رحیم ہے)

اس آیت مبارکہ میں واضح کر دیا گیا ہے کہ جو لوگ دوسروں کے قصور اور زیادتی معاف کر دیتے ہیں، اللہ تعالیٰ ان کے قصور (گناہ) معاف کر دیتا ہے۔ گویا قصور کرنے والے کو معاف کر دینا اور قدرت ہونے کے باوجود اس سے انتقام نہ لینا ایک ''اچھا انتقام'' اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک نہایت پسندیدہ عمل ہے۔ ''اچھا انتقام'' ان معنوں میں کہ جس شخص کے ظلم اور زیادتی کو نظر انداز کر کے اس کو معاف کر دیا جائے گا اس کا ضمیر اس کو ملامت کرے گا، وہ اپنے کیے پر نادم اور پشیمان ہوگا اور معاف کرنے والے کا احسان مند ہو کر اس کا دوست اور خیر خواہ بن جائے گا۔

ایک مومن اور داعیِ حق کی یہی شان ہے کہ وہ جاہلوں اور ظالموں کی بدزبانی اور زیادتیوں کو صبر و تحمل کے ساتھ برداشت کرتا ہے ان سے الجھتا نہیں اور اللہ کے بھروسے پر امر بالمعروف کا فریضہ ادا کرتا رہتا ہے۔ سورۃ الاعراف میں رسولِ اکرم ﷺ کو مخاطب کر کے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

خُذِ الْعَفْوَ وَ اْمُرْ بِالْعُرْفِ وَ اَعْرِضْ عَنِ الْجٰهِلِيْنَ (آیۃ. ۱۹۹)

یعنی (اے نبی) عفو و درگزر کا طریقہ اختیار کرو، نیکی کی تلقین کیے جاؤ اور جاہلوں کی نادانی کی باتوں سے چشم پوشی کرو (ان کی پروا نہ کرو یا ان سے نہ الجھو)

چنانچہ حضور ﷺ نے مکی زندگی کے پُر آشوب دَور میں ظالم کافروں کے مقابلے میں یہی طرزِ عمل اختیار فرمایا۔ اور بعد میں بھی آپؐ سے بڑھ کر عفو و درگزر کرنے والا کوئی نہ تھا۔

دعا ہے اللہ تعالیٰ ہم سب کو برداشت تحمل اور عفو و درگزر کی توفیق دے۔

اُخُوّت و اِتّحاد

اسلام اَمن، مَحبّت، احترامِ انسانیّت اور اُخُوّت و اِتّحاد کا دین ہے۔ مُساوات، رواداری، خدمتِ خلق، ایک دوسرے کی خیر خواہی، ایثار و کرم، مہمان نوازی، شیریں زبانی اور حِلم وتحمّل اُخُوّت و اِتّحاد ہی کی شاخیں ہیں۔ یہ دینِ اسلام ہی ہے جو معاشرے کے مختلف طبقوں کے درمیان نفرت وتصادم کو یکسر مسترد کرتا ہے۔ اس کے برعکس وہ ہر طبقے کے حُقوق مقرّر کرتا ہے اور ان کو حُقوق العِباد کا نام دے کر نجاتِ اُخروی کو ان کے پورا کرنے سے مشروط کرتا ہے اور جو ساتھ ہی واضح کرتا ہے کہ وہی معاشرہ، اسلامی معاشرہ کہلانے کا مستحق ہے جس کی تشکیل باہمی اُخوّت و اِتّحاد کی بنیاد پر ہوئی ہو۔ ایسے ہی معاشرے کو دنیا اور آخرت میں کامیابی کی بشارت دی گئی ہے۔

اسلام کا ''دستورِ اساسی'' قرآنِ مجید جہاں یہ اعلان کرتا ہے:

اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَام (آل عمران: ۱۹)

(یعنی درحقیقت دینِ اللہ کے نزدیک اسلام ہی ہے)

وہاں یہ بھی واضح کر دیتا ہے:

لَا اِکْرَاهَ فِی الدِّیْن (البقرہ: ۲۵۶)

(یعنی دین کوئی زور زبردستی نہیں ہے)

اِسی حُکمِ خداوندی کے پیشِ نظر مسلمانوں کے ساتھ غیر مُسلموں کو بھی وہ تمام بنیادی حقوق عطا کیے گئے جو قرآنِ پاک نے متعیّن کیے ہیں مثلاً جان و مال کا تحفّظ، عزت وآبرو کا تحفّظ، نجی زندگی کا تحفّظ، عقیدہ کی آزادی کا حق، عبادت گاہوں کا تحفظ وغیرہ یوں فساد اور نفرت کی جڑ کٹ گئی۔ جہاں تک اہلِ ایمان کا تعلّق ہے تو اللہ تعالیٰ اور اللہ کے رسول ﷺ نے ان میں باہمی اُخوّت و اِتّحاد کو لازم قرار دیا۔

سورۂ الحجرات میں ارشاد ہوا ہے:

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ فَاَصْلِحُوْ ابَیْنَ اَخَوَیْکُمْ (آیة ١٠)

یعنی مومن تو ایک دوسرے کے بھائی ہیں لہٰذا اپنے بھائیوں کے درمیان تعلّقات کو درست کرو۔

سورۂ آلِ عمران میں مسلمانوں کو حُکم دیا گیا ہے

وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِیْعًا وَّ لَا تَفَرَّقُوْا ۔(آیة ١٠٣)

یعنی سب مل کر اللہ کی رسی کو مضبوط پکڑ لو اور تفرِقہ میں نہ پڑو۔

اس حقیقت کی نہ صرف تاریخِ عالَم گواہی دیتی ہے بلکہ یہ عام مشاہدہ بھی ہے کہ فتنہ وفسادِ باہمی، کُشت وخون، نااتفاقی اور بدامنی کسی بھی قوم کے لئے عذاب کی حیثیت رکھتی ہے اور اگر اس کا بروقت تدارک نہ کیا جائے تو یہ اس قوم کی تباہی کا پیش خیمہ ثابت ہوتی ہے۔ آج سے تقریباً ڈیڑھ ہزار سال پہلے اہلِ عرب بھی اسی عذاب میں مبتلا تھے۔ باہمی کُشت وخون، نسل در نسل رہنے والی جنگوں، تشتت وافتراق اور دوسرے گوناگوں رذائل نے ان کو تباہی کے دہانے پر لا کھڑا کیا تھا۔ اگر چندے اور یہی حالت رہتی تو قانونِ قدرت کے مطابق عرب قوم کا نام ونشان تک صفحۂ ہستی سے مِٹ جاتا لیکن اللہ تعالیٰ نے اُن پر اپنا فضل کیا اور ریگ زارِ عرب میں خاتَم الانبیا، وَالمُرسَلین جناب محمّد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا ظُہور رہوا۔ یہ ظہور گویا ابرِ رحمت تھا جو انسانیت کی سوکھی ہوئی بے برگ وبار کھیتی پر جھوم جُھوم کر برسا اور اس کو سرسبز وشاداب کر دیا۔ کفر وشرک کا طوفان تھم گیا، قتل وغارت گری کا بازار سرد پڑ گیا، مفاسِد کا قلع قمع ہو گیا، مُتحارِب قبائل باہم شیر وشکر ہو گئے۔ مَعبُودانِ باطِل کے پَرستار ایمان لا کر دنیا کے بہترین انسان بن گئے۔ رحمتِ عالَم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو خدائے واحد کے دَر پر سجدہ ریز بنا کر اُخوّت کے ایسے ایمانی رشتے میں پرو دیا جو نَسلی اور نسبی برادری سے کہیں زیادہ فَوقیت رکھتا تھا۔

اہلِ ایمان میں اِس اُخُوَّت واِتّحاد کو اللہ تعالیٰ نے اُن پر اپنا احسان قرار

دیا۔ چنانچہ اہلِ عرب کو مُخاطب کر کے فرمایا گیا:

وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ
فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖۤ اِخْوَانًا ۚ وَكُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ
فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا ؕ (آل عمران: ۱۰۳)

یعنی اللہ کے اُس احسان کو یاد رکھو جو اس نے تم پر کیا ہے۔ تم ایک دوسرے کے دشمن تھے۔ اُس نے تمہارے دِل جوڑ دیے اور اُس کے فضل و کرم سے تم بھائی بھائی بن گئے۔ تم آگ سے بھرے ہوئے ایک گڑھے کے کنارے کھڑے تھے۔ اللہ نے تم کو اُس سے بچالیا۔

بلاشبہ عربوں میں یہ تحیّر خیز انقلاب اللہ تعالیٰ کا خاص احسان تھا ذرا غور کیجیے کہ وہی عرب جس میں امن و امان نام کی کسی شے کا وجود تک نہ تھا اور انسان انسان کے خون کا پیاسا تھا وہاں اُخوّت و اتحاد کی بدولت امن و آشتی کی ایسی بہار آتی ہے کہ سنسان گھاٹیوں اور صحراؤں میں کوئی آدمی تنِ تنہا بیسیوں میل تک سونا اچھالتا چلا جائے کوئی اس کی طرف آنکھ اُٹھا کر نہیں دیکھتا۔

رحمتِ عالم ﷺ کو اختلاف اور تفرقہ سے سخت نفرت تھی اور آپؐ مسلمانوں میں تفرقہ ڈالنے کو کفر و شرک کے بعد سب سے بڑا جرم اور گناہ سمجھتے تھے۔ چنانچہ کئی احادیث میں آپؐ نے مسلمانوں میں پھوٹ اور تفرقہ ڈالنے والے شخص کو بڑی سے بڑی سزا کا مُستوجب ٹھہرایا ہے۔

آنحضور ﷺ مسلمانوں کے باہمی تنازعات کا سختی سے محاسبہ فرمایا کرتے تھے۔ ان کو ایک دوسرے سے الجھنے کی مُمانعت فرماتے تھے۔ اگر باز نہ آتے تو بزور روک دیتے یا فریقین میں مُصالحت کرادیتے آپؐ فرمایا کرتے کہ دو مُتحارب فریقوں میں انصاف کے ساتھ صلح کرادینے سے صدقہ کا ثواب ملتا ہے۔

حُضورؐ نے ہجرت سے پہلے مکہ میں اہلِ ایمان کے درمیان بھائی چارا قائم کرایا اور ہجرت کے بعد مدینہ مُنوّرہ میں مُہاجرین اور انصار کے درمیان عقدِ مُواخاۃ

قائم کرایا اور اپنی وفات تک مسلمانوں کو برابر اُخوّت و اتحاد اور باہمی اُلفت و یگانگت کی تلقین فرماتے رہے۔ اس سلسلے میں آپؐ کے چند ارشادات سماعت فرمائیں:

- خدا کی قسم تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک مومن نہیں ہوسکتا جب تک وہ اپنے مسلمان بھائی کے لئے وہی بات پسند نہ کرے جو اپنے لئے کرتا ہے۔
- مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور جس کے ہاتھ سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں۔ (صحیحین)
- ایک دوسرے سے حسد مت کرو۔ بازار میں کوئی چیز بکتی ہو اور کوئی اس کو خریدتا ہو تو خریدنے کی نیّت کے بغیر اس کی قیمت مت بڑھاؤ، ایک دوسرے سے بُغض مت رکھو، ایک دوسرے سے ازراہِ حقارت مُنہ مت پھیرو، اور تم میں سے کوئی دوسرے کے سودے پر سودا مت کرے، اللہ کے بندو ایک دوسرے کے بھائی بن جاؤ۔ مسلمان مسلمان کا بھائی ہے نہ اس پر ظلم کرے، نہ اس کی مدد سے ہاتھ کھینچے اور نہ اس کو حقیر جانے۔ ہر چیز مسلمان کی مسلمان پر حرام ہے اس کی عزّت، اس کا خون، اس کا مال۔ (صحیح مسلم)
- مسلمان اپنے مسلمان بھائی کا آئینہ ہے اور مومن مومن کا بھائی ہے اسے نقصان سے بچاتا ہے اور اس کی غیر حاضری میں اس کے حُقوق کی حفاظت کرتا ہے۔ (ابوداؤد)
- مسلمان بھائی کی خیرخواہی کرنا دین (کی اصل) ہے۔ (ترمذی)
- اللہ تعالیٰ قیامت کے دن فرمائے گا، کہاں ہیں وہ لوگ جو باہم محبّت رکھتے تھے۔ مجھے اپنے جلال کی قسم ہے انہیں میں آج اپنے سایہ میں جگہ دوں گا اور آج میرے سایہ کے سوا کوئی سایہ نہیں۔ (صحیح مسلم)
- اپنے بھائی کی مدد کرو خواہ وہ ظالم ہو یا مظلوم۔ حضورؐ سے پوچھا گیا کہ یا رسول اللہ ﷺ ظالم کی مدد کیسے کی جائے؟ آپؐ نے فرمایا، اُس کو ظلم سے روک دو یہی اسکی مدد ہے۔

- حَجّۃُ الوَداع کے خطبہ میں رحمتِ عالم ﷺ نے منجملہ دوسرے ارشادات کے یہ بھی فرمایا:

سارے مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں اور تم سب ایک اُمّت ہو۔ تمہارے خون، مال اور تمہاری عزّتیں ایک دوسرے پر ہمیشہ کے لئے حرام کردی گئی ہیں، میرے بعد گمراہ نہ ہوجانا کہ آپس میں کُشت وخون کرنے لگو۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمارے دلوں میں اُخوّت واتحاد اور یگانگت ومحبت کا جذبہ حقیقی معنوں میں پیدا کردے اور ہم ملک ومِلّت کے دشمنوں کے مقابلے میں بُنیانٌ مَّرصُوص یعنی سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن جائیں۔ آمین!

رواداری اور کُشادہ دِلی

قرآنِ حکیم کتابِ ہدایت ہے جو زندگی کے ہر شعبے میں ہماری رہنمائی کرتی ہے اللہ کی یہ پاک کتاب اَخلاقِ حَسَنہ یا حسنِ سیرت وکردار کو بڑی اہمیت دیتی ہے اور واضح کرتی ہے کہ اخلاقِ حَسَنہ کو دین سے الگ کیا ہی نہیں جا سکتا، سرورِ عالم ﷺ کا ارشاد ہے کہ میں اسی لئے بھیجا گیا ہوں کہ اَخلاقِ حَسَنہ کی تکمیل کروں۔ چنانچہ حضور ﷺ نے قرآنِ مجید کے احکام کے مطابق مسلمانوں کی سیرت وکردار کی تعمیر پر خاص توجہ دی۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ عرب کے صحرا نشینوں میں ایسے بلند کردار انسانوں کی ایک عظیم جماعت تیار ہوگئی جنھوں نے تہذیب وتمدن کے ہر شعبے میں دنیا کی رہنمائی کی۔ رواداری، کشادہ دلی، کشادہ نظری یا کشادہ ظرفی اَخلاقِ حَسَنہ ہی کی ایک شاخ ہے جس سے کئی اور شاخیں بھی پھوٹتی ہیں مثلاً عدل وانصاف، عفو ودرگزر، حِلم وتحمل، خدمتِ خلق وغیرہ۔ قرآنِ پاک کا آغاز ہی رَبّ العالمین کی حمد سے ہوتا ہے یعنی اُس رَبّ کی حمد سے جو سارے جہانوں اور ہر عقیدے، مذہب اور مسلک کے انسانوں کا رَبّ ہے۔ مولانا حالیؔ نے کیا خوب کہا ہے:

یہ پہلا سبق تھا کتابِ ھُدیٰ کا
کہ ہے ساری مخلوق کنبہ خدا کا

فی الحقیقت اسلام اپنے اندر کشادہ نظری یا انسانی رواداری کی جو رُوح رکھتا ہے، کوئی بھی انصاف پسند اس سے انکار نہیں کر سکتا۔ یہ کشادہ نظری تمام نوعِ انسانی کے لیے ہے جس میں کسی قوم یا دینِ اسلام کے پیروؤں کی تخصیص نہیں۔ اس کا اندازہ ہمیں دعوتِ اسلام کی حقیقت سے ہو سکتا ہے کہ رحمتِ عالم ﷺ کس بے لوثی کے ساتھ ہدایتِ انسانی کا فرض انجام دیتے ہیں اور ظلم وفساد کی جڑیں کاٹتے ہیں۔ ایسا کرتے وقت نہ تو آپؐ کسی قوم کو غلام بناتے ہیں اور نہ آپؐ کے سینۂ پاک میں کسی قوم یا مذہب کے خلاف کینہ یا عداوت ہوتی ہے۔ اسلام کی یہی روح ہے جو دنیا میں

امن قائم کر سکتی ہے، مختلف قوموں اور نسلوں میں ہم آہنگی اور انسانوں میں باہمی رواداری، محبت اور ہمدردی پیدا کر سکتی ہے، باہمی حسد، طبقاتی جنگ قومی پیکار اور مذہبی تعصب سے زندگی کی فضا کو پاک وصاف بنا سکتی ہے۔

سورۃ بقرہ میں ارشاد ہوتا ہے، لَا اِکْرَاہَ فِي الدِّیْنِ یعنی دین میں کوئی زبردستی نہیں ہے۔

سورۃ کہف میں فرمایا گیا ہے: فَمَنْ شَآءَ فَلْیُؤْمِنْ وَّ مَنْ شَآءَ فَلْیَکْفُرْ یعنی جو چاہے ایمان لائے اور جو چاہے کافر ہے۔ (آیة ۲۹)

سورۃ الانعام میں ارشاد ہوا ہے: وَلَا تَسُبُّوا الَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ فَیَسُبُّوا اللّٰہَ عَدْوًا بِغَیْرِ عِلْمٍ ط (آیة ۱۰۸)

یعنی جن لوگوں کو یہ مشرک اللہ کے سوا پکارتے ہیں ان کو گالیاں نہ دو کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ شرک سے آگے بڑھ کر جہالت کی بناء پہ اللہ کو گالیاں دینے لگیں۔

دوسرے لفظوں میں قرآنِ حکیم نے بت پرستوں کے بُتوں کو بھی ان کے سامنے بُرا کہنے سے منع فرمایا ہے۔

ایک اور جگہ ارشاد ہوتا ہے کہ لوگوں کو دعوتِ حق دو تو زور، تشدّد، درشتی اور سخت کلامی سے نہیں بلکہ حکمت اور عمدہ پند وموعظت سے انہیں راہِ حق کی طرف بلاؤ۔

سورۃ النحل میں یہ حکم اس طرح دیا گیا ہے: اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ

غرض قرآنِ حکیم میں جگہ جگہ کشادہ نظری یا اختلافِ عقائد کی برداشت اور باہمی رواداری کی تلقین کی گئی ہے اور تعصب اور عصبیّت کو سخت مذموم قرار دیا گیا ہے سرورِ عالم ﷺ کی حیاتِ طیبہ قرآنِ حکیم کی عملی تفسیر تھی آپ نے کشادہ نظری کا جو نمونہ پیش کیا اس کو یوں کہنا چاہیے:

آسائشِ دو گیتی تفسیرِ ایں دو حرف است
با دوستاں تلطف با دشمناں مدارا

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ ہمارے پاس سے ایک جنازہ گزرا۔ رسول اللہ علیہ وسلم اس کو دیکھ کر کھڑے ہوگئے اور ہم لوگ بھی آپؐ کے اتباع میں کھڑے ہوگئے۔ پھر ہم نے عرض کیا، یارسول اللہ یہ جنازہ تو ایک یہودی کا تھا، آپ نے فرمایا، کیا وہ فردِ انسانی نہ تھا؟ جب تم جنازے کو دیکھو تو کھڑے ہوجایا کرو۔ حضورؐ نے ہجرت کے بعد مدینہ منورہ میں نزولِ اجلال فرمایا تو سب سے پہلا کام آپؐ نے یہ کیا کہ یہود سے معاہدۂ صلح وآشتی طے کیا جس میں یہود کو نہ صرف مکمل مذہبی آزادی دی گئی بلکہ شہری اور ثقافتی معاملات میں بھی انہیں مسلمانوں کے برابر حقوق دیے گئے۔ آپؐ کی مدنی زندگی میں کئی بار ایسا ہوا کہ کوئی مقدمہ آپؐ کے سامنے لایا گیا جس میں ایک فریق یہودی تھا اور دوسرا مسلمان۔ آپؐ نے فریقین کے بیانات سن کر اگر یہودی کو حق پر پایا تو بلا تامل اس کے حق میں فیصلہ دے دیا۔

اسی طرح اگر آپ کسی ہمسایہ یا شناسا یہودی کی علالت کی خبر سنتے تو اس کی عیادت کے لئے تشریف لے جاتے۔

حضرت جبیرؓ بن مطعم سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص اپنی قوم کی بے جا حمایت کی طرف لوگوں کو بلائے وہ ہم میں سے نہیں اور جو حالتِ تعصب میں مرجائے وہ بھی ہم میں سے نہیں ہے۔

سرورِ عالم ﷺ نے ظلم وفساد کو مٹانے کے علاوہ اور کسی مقصد کے لئے کبھی تلوار اٹھانے کی اجازت نہیں دی۔ مجاہدین کے لئے آپؐ کی واضح ہدایات تھیں کہ کسی عورت بچے بوڑھے، بیمار، خادم اور مذہبی پیشوا پر ہاتھ نہ اٹھایا جائے فتح مکہ کے بعد آپؐ نے تمام جبابرۂ قریش کو ان کے گھناؤنے ماضی کے باوجود معاف کردیا غزوۂ حنین میں مشرکین کی تیر باری سے مسلمانوں کو سخت نقصان پہنچا تھا لیکن جب ان کو شکست ہوئی اور ان کے چھ ہزار آدمی گرفتار کرکے آپؐ کے سامنے لائے گئے تو آپ نے ان سب کو نہ صرف آزاد کردیا بلکہ اپنے پاس سے عمدہ کپڑے بھی عطا کیے۔ ۹ ہجری میں نجران سے عیسائیوں کا ایک وفد حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپؐ

نے ساٹھ آدمیوں پر مشتمل اس وفد کو مسجدِ نبوی میں ٹھہرایا اور اس کے ارکان کو اپنے طریق پر نماز پڑھنے کی اجازت دے دی۔ اگرچہ ان لوگوں نے اسلام، قبول نہ کیا لیکن جب تک وہ رخصت نہ ہوئے حضورؐ نے ان کی تکریم اور مہمانداری میں کوئی کمی نہ فرمائی۔ اسی سال اہلِ طائف کا وفد عبدِ یالیل کی سرکردگی میں مدینہ آیا یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے ۱۰؁ نبوت میں آپ سے سخت ناروا سلوک کیا تھا، سنگباری کر کے آپؐ کو مجروح کر دیا تھا لیکن آپ نے نہایت خندہ پیشانی سے ان کا استقبال کیا اور کئی دن تک بڑے اہتمام سے ان کی مہمانداری کی۔

ایک مرتبہ چند شریر یہودی آپ کے پاس آئے اور ازراہِ خباثت ''السَّامُ عَلَیْکُم''، یعنی تمہیں موت آئے کہا۔ اُمُّ المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ قریب ہی موجود تھیں۔ انہوں نے غضبناک ہو کر جواب دیا وَعَلَیْکُمُ السَّامُ وَاللَّعْنَة (یعنی تمہیں بھی موت آئے اور لعنت اس پر مزید) جب وہ چلے گئے تو حضورؐ نے فرمایا ''عائشہ تم نے کیوں ایسا جواب دیا اللہ تو نرمی کو پسند کرتا ہے'' حضورؐ چاہتے تو ان یہودیوں کو سخت سزا دے سکتے تھے لیکن یہ آپؐ کی کشادہ نظری تھی کہ حضرت عائشہ صدیقہؓ کا سخت جواب دینا بھی گوارا نہ فرمایا عرب میں دشمنوں کی لاشوں کا مُثلہ کرنے کا رواج تھا یعنی لاش کے ہونٹ کان، ناک اور بعض دوسرے اعضاء کاٹ ڈالتے تھے۔ حضورؐ نے مسلمانوں کو اس وحشیانہ حرکت کی سختی سے ممانعت کر دی اور حکم دیا کہ دشمن کی لاش کی بھی بے حرمتی نہ کرو۔ اسی طرح آپؐ نے جنگی قیدیوں کے بارے میں حکم دیا کہ انہیں کوئی اذیت نہ پہنچائی جائے اور ان کے کھانے پینے کا اچھی طرح خیال رکھا جائے غزوۂ بدر کے بعد چشمِ فلک نے یہ منظر بھی دیکھا کہ بعض صحابۂ کرامؓ خود بھوکے پڑے رہتے تھے لیکن اپنے قیدیوں کو پیٹ بھر کر کھانا کھلاتے تھے۔

حجتہ الوداع کے موقع پر رحمتِ عالم ﷺ کا ابرِ کرم نوعِ انسانی پر یوں برسا کہ آپ نے کم و بیش ایک لاکھ کے مجمع کے سامنے اعلان فرمایا:

''کسی عربی کو کسی عجمی پر کسی عجمی کو کسی عربی پر، کسی گورے کو کسی

کالے پر اور کسی کالے کو کسی گورے پر کوئی فضیلت نہیں ہے بجز پرہیز گاری کے“

تاریخ انسانی کے اس عدیم المثال اعلان نے رنگ و نسل کے تعصب اور تنگ نظری کی جڑیں کاٹ کر رکھ دیں اور کشادہ نظری کا ایسا نظریہ پیش کیا جو بنی نوع انسان کی فلاح و بہبود کا ضامن ہے۔ حضورؐ کے صحابہ کرامؓ بھی نہایت کشادہ دل اور وسیع الظرف تھے۔ حضرت عُمرِ فاروق رضی اللہ عنہ کے عہدِ خلافت میں انہیں شام میں ایک محاذ سے دوسرے محاذ کو منتقل ہونا پڑا تو جن شہروں کو خالی کیا وہاں کے غیر مسلم باشندوں کو ان سے وصول کیا ہوا جزیہ واپس کر دیا کہ اب ہم تمہاری حفاظت نہیں کر سکتے۔ وہ لوگ روتے تھے اور دُعائیں کرتے تھے کہ خدا تمہیں پھر واپس لائے۔

حضرت عُمرِ فاروق رضی اللہ عنہُ نے ایک دفعہ ایک ضعیف العمر اندھے کو ایک دروازے پر بھیک مانگتے دیکھا تو اس سے پوچھا تم کون ہو اور کس چیز نے تمہیں بھیک مانگنے پر مجبور کیا۔ اس نے کہا میں یہودی ہوں اور جزیہ، احتیاج اور بڑھاپے نے مجھے گداگری پر مجبور کیا ہے۔ حضرت عمرؓ چشم پُر آب ہو گئے، اس کا ہاتھ پکڑ کر گھر لائے اس کی ضرورت کی تمام چیزیں فراہم کیں اور بیت المال سے اس کا وظیفہ مقرر کر دیا ساتھ ہی فرمایا ”خدا کی قسم یہ انصاف کی بات نہیں کہ ہم نے اس کی جوانی سے تو فائدہ اٹھایا اور بڑھاپے میں اس کو اس طرح رسوائی کے ہاتھوں میں چھوڑ دیں۔ یہ بھی ایک غیر مسلم مسکین ہے اور صدقات میں اس کا بھی حصہ ہے“

اسی طرح جب حضرت عمرؓ نے دمشق کا سفر کیا تو کچھ کوڑھی عیسائیوں پر آپ کا گزر ہوا۔ فوراً حکم دیا کہ صدقات کے مال سے ان کا وظیفہ مقرر کیا جائے اور ساتھ ہی کھانا بھی۔

بیت المقدس تشریف لے گئے اور وہاں کے عیسائیوں سے معاہدہ کیا تو اس میں ان کو جان و مال کی حفاظت اور مکمل مذہبی آزادی کی ضمانت دی اور یہ ذمہ داری قبول کی کہ ان کے گرجوں اور صلیب وغیرہ کو بالکل نہیں چھیڑا جائے گا۔ مقدس مقامات کی سیر کرتے کرتے ایک گرجا میں نماز کا وقت آ گیا تو پادری نے درخواست کی

کہ آپ گرجا ہی میں نماز ادا کرلیں لیکن حضرت عمرِ فاروقؓ نے یہ فرما کر انکار کر دیا کہ اگر ہم نے یہاں نماز ادا کرلی تو ہمارے بعد مسلمان یہ دعویٰ کریں گے کہ یہ مقام ان کی عبادت گاہ ہے۔

یہ ہے وہ رواداری اور کشادہ دلی جس کی تعلیم اسلام دیتا ہے اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس پر کاربند ہونے کی توفیق عطا فرمائے آمین ثم آمین۔

حدیثِ نبویؐ

حضرت اَنس اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:۔ ساری مخلوق اللہ تعالیٰ کی عیال (گویا اس کا کنبہ ہے) اس لئے اللہ کو زیادہ محبوب اپنی مخلوق میں وہ آدمی ہے جو اللہ کی عیال (مخلوق) کے ساتھ احسان اور اچھا سلوک کرے۔

(شعب الایمان للبیہقیؒ)

حدیثِ نبویؐ

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:۔ جو نیک بیٹا ماں باپ کی طرف رحمت و شفقت کی نظر سے دیکھے اللہ اس کے حساب میں ہر نظر کے بدلے ایک مقبول حج کا ثواب لکھ دیتا ہے۔ (بیہقیؒ)

اسلام کی خاص الخاص صِفت حیا ہے

حضرت زید بن طلحہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ "ہر دین کی ایک صِفت ہوتی ہے (جو کہ اس میں عمدہ اور غالب ہوتی ہے) اسلام کی صِفت (جو اس میں عمدہ اور غالب ہے) حیا ہے۔" (مؤطا امام مالکؒ)

"حیا" جسے ہادئ برحق ﷺ نے اسلام کی خاص الخاص صفت قرار دیا ہے، اس کے لُغوی معنی شرم، حجاب، غیرت اور لحاظ کے ہیں۔ ان میں سے ہر لفظ بڑا وسیع المفہوم ہے مختصرً ا یوں سمجھ لیجیے کہ کوئی بھی برا کام (جس سے اللہ اور رسولؐ نے منع فرمایا ہے) کرنے میں اللہ کا خوف نہ کرنا اور اسے بلا جھجک در پردہ یا دھوم دھڑلے سے کرنا بے حیائی ہے جو اللہ کے غضب کو دعوت دیتی ہے۔ حیا فی الحقیقت اخلاقِ حسنہ کی عمدہ ترین صفت ہے اسے ہم ایک پاکیزہ جذبہ بھی کہہ سکتے ہیں جو انسان کو برائیوں سے روکتا ہے اگر یہ نہ ہو تو پھر انسان بے حیا ہو کر جو چاہے کر سکتا ہے۔ مرد ہو یا عورت اگر اس میں حیا نہیں ہے تو وہ سخت بدنصیب اور ایمان کی دولت سے محروم ہے۔ قرآنِ حکیم میں ارشاد ہوا ہے:

وَلَا تَقْرَبُوا الْفَوَاحِشَ مَاظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ. (الانعام. ۱۵۱)

"اور بے حیائی کی باتوں کے قریب بھی نہ جاؤ خواہ وہ کھلی ہوں یا چھپی۔"

ایک اور جگہ فرمایا گیا ہے:

قُلْ اِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّیَ الْفَوَاحِشَ مَاظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ
وَالْاِثْمَ وَالْبَغْیَ بِغَيْرِ الْحَقِّ. (الاعراف. ۳۳)

"اے نبیؐ ان سے کہہ دیجیے کہ میرے رب نے جو چیزیں حرام کی ہیں وہ تو یہ ہیں، بے حیائی کے کام خواہ کھلے ہوں یا در پردہ اور گناہ اور حق کے خلاف زیادتی۔"

اب حیا کے بارے میں رحمتِ عالم ﷺ کے کچھ ارشادات ملاحظہ

فرمائیں:

حضرت ابو مسعود رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ انبیاءِ سابقین کی باتوں میں جو بات لوگوں نے پائی ہے وہ یہ ہے کہ جب تُجھ میں حیا نہ رہے تو جو چاہے کر یعنی بے حیا باش و ہر چہ خواہی کن (صحیح بخاری)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسولِ اللہ ﷺ نے فرمایا کہ حیا ایمان کی ایک شاخ ہے اور اہلِ ایمان بہشت میں ہیں اور بے حیائی اکھڑپن ہے اور اکھڑوں کا ٹھکانا دوزخ ہے۔ (جامع ترمذی)

حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ حیا سے صرف بھلائی ہی حاصل ہوتی ہے۔ (مشکوٰۃ المصابیح)

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ حیا اور ایمان دونوں باہم ملے ہوئے ہیں تو جب کسی شخص کا ان میں سے ایک اٹھالیا جاتا ہے تو دوسرا بھی فوراً اٹھالیا جاتا ہے۔ (مشکوٰۃ المصابیح)

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جس چیز میں فحش ہوتا ہے اس کو عیب دار بنا دیتا ہے اور جس چیز میں حیا ہوتی ہے اس کی زینت بڑھاتی ہے۔ (مشکوٰۃ)

حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ حیا ایمان کی علامت ہے اور ایمان جنت کا ذریعہ ہے اور بے حیائی گندگی ہے اور گندگی دوزخ کا موجب ہے۔ (مشکوٰۃ)

رسولِ اکرم ﷺ اور آپؐ کے صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین نے حیاداری کا جو نمونہ اُمّت کے سامنے پیش کیا، اس کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ اس کنواری لڑکی سے بھی زیادہ حیادار تھے جو پردہ میں بیٹھی رہتی ہو اگر آپؐ کسی ایسی چیز کو دیکھتے جو آپؐ کو ناگوار ہوتی تو آپؐ شرم کی وجہ سے ناگواری کا اظہار (زبان مبارک

سے) نہ کرتے، ہم اس کو آپؐ کے چہرۂ مبارک سے معلوم کر لیتے تھے۔ (صحیحین)

رسول اللہ ﷺ کبھی کوئی فحش بات زبان سے نہ نکالتے۔ (صحیح بخاری)

رسول اللہ ﷺ عورتوں سے زبانی بیعت لیتے۔ کسی (غیر) عورت کے ہاتھ کو آپؐ نے کبھی ہاتھ نہیں لگایا۔ (صحیح بخاری)

اُمّ المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کو کبھی کسی شخص کے بارے میں کسی برائی کی اطلاع ملتی تو آپؐ اس کا نام لے کر یہ نہ فرماتے کہ اس نے ایسا کیوں کیا۔ آپؐ یوں فرماتے کہ لوگوں کو کیا ہو گیا کہ وہ ایسا کہتے ہیں یا ایسا کرتے ہیں۔ شرم و حیا کی وجہ سے ناپسندیدہ کام کرنے والے کا نام نہ لیتے۔ (سنن ابی داؤد)

اگر کوئی خطا کار حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر پشیمانی کا اظہار کرتا اور عفوِ تقصیر کی درخواست کرتا تو آپؐ شرم و حیا سے گردن مبارک جھکا لیتے تھے۔ (شمائلِ کبریٰ بحوالہ ترمذی و شفا)

رسولِ اکرم ﷺ میں شرم و حیا کی صفت بدرجہ کمال پائی جاتی تھی فی الحقیقت آپؐ شرم و حیا کا پیکرِ جمیل تھے۔ کبھی کسی پر طعن و تشنیع نہ فرماتے کیونکہ اسے بھی شرم و حیا کے خلاف سمجھتے تھے۔ بازاروں سے گزرتے تو خاموشی سے نظریں نیچے جھکائے چلتے۔ قہقہہ لگا کر کبھی نہ ہنستے۔ ہنسی کے موقع پر بھی اکثر زیرِ لب تبسم پر اکتفا فرماتے۔

حضرت عثمانِ غنی رضی اللہ عنہ کی شرم و حیا کا یہ عالم تھا کہ دروازہ بند ہونے پر بھی غسل خانے میں ازار نہ اتارتے اور فرماتے مجھے ایسی حالت میں جھک کر پانی لینے میں شرم آتی ہے۔

حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ تاریکی میں غسل فرمایا کرتے تھے اس پر بھی فرطِ حیا سے سیدھے کھڑے نہ ہوتے تھے۔

رسولِ اکرم ﷺ کی ایک صحابیہ حضرت اُمِ خلاد رضی اللہ عنہا کے بیٹے

حضرت خلاد رضی اللہ عنہ غزوۂ بنی قُریظہ میں رسولِ اکرم ﷺ کے ہم رِکاب تھے۔ ایک یہودی عورت نے اپنے مکان کی چھت سے ان پر بھاری پتھر گرادیا جس کے صدمے سے شہید ہوگئے۔ والدہ کو خبر ملی تو اس سانحہ کی تفصیل جاننے کے لیے رسولِ اکرم ﷺ کی خدمتِ اقدس میں حاضر ہوئیں۔ عقل وخرد پر بجلی گرادینے والے اس صدمے کے باوجود انہوں نے اپنے چہرے پر نقاب ڈال رکھی تھی۔ بارگاہِ نبوی میں جو لوگ حاضر تھے، ان میں سے کسی صاحب نے کہا، بی بی تمہارا بیٹا قتل ہوگیا ہے حیرت ہے کہ ایسی مصیبت کے وقت بھی تم نے چہرے پر نقاب ڈال رکھی ہے؟

حضرت اُمِ خلادؓ نے نہایت اطمینان سے جواب دیا:

''اگر میں نے اپنا بیٹا کھویا ہے تو کیا شرم وحیا بھی کھودوں؟''

اس قسم کے بے شمار واقعات سیرت اور تاریخ کی کتابوں میں ملتے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ مِلّتِ اسلامیہ میں شرم وحیا اور تحفظِ عزت وناموس کی قرنِ اوّل ہی سے کس قدر اہمیّت رہی ہے لیکن افسوس آج جب ہم اپنے اسلامی جمہوریہ پاکستان کے ذرائع ابلاغ پر نظر ڈالتے ہیں تو یوں معلوم ہوتا ہے کہ وہ اللہ اور رسولؐ کے احکام کا مذاق اڑا رہے ہیں اور ساری قوم بالخصوص نژادِ نو کو شرم وحیا سے عاری بنانے پر تُلے ہوئے ہیں۔ اس معاملے میں سرکاری سرپرستی میں چلنے والا سب سے مؤثر ادارہ پاکستان ٹیلی ویژن پیش پیش ہے اگر چہ ہمارے اکثر قومی اخبار بھی اس کارِ خیر میں سرگرم نظر آتے ہیں لیکن حیرت ان قومی اخباروں پر ہے جو ایک طرف تو اسلامی نظام کے حامی ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں اور پی ٹی وی کے اخلاق باختہ پروگراموں کی مذمّت کرتے ہیں اور دوسری طرف اپنے صفحات پر شرم وحیا سے عاری دوشیزاؤں کی مختلف پوزوں میں رنگین تصاویر دھڑا دھڑ چھاپ رہے ہیں اور یوں گلیمر کلچر کو فروغ دینے میں پی ٹی وی سے بھرپور تعاون کررہے ہیں صرف یہی نہیں بلکہ اپنے قارئین کو بے ہودہ اخلاق سوز فلموں کی طرف راغب کرنے اور ان فلموں میں بے حیائی کا مظاہرہ کرنے والے ایکٹروں اور ایکٹرسوں کو عظمت کی مسندوں پر بٹھانے میں بھی

کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کر رہے۔

اسلامی جمہوریہ پاکستان کا ٹیلی ویژن' جسے تبلیغِ اسلام، تعمیرِ ملّت اور اصلاحِ معاشرہ کا سب سے بڑا ذریعہ ہونا چاہیے تھا (اس کے چند دینی اور معلوماتی پروگراموں کو چھوڑ کر)' مرد وزن کے آزادانہ اختلاط، بے حیائی، فحاشی اور تہذیب مغرب کی آشوب سامانیاں اور برائیاں پھیلانے کا سب سے بڑا آلہ یا ذریعہ بن گیا ہے۔ اس پر رقص و سرود، لہو ولعب، بے ہنگم اچھل کود اور فن کے نام پر رقاصاؤں اور شرم وحیا سے عاری مغرب زدہ نوجوانوں اور دوشیزاؤں کا قبضہ ہو چکا ہے۔ پی ٹی وی کو ان کے ناچ گانوں سے فرصت ملتی ہے تو ان کے انٹرویوز چلا دیے جاتے ہیں۔ پاکستان کی نسلِ نو کو اسلام کے پاکیزہ اخلاق کا حامل بنانے کے بجائے پاپ میوزک، حیا سوز رقص و سرود اور ہیجڑہ پن کا رسیا بنایا جا رہا ہے۔ پی ٹی وی میں کام کرنے والی ناکتخدا لڑکیوں کی حیا کا جو عالم ہے اس کو ایک ایکٹر کی زبانی سنیے:

ہوئیں بے تکلف وہ ٹی وی پہ مجھ سے
بنیں میری بیوی ڈراموں میں اکثر
جو پوچھا کسی نے مرا ان سے رشتہ
تو بولیں یہ ہیں میرے منہ بولے شوہر

(ہدایت علی خان ناظر)

پاکستان ٹیلی ویژن کے کرتا دھرتا پڑھے لکھے لوگ ہیں اس لیے یہ تو کوئی بھی تسلیم نہیں کر سکتا کہ وہ ہمارے قومی نظریہ یا ہماری معاشرتی اور دینی اقدار وروایات سے نابلد ہیں...... اس لیے لامحالہ یہی رائے قائم کی جا سکتی ہے کہ ان اقدار وروایات کا ایک خاص مشن کے تحت جان بوجھ کر مذاق اڑایا جا رہا ہے۔ یہ مشن کیا ہے؟ بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ "ملّتِ پاکستان کے بدن سے روحِ محمدؐ نکال دو۔"

پی ٹی وی کے تفریحی پروگراموں کو دیکھ کر کسی بھی محبِ وطن اور دردمند پاکستانی کے ذہن میں یہ سوالات پیدا ہو سکتے ہیں۔

۱۔ کیا کنواری نوجوان لڑکیوں کا غیر محرم نوجوانوں کی محبوبہ یا بیوی بننا اور زچگی کی کیفیت سے گزر کر بچوں کی ماں بننا اسلامی روایات کے مطابق ہے؟ جن گھرانوں کی یہ لڑکیاں ہیں، وہ کس تہذیب کے عَلَم بردار ہیں؟

۲۔ کیا ہماری معاشرتی روایات یہی ہیں کہ نوجوان لڑکے اور لڑکیاں آپس میں معاشقے لڑاتے پھریں اور ایک دوسرے سے تنہائی میں خفیہ ملاقاتیں کریں؟ آخر پی ٹی وی اپنے ڈراموں میں نژادِنو کو کس چیز کی تربیت دے رہا ہے؟

۳۔ کیا پاپ سنگر نوجوانوں کو مٹک مٹک کر اچھلتے کودتے (اپنی ٹانگوں کو شرمناک انداز میں حرکت دیتے) یا بھنگڑا ڈالتے ہوئے ارضِ پاک کی کسی (حیا سے عاری) بیٹی کو مخاطب کر کے انتہائی فحش اور لچر گیت گاتے ہوئے دکھانا اسلامی یا پاکستانی معاشرت کی عکاسی ہے؟

کیا ان نوجوانوں اور ان کے سامنے آنے والی دوشیزاؤں کو شرم وحیا سے کوئی نسبت ہے؟

۴۔ کیا اسلام کی بیٹیوں کو بن ٹھن کر اسٹیج پر آنا، گانا، ناچنا، تھرکنا، بھاؤ بتانا اور فحش گیت گا گا کر لوگوں کے سفلی جذبات کو بھڑکانا اسلامی روایات کی عکاسی کرتا ہے یا تبرّجِ جاہلیہ کی؟

۵۔ کیا راگ رنگ کے مخلوط اجتماعات دکھانا اور ان میں شوقین مزاج نوجوان عورتوں کا فحش گیتوں پر بے تحاشا تالیاں بجانا اور ”اسلام کے نوجوان لا ابالی فرزندوں“ کا ناچ ناچ کر ایسے گیتوں کی داد دینا، اسلامی معاشرت کی عکاسی ہے؟

۶۔ کیا بچوں کے پروگراموں میں وطنِ عزیز کی کم سن بچیوں کو ناچ گانے کی تعلیم دینا ہمارے قومی نظریہ کے مطابق ہے؟

۷۔ کیا پاکستان کے نوّے فی صد گھرانوں کو اس گلیمر کلچر سے کوئی نسبت ہے جو پی ٹی وی پر تسلسل کے ساتھ پیش کیا جا رہا ہے؟

۸۔ کیا بلو دے گھر، پتنگ باز سجنا، اج گڈی گڈے دی ملاقات اے وغیرہ

جیسے شرمناک اور کنوارے دو، او مائی گاڈ وغیرہ جیسے لغو ڈرامے پاکستانی معاشرت کے عکاس ہیں؟

کاش ہمارا ٹی وی اپنے نوجوانوں کو گانے ناچنے کا رسیا بنانے کے بجائے حیدرؓ و خالدؓ کا جانشین بننے اور اپنی نوجوان بہنوں اور بیٹیوں کو نور جہاں اور شازیہ منظور بننے کے بجائے عائشہؓ صدیقہؓ اور زہرا بتولؓ کے نقوشِ قدم پر چلنے کی توفیق دے۔

حدیثِ نبویؐ

حضرت ابو سعید خُدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جو شخص تم سے کوئی برا کام دیکھے، اس کو ہاتھ سے روکے، اگر ایسا کرنے کی طاقت نہ ہو تو زبان سے منع کرے اگر اس کی بھی طاقت نہ ہو تو دل میں برا سمجھے اور یہ ضعیف تر ایمان ہے۔

(مشکوٰۃ شریف)

حدیثِ نبویؐ

حضرت معاذ بن جَبَل رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے جب اُن کو یمن کی طرف روانہ کیا تو نصیحت فرمائی کہ: معاذ! آرام طلبی اور خوش عیشی سے بچتے رہنا، اللہ کے خاص بندے آرام طلب اور خوش عیش نہیں ہوا کرتے۔ (مُسندِ احمد)

رِزقِ حلال کی برکتیں

اسلام میں رزقِ حلال کے حصول اور اللہ تعالیٰ کے احکام کے مطابق اس کے استعمال پر بڑا زور دیا گیا ہے۔ قرآنِ حکیم اور احادیثِ نبویؐ میں پاک چیزیں اور حلال رزق کھانے کی جابجا تلقین کی گئی ہے اور اس کو نہ صرف اطمینان وسکون اور برکتوں کا باعث بتایا گیا ہے بلکہ اللہ کی خوشنودی اور آخرت میں کامیابی کی کلید بھی قرار دیا گیا ہے۔ اس کے برعکس حرام مال کو سخت نحوست اور بدانجامی کا باعث بتایا گیا ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے:

طَلَبُ كَسْبِ الْحَلَالِ فَرِيْضَةٌ بَعْدَ الفَرِيْضَة

یعنی رزقِ حلال حاصل کرنے کی کوشش اور فکر فرض کے بعد فریضہ ہے۔ (شعب الایمان بیہقی)

اس حدیثِ پاک کا مطلب یہ ہے کہ اسلام کے اوّلین اور بنیادی ارکان و فرائض یعنی اللہ اور رسولؐ پر ایمان، نماز، زکوٰۃ وغیرہ کے بعد رزقِ حلال حاصل کرنے کی کوشش بھی ہم پر فرض ہے۔ جس طرح ظاہری نظافت، پاکیزہ لباس اور جسمانی طہارت سے حاصل ہوتی ہے اسی طرح قلبی آسودگی اور باطنی پاکیزگی رزقِ حلال کی بدولت نصیب ہوتی ہے۔ حلال رِزق وہی ہے جو جائز طریقے سے حاصل کیا گیا ہو خواہ زراعت سے حاصل ہو یا تجارت سے، ملازمت سے دستیاب ہو یا محنت مزدوری سے، احباب کے ہدیہ کی صورت میں ملے یا کسی اور جائز ذریعے سے میسّر آئے اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا بس شرط یہ ہے کہ کسبِ رزق کے لیے جو طریقہ بھی اختیار کیا جائے اس میں فریب مکر چوری جھوٹ اور دغا کی آمیزش نہ ہو کیونکہ ایسی آمیزش سے رزق حرام ہو جاتا ہے، اس کے استعمال سے قلب سیاہ ہو جاتا ہے اور عاقبت برباد ہو جاتی ہے۔ ایک شخص غریب ہے مگر ناجائز طریقے سے رزق حاصل کرنا اسے پسند نہیں

تو اسے ایک ایسی دولت حاصل ہو جاتی ہے جس کا بدل زر و جواہر کے بیسیوں انبار بھی نہیں ہو سکتے اس دولت کا نام ہے ''اطمینانِ قلب'' جو ناجائز ذرائع سے دولت کمانے والے کسی شخص کو کبھی حاصل نہیں ہو سکتی۔ مُسنَدِ احمد میں حضرت جابر بن عبداللہ انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ وہ گوشت اور وہ جسم جنّت میں نہ جا سکے گا جس کی نشوونما حرام مال سے ہوئی ہو۔ مُسنَدِ احمد ہی کی ایک اور روایت میں آنحضور ﷺ کا یہ ارشاد نقل کیا گیا ہے کہ ایسا نہیں ہوتا کہ کوئی بندہ حرام مال کمائے پھر اس میں سے لِلّٰہ صدقہ کرے تو اس کا صَدَقہ قبول ہو اور اس میں سے خرچ کرے تو اللہ کی طرف سے اس میں برکت ہو اور جو شخص حرام مال اپنے پیچھے چھوڑ کر جائے گا تو وہ اس کے لیے جہنّم کا توشہ ہو گا یقیناً اللہ تعالیٰ بدی کو بدی سے نہیں مٹاتا بلکہ بدی کو نیکی سے مٹاتا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ گندگی کو گندگی نہیں دھو سکتی، مطلب یہ کہ صَدَقہ و خیرات اور اہل و عیال پر خرچ اگر صحیح اور حلال رزق سے ہو تو وہ گناہوں کا کفّارہ اور مغفرت کا وسیلہ بن جاتا ہے لیکن حرام مال سے جو صَدَقہ کیا جائے وہ نجس اور ناپاک ہو گا اور بارگاہِ الٰہی میں ہرگز قبول نہ ہو گا۔ رزق کمانے کے لیے جو بھی طریقہ اختیار کیا جائے اس کی بنیاد سچائی اور ایمانداری پر رکھنا ضروری ہے۔

سچائی اور ایمانداری کے ساتھ کاروبار کرنے والے تاجر کا اسلام میں جو بلند مقام ہے اس کا اندازہ جامعِ ترمذی میں رسولِ اکرم ﷺ کے اس ارشادِ مبارک سے کیا جا سکتا ہے:

اَلتَّاجِرُ الصَّدُوْقُ الْاَمِیْنُ مَعَ النَّبِیِّیْنَ وَ الصِّدِّیْقِیْنَ وَ الشُّهَدَآءِ

یعنی پوری سچائی اور ایمانداری سے کاروبار کرنے والا تاجر آخرت میں نبیوں، صدیقوں اور شہیدوں کے ساتھ ہو گا۔

تحصیلِ رزق کے ذرائع میں حضور ﷺ نے سب سے اچھے دو ذریعے قرار دیے ہیں، ہاتھوں کی محنت (یعنی دستکاری، صنعت و حرفت، محنت مزدوری وغیرہ) اور تجارت۔

حضرت رافع بن خدیج رضی اللہ عنہٗ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا گیا کہ یا رسولَ اللہ کونسی کمائی زیادہ پاک اور اچھی ہے؟ آپؐ نے فرمایا کہ آدمی کا اپنے ہاتھ سے کوئی کام کرنا اور ہر تجارت جو پاکبازی کے ساتھ ہو۔

(مسندِ احمد)

حصولِ رزق کے لیے کسی قسم کی ملمع سازی، فریب کاری یا بد دیانتی سے آنحضور ﷺ کو اس قدر نفرت تھی کہ آپؐ ایسا کرنے والے سے مُطلق کوئی تعلق رکھنا پسند نہیں فرماتے تھے۔ ایک دن آپؐ بازار تشریف لے گئے۔ ایک دُکان کے سامنے گندم کا ڈھیر فروخت کے لیے پڑا تھا۔ حُضورؐ نے اپنا دستِ مبارک اُس ڈھیر کے اندر ڈالا تو نیچے کچھ تری محسوس ہوئی۔ آپؐ نے مُشت بھر دانے باہر نکالے تو دیکھا کہ وہ گیلے تھے۔ آپؐ نے دکاندار سے پوچھا، یہ کیا معاملہ ہے؟ اس نے عرض کیا، یا رسول اللہ! یہ دانے بارش میں بھیگ گئے تھے۔ آپؐ نے فرمایا، تو تم نے ان کو ڈھیر کے اوپر کیوں نہ رکھا تا کہ خریدنے والا ان کو دیکھ لے۔ ایک مسلمان کا یہ کام نہیں کہ وہ کسی کو دھوکا دے۔ مَنْ غَشَّنَا فَلَیْسَ مِنَّا یعنی جو کسی کو دھوکا دے وہ ہم میں سے نہیں ہے۔ ایک اور حدیث میں آپؐ نے فرمایا ہے کہ جس نے کوئی عیب دار چیز فروخت کی اور خریدار سے اس کا عیب چھپایا، اس پر ہمیشہ اللہ کا غضب رہے گا۔ حرام کی کمائی سے نہ صرف عاقبت برباد ہو جاتی ہے بلکہ دنیا بھی تباہ ہو جاتی ہے۔ حرام مال سے پلنے والی اولاد انسان کے لیے وبال بن جاتی ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ارشادِ نبوی کے مطابق حرام کمانے والے کی دعا قبول نہیں ہوتی خواہ وہ کعبے کا پردہ پکڑ کر کرے گویا وہ اللہ تعالیٰ کی رحمت اور کرم سے محروم ہو جاتا ہے۔ اس کے برعکس رزقِ حلال کمانے والے پر اللہ کی رحمتیں بارش کی طرح برستی ہیں۔ اس کے کاروبار اور مال میں برکتیں ہوتی ہیں۔ اس کو اطمینانِ قلب کی نعمتِ عظمیٰ حاصل ہوتی ہے اس کی دعاؤں کو حق تعالیٰ شرفِ قبولیت بخشتا ہے، دنیا میں بھی اس کو عزّت عطا کرتا ہے اور آخرت میں بھی اس کے لیے جنّت کا وعدہ ہے۔

جس طرح رزقِ حلال کا حاصل کرنا ہم پر فرض ہے اسی طرح اولاد کی عمدہ طریقے سے پرورش اور تربیت کرنا بھی ہمارے فرائض میں داخل ہے۔ رزقِ حلال اور اولاد کی پرورش و تربیت کا آپس میں گہرا تعلق ہے کیونکہ، انسان جو کچھ کماتا ہے وہ بنیادی طور پر اپنی اور اپنے اہل و عیال ہی کی پرورش کے لیے کماتا ہے۔ اگر وہ رزقِ حلال سے اپنی اولاد کی پرورش کرتا ہے تو اسے اتنا ہی ثواب ہوگا جتنا اللہ کی راہ میں صَدَقہ و خیرات دینے سے ہوتا ہے۔ حُضُور ﷺ کا ارشاد ہے کہ تم اپنی بیوی کے منہ میں جو لُقمہ ڈالتے ہو اللہ تعالیٰ اس کا ثواب صَدَقہ کے برابر دے گا۔ اس حدیث کا اِطلاق اولاد پر بھی ہوتا ہے کہ بیوی کی طرح اس کی پرورش بھی ہمارے ذمہ ہے اس کے برعکس اگر اولاد کی پرورش حرام مال سے کی جائے تو وہ انسان کے لیے وبال بن جاتی ہے اور اولاد پر اس کے بہت برے اَثرات مُرتّب ہوتے ہیں۔ قرآنِ پاک میں مال اور اولاد کو انسان کے لیے آزمائش قرار دیا گیا ہے۔ سورۃ الاَنفَال میں ارشاد ہوا ہے:

اَنَّمَآ اَمْوَالُکُمْ وَ اَوْلَادُکُمْ فِتْنَةٌ (آیة ۲۸)
یعنی جان رکھو کہ تمہارا مال اور تمہاری اولاد بڑی آزمائش ہے

سورۂ تغابُن میں فرمایا گیا ہے:

اِنَّ مِنْ اَزْوَاجِکُمْ وَ اَوْلَادِکُمْ عَدُوًّ الَّکُمْ فَا حْذَرُوْهُمْ (آیة ۱۴)
یعنی تمہاری بیویوں اور اولاد میں سے بعض تمہارے دشمن ہیں ان سے ہوشیار رہو۔

اس فتنے سے بچنے اور آزمائش میں پورا اُترنے کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ اولاد کی خاطر حرام اور ناجائز ذرائع سے مال نہ کمایا جائے۔ حرام مال کمانے والا نہ اپنا خیر خواہ ہے اور نہ اپنی اولاد کا۔ اس کی اپنی عاقبت تو یقیناً برباد ہوگی اولاد کے حق میں اس کی کوئی دعا بھی قبول نہ ہوگی۔ اولاد کی حقیقی خیر خواہی یہ ہے کہ اس کی پرورش رِزقِ حلال سے کی جائے اور ساتھ ہی اس کی عمدہ تربیت میں بھی کوئی کسر اٹھا نہ رکھی جائے حلال کی کمائی سے بچوں کی پرورش اور تربیت میں یقیناً برکت ہوگی۔ سُنَن ابنِ ماجہ میں

حضرت اَنس رضی اللہ عنہُ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، اپنی اولاد کا اکرام کرو اور اچھی تربیت کے ذریعے اُن کو حُسنِ ادب سے آراستہ کرو۔

حضورؐ کے اس ارشاد پر غور کریں تو ہمارا ضمیر گواہی دے گا کہ اولاد کا اکرام حقیقی معنوں میں اسی طرح ہوسکتا ہے کہ ان کی پرورش حلال کی کمائی سے کی جائے۔ اس بات پر ہمارا پختہ ایمان ہونا چاہیے کہ کسبِ حلال ہمارے اپنے لیے بھی اور ہماری اولاد کے لیے بھی دنیا اور آخرت میں بھلائی کا موجب ہوگا۔ دعا ہے اللہ تعالیٰ ہم سب کو ہمیشہ رزقِ حلال کمانے کی توفیق دے۔ (آمین)

جس سے مشورہ کیا جائے وہ امِین ہے

باہمی مُشاوَرَت کو اسلام میں اس قدر اہمیّت حاصل ہے کہ قرآنِ حکیم کی ایک سورہ کا نام ہی الشُّوریٰ یعنی مشورہ یا صلاح ہے۔ اگر کسی شخص کو انفرادی طور پر کوئی ایسا پیچیدہ اور مشکل معاملہ پیش آجائے جس سے عہدہ برآ ہونے کی کوئی صورت نظر نہ آئے تو اِس کے لیے مُناسِب اور بہتر یہی ہے کہ اپنے کسی خیر خواہ سے مشورہ کر لے۔ انفرادی معاملات میں مُشاوَرَت کو بہتر اور مناسب ہی کہا جاسکتا ہے۔ البتہ اجتماعی معاملات میں تو مُشاوَرَت کو نہ صرف اسلامی طرزِ زندگی کا ایک اہم سُتُون قرار دیا گیا ہے بلکہ اسے اہلِ ایمان کی بہترین صِفات میں شمار کیا گیا ہے جیسا کہ سورۃ الشُّوریٰ کی آیات ۳۶ تا ۳۸ میں ارشاد ہوا ہے:

> ‘‘جو کچھ اللہ کے ہاں ہے وہ بہتر بھی ہے اور پائیدار بھی، وہ
> ان لوگوں کے لیے ہے جو ایمان لائے ہیں اور اپنے رب پر
> بھروسا کرتے ہیں جو بڑے بڑے گناہوں اور بے حیائی
> کے کاموں سے پرہیز کرتے ہیں اور اگر غصہ آجائے تو درگزر
> کرجاتے ہیں، جو اپنے رب کا حکم مانتے ہیں اپنے معاملات
> آپس کے مشورے سے چلاتے ہیں ہم نے جو کچھ انہیں دیا ہے
> اُس میں سے خرچ کرتے ہیں۔’’

سورۂ آلِ عمران میں رسولِ اکرم ﷺ کو حُکم دیا گیا ہے شَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ ‘‘یعنی اے نبی! دین کے کاموں میں ان لوگوں (یعنی اپنے اصحاب) کو بھی شریکِ مشورہ رکھا کریں۔ یعنی اِجتماعی معاملات میں مشورہ سے کام چلانا ایک دینی حکم ہے یہی شُورائیت، جمہوریت کی روح ہے۔ اس کے بغیر اجتماعی کام چلانا اللہ کے واضح احکام کی صریح خلاف ورزی ہے اور اس سے کسی اچھے نتیجے کی توقع رکھنا

عاقبت اندیشی سے بعید ہے۔ اب رہی یہ بات کہ جس سے مشورہ کیا جائے اس پر کیا فرض عائد ہوتا ہے تو اللہ کے رسولِ معظم ﷺ نے یہ بات ہمیشہ کے لیے طے کردی ہے۔ آپؐ نے ارشاد فرمایا ہے کہ جس شخص سے مشورہ کیا جائے وہ اس بات کا ذمہ دار اور امین ہے کہ صحیح مشورہ دے اور خائن ہے وہ شخص جس نے اپنے مشورہ طلب کرنے والے کو غلَط مشورہ دیا۔ گویا دانائے کونین ﷺ نے مشورہ کو امانت اور جس سے مشورہ طلب کیا گیا اس کو امین قرار دیا ہے۔ "امین" اس معنی میں کہ اُس پر بھروسا کر کے اس سے مشورہ طلب کیا گیا ہے اس لئے اس کے لیے صحیح مشورہ دینا اسی طرح ضروری ہے جس طرح مال و متاع کے امین کے لیے مال و متاع کی امانت پوری دیانت کے ساتھ بجنسہٖ واپس کرنا۔ سورۂ بقرہ میں امانت اور امین کے بارے میں ارشاد ہوا ہے:۔

فَاِنْ اَمِنَ بَعْضُکُمْ بَعْضًا فَلْیُؤَدِّ الَّذِی اؤْتُمِنَ اَمَانَتَہٗ وَلْیَتَّقِ اللّٰہَ رَبَّہٗ
(آیۃ ۲۸۳)

"یعنی اگر تم میں سے کوئی شخص دوسرے پر بھروسا کر کے اس کے ساتھ کوئی معاملہ
کرے تو جس پر بھروسا کیا گیا ہے اسے چاہیے کہ امانت ادا کرے اور اللہ سے
ڈرے جو اُس کا ربّ ہے۔"

علماءِ اسلام کے نزدیک وہ غلَط مشورہ امانت میں خیانت سمجھا جائے گا جو جان بوجھ کر غلط جانتے ہوئے بھی دیا گیا ہو۔ ایسے غلط مشورے کو امانت میں خیانت نہیں سمجھا جائے گا جو نیک نیّتی کے ساتھ صحیح سمجھ کر دیا گیا ہو لیکن اندازے کی غلطی، معلومات کی کمی یا کسی اور وجہ سے غلَط ثابت ہوا ہو۔

امانت داری کا حق ادا کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ کا حکم یہ ہے:

وَلَا تَقْفُ مَا لَیْسَ لَکَ بِہٖ عِلْمٌ ط اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ کُلُّ
اُولٰٓئِکَ کَانَ عَنْہُ مَسْئُوْلًا ۝ (بنی اسرائیل آیۃ:۳۶)

"یعنی کسی ایسی چیز کے پیچھے نہ لگ جایا کرو جس کا تمہیں علم نہ ہو یقیناً آنکھ، کان
اور دل سب ہی کی بازپُرس ہونی ہے۔"

مُفسّرین نے اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ محض گمان، قیاس یا ظن و تخمین کی بناء پر کوئی رائے نہیں دینی چاہیے بلکہ اُس چیز کے بارے میں پوری معلومات حاصل کرنے کے لیے واقف کار لوگوں سے مشورہ کرنا چاہیے تاکہ مشورہ طلب معاملہ کے تمام پہلو سامنے آجائیں لیکن یہ مشورہ **اِثم یا عُدوان** "یعنی گناہ یا زیادتی" کے لیے نہیں ہونا چاہیے بلکہ نیکی بھلائی اور تقوٰی (یعنی پرہیزگاری یا احکامِ الٰہی کے مطابق زندگی گزارنے) کے لیے ہونا چاہیے جیسا کہ سورۂ مُجادلہ میں فرمایا گیا ہے:

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا تَنَاجَیْتُمْ فَلَا تَتَنَاجَوْا بِالْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ
وَمَعْصِیَتِ الرَّسُوْلِ وَتَنَاجَوْا بِالْبِرِّ وَتَّقْوٰی ط (آیۃ:۹)

"یعنی اے لوگو! جو ایمان لائے ہو جب تم آپس میں پوشیدہ بات کرو تو گناہ اور زیادتی اور رسولؐ کی نافرمانی کی باتیں نہیں بلکہ نیکی اور تقوٰی کی باتیں کرو۔"

شاید بعض لوگوں کے ذہنوں میں یہ خیال پیدا ہو کہ مشورہ تو مشورہ ہوتا ہے اسے امانت کا درجہ کیسے حاصل ہو گیا۔ ان اصحاب کو معلوم ہونا چاہیے۔۔۔۔ کہ امانت ایک وسیع المفہوم لفظ ہے اور قرآنِ حکیم کی چھ آیتوں میں مختلف مواقع پر استعمال ہوا ہے۔ یہ آیتیں سورۂ بقرہ، سورۂ نساء، سورۂ انفال، سورۂ مومنون اور سورۂ معارج میں دیکھی جا سکتی ہیں۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ امانت نہ صرف روپے پیسے یا کسی خاص مادّی شے کی نہیں ہوتی بلکہ اللہ اور اللہ کے رسولؐ کے احکام بھی ایک مسلمان کے لیے امانت کی حیثیت رکھتے ہیں اور ان کی خلاف ورزی کرنا امانت میں خیانت کرنے کے مترادف ہے۔ اسی طرح اگر کوئی شخص آپ پر بھروسا کر کے رازداری کے ساتھ کسی معاملے میں مشورہ طلب کرتا ہے تو یہ بھی امانت ہے اس کو دوسروں کے سامنے فاش کرنا امانت میں خیانت کے مترادف ہے ہاں یہ ضرور دیکھ لینا چاہیے کہ اس میں کوئی جُرم یا گناہ کی بات نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ نے

لَقَدْ کَانَ لَکُمْ فِیْ رَسُوْلِ اللّٰہِ اُسْوَۃٌ حَسَنَۃٌ

فرما کر آنحضور ﷺ کی ذاتِ اطہر کو اُمّت کے لیے نمونہ بنایا ہے۔ آپؐ

کی حیاتِ اطہر پر ایک نظر ڈالیں تو معلوم ہوگا کہ آپؐ اجتماعی معاملے میں فیصلہ کرنے کا اختیارِ مطلق رکھنے کے باوجود صحابۂ کرامؓ سے مشورہ کرنے کے بعد اپنا فیصلہ صادر فرماتے تھے۔ خُلَفائے راشدینؓ کا بھی یہی طرزِ عمل رہا اور آج بھی اسی طرزِ عمل کو اپنانے کی ضرورت ہے کیونکہ انہی مقدس ہستیوں کا اِتّباع ہماری فلاح اور نجاتِ اُخروی کا ضامن ہے۔

☆ ☆

۱۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہٗ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جب تم میں سے کوئی شخص اپنے بھائی سے مشورہ طلب کرے تو اسے چاہیے کہ اسے نیک مشورہ دے۔

(ابنِ ماجہ باب المستشار موتمن)

۲۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہٗ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اگر کوئی شخص تجھ سے مشورہ لے تو اُس کو نیک مشورہ دے اگر تو نے ایسا نہ کیا تو امانت میں خیانت کی۔

(مُسندِ امام اعظم کتاب الادب)

قناعت

(ایک لازوال خزانہ ہے)

قناعت کے معنی ہیں کہ انسان اشیائے خورونوش میں صرف اشیائے ضروریہ پر اکتفا کرے اور مال جمع کرنے کی ہوس میں مبتلا نہ ہو، دوسرے لفظوں میں اللہ تعالیٰ نے اس کو جو کچھ دے رکھا ہے اس پر راضی رہے، اپنے خالق کی دی ہوئی نعمتوں کا شکر ادا کرتا رہے۔ اپنے دل سے لالچ اور حسد کو نکال دے۔ دوسروں کے زیادہ مال سامان اور جائداد وغیرہ کو دیکھ کر ہرگز نہ کڑھے ہاں اگر اپنی محنت اور جائز طریقے سے زیادہ مال یا دوسرا سامانِ راحت ملتا ہے تو اس کو اللہ تعالیٰ کا انعام سمجھے اور حقوق اللہ کے ساتھ حقوق العباد کے ادا کرنے میں کبھی غفلت نہ کرے۔ قناعت کی نسبت ایک حدیث میں آیا ہے:

"اَلْقَنَاعَةُ کَنْزٌ لَا یَفْنٰی" یعنی قناعت ایک خزانہ ہے جو کبھی فنا نہیں ہوتا ہے۔

فی الحقیقت قناعت اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ بہت بڑی نعمت ہے۔ بعض کے نزدیک اللہ تعالیٰ نے انسان کو جو نعمتیں دے رکھی ہے قناعت ان میں سب سے بڑی نعمت ہے اور اگر اسے سب سے بڑی نعمت کے بجائے عام نعمت ہی سمجھا جائے تو بھی اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ انسان کو قناعت سے بڑھ کر کوئی چیز سکون اور اطمینان مہیا نہیں کرسکتی۔ قناعت نہ کرنے والے لوگ ہمیشہ اس فکر میں مبتلا رہتے ہیں کہ ان کو زیادہ سے زیادہ دولت مل جائے، زیادہ سے زیادہ سہولتیں اور آرام میسّر ہو۔ اس کے لیے وہ ہر جائز اور ناجائز طریقہ استعمال کرتے ہیں۔ یہ لوگ سکون کی نعمت سے محروم ہوجاتے ہیں اور اللہ تعالیٰ نے ان کو جو نعمتیں عطا کر رکھی ہیں، ہوسِ مال ان کو ان نعمتوں کو شکر ادا کرنے کا فرض بھی ادا نہیں کرنے دیتی۔ وہ ہمیشہ پریشان رہتے ہیں۔ ان کے پاس خواہ کتنی ہی دولت جمع ہوجائے دنیا کے مال اسباب کے کتنے ہی

ڈھیر لگ جائیں، ان کو سکون اور اطمینان نصیب نہیں ہوتا بلکہ ان کی حرص اور پریشانی میں اضافہ ہی ہوتا جاتا ہے۔ شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ نے کیا خوب کہا ہے:

گفت چشمِ تنگ دنیا دوست را
یا قناعت پُر کند یا خاکِ گور

یعنی دنیا کو دوست رکھنے والے آدمی کی تنگ آنکھ یا تو قناعت بھرتی ہے یا پھر قبر کی مٹی۔ تشریح اس قول کی یہ ہے کہ ایک دنیا دار انسان کو قناعت اختیار کر کے ہی سکون و اطمینان میسّر آ سکتا ہے ورنہ وہ مرتے دم تک حرص (ناآسودگی اور پریشانی) کی آگ میں جلتا رہے گا۔

اگر ہم اپنے معاشرے میں پھیلی ہوئی برائیوں پر نظر ڈالیں تو معلوم ہوگا کہ ہماری بیشتر خرابیوں کا سبب مال و دولت کی محبت ہے۔ اس محبت میں مبتلا دنیا پرست لوگوں پر رات دن یہی دُھن سوار رہتی ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ مال و دولت، دنیوی فوائد و لذّات اور جاہ و اقتدار حاصل کر لیں۔ اس دُھن میں نہ ان کو حقوق اللہ کا خیال رہتا ہے نہ حُقوق العباد کا یہاں تک کہ موت اُن کے دروازے پر آ دستک دیتی ہے اور وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر اپنی ''محبوب'' دنیا سے کوچ کر جاتے ہیں۔ قرآنِ حکیم کی سورۂ تکاثُر میں ایسے لوگوں کو اس طرح مخاطب کیا گیا ہے:۔

> ترجمہ ''تم لوگوں کو زیادہ سے زیادہ ایک دوسرے سے بڑھ کر دنیا حاصل کرنے کی دُھن نے غفلت میں ڈال رکھا ہے یہاں تک کہ (اسی فکر میں) تم لبِ گور تک پہنچ جاتے ہو۔ ہرگز نہیں عنقریب تم کو معلوم ہو جائے گا پھر (سن لو) ہرگز نہیں، عنقریب تم کو معلوم ہو جائے گا، ہرگز نہیں اگر تم یقینی علم کی حیثیت سے (اس روش کے انجام کو) جانتے ہوتے (تو تمہارا یہ طرزِ عمل نہ ہوتا تم دوزخ کو دیکھ کر رہو گے، پھر (سن لو کہ) تم یقین کے ساتھ اس کو دیکھ لو گے۔ پھر ضرور تم سے ان نعمتوں کے بارے میں جواب طلبی ہوگی''۔

مفسّرین نے اس سورۂ مبارکہ کے فوائد (تفسیری نِکات) بیان کرتے

ہوئے لکھا ہے کہ اس میں اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو اس دُنیا پرستی (قناعت نہ کرنے بلکہ کفرانِ نعمت) کے بُرے انجام سے خبردار کیا گیا ہے جو ان کو نہ اپنے خالق و مالک کا دھیان آنے دیتی ہے اور نہ آخرت کی فکر کرنے دیتی ہے، ان کو مال و دولت اور دنیا کے ساز و سامان کی حرص غفلت میں پھنسائے رکھتی ہے، حرص و ہوا ان کو ہر وقت اس فکر میں مبتلا رکھتی ہے کہ جس طرح بَن پڑے ہمارے پاس مال و دولت کی بہتات ہو اور ہمارا کنبہ اور جتھا دوسرے سب کنبوں اور جتھوں پر غالب ہو۔ یہ پردہ غفلت کا نہیں اٹھتا یہاں تک کہ موت آجاتی ہے تب قبر میں پہنچ کر پتا چلتا ہے کہ سخت غفلت اور بھول میں پڑے ہوئے تھے وہ تو محض چند روز کی چہل پہل تھی موت کے بعد وہ تمام مال و دولت اور ساز و سامان ہیچ بلکہ وبالِ جان ثابت ہوئے۔ اس سورۃ میں لوگوں کو بار بار متنبہ کیا گیا ہے کہ تمہارا یہ خیال صحیح نہیں ہے کہ مال جائداد اور دنیوی ساز و سامان وغیرہ میں دوسروں سے بڑھ جانا ہی کامیابی ہے اور یہی کام آنے والی چیزیں ہیں، عنقریب تم کو معلوم ہو جائے گا کہ تم ساری عمر کتنی بڑی غلطی میں مبتلا رہے اگر تم یقینی طور پر اس بات کو جان لیتے کہ آخرت کے مقابلے میں دنیا کے سب سامان ہیچ ہیں تو ہرگز اس غفلت میں نہ پڑے رہتے۔ اس غفلت اور کفرانِ نعمت کا نتیجہ دوزخ ہے وہ تم کو یقیناً دیکھنا پڑے گا۔ یومِ حساب کو تم سے ضرور پوچھا جائے گا کہ جو نعمتیں (ظاہری و باطنی، جسمانی و روحانی) دنیا میں تمہیں عطا کی گئی تھیں ان کا حق تم نے کیا ادا کیا اور منعمِ حقیقی کو راضی کرنے کی کہاں تک سعی کی۔

جس دنیا پرستی کی اس قدر مذمّت کی گئی ہے اس کا علاج قناعت اور صرف قناعت ہے۔ یہ ایک ایسی اخلاقی اور روحانی صفت ہے جو حرص اور حسد جیسی مہلک روحانی بیماریوں سے محفوظ رکھتی ہے۔ قانع (قناعت کرنے والا) ہر حال میں اللہ کی رضا پر راضی رہتا ہے جو کچھ اس کو میسّر ہے وہ اسی پر صابر و شاکر رہتا اور دوسروں کو اللہ تعالیٰ نے جو کچھ دیا ہے وہ ان کے پاس سے اللہ کی عطا کردہ نعمتیں زائل ہونے کی تمنا نہیں کرتا اور نہ اپنے سے آسودہ حال کی لوگوں سے حسد کرتا ہے۔ قناعت کی ایک

اور خوبی یہ ہے کہ یہ قانع آدمی کو گدائی یا دوسروں کے سامنے ہاتھ پھیلانے کی ذلت سے بھی محفوظ رکھتی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ انسانی زندگی میں بعض اوقات ایسی ناگزیر صورتیں یا ضرورتیں پیش آجاتی ہیں جب ایک انسان کو دوسرے انسان کا دست نگر ہونا پڑتا ہے لیکن خودداری اور حمیت کا تقاضا یہ ہے کہ انسان جہاں تک بن پڑے دوسروں کے سامنے ہاتھ پھیلانے سے گریز کرے۔ رسول اللہ ﷺ اس بات کو سخت ناپسند کرتے تھے کہ کوئی شخص بغیر شدید ضرورت کے دوسرے کے سامنے دستِ سوال دراز کرے آپؐ صرف تین قسم کے آدمیوں کے لیے دوسروں کے سامنے ہاتھ پھیلانا جائز سمجھتے تھے ایک وہ جو قرض کے بوجھ تلے دب گیا ہو دوسرا وہ جس پر کوئی ناگہانی مصیبت آجائے اور اس کا مال واسباب برباد ہو جائے تیسرا وہ جو فاقہ میں مبتلا ہو اور محلے کے تین آدمی شہادت دیں کہ وہ فی الواقع فاقہ سے ہے۔ ان کے علاوہ جو کوئی مانگ کر حاصل کرتا ہے وہ حرام کھاتا ہے۔

قناعت کا یہ مفہوم قطعاً نہیں ہے کہ آدمی ہاتھ پاؤں توڑ کر بیٹھ جائے رزقِ حلال کے حصول کے لیے محنت اور سعی وکوشش کرنا بالکل جائز ہے اپنی حلال کی آمدنی میں جائز طریقے سے اضافہ کرنا قناعت کے منافی نہیں۔ دیکھنے میں آیا ہے کہ بعض لوگوں کے پاس کثیر دولت، عالیشان مکان، آرام دِہ سواری، عمدہ لباس اور دوسری تمام آسائشیں موجود ہیں اس کے باوجود وہ غیر مطمئن اور پریشان رہتے ہیں۔ اس کے برعکس جس شخص کا دل لالچ، حرص، طمع اور حسد سے خالی ہے اور وہ ہر حال میں صبر اور شکر کرتا ہے، اُس کو روحانی سکون اور اطمینان حاصل ہوتا ہے اس کا اندازہ وہی شخص کر سکتا ہے جس کو قناعت کی نعمت میسّر ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو قناعت کی نعمت عطا فرمائے۔

اسلام کا عائلی نظام

خاوند اور بیوی کے علاوہ دیگر رشتہ داروں کی اہمیّت

اسلام دینِ فطرت ہے اور اُس نے بنی نوعِ انسان کو ایک ایسا ضابطۂ حیات دیا ہے جو انسانی زندگی کے ہر شعبہ اور ہر پہلو کا نہایت مُتوازِن انداز میں احاطہ کرتا ہے اور ایک ایسے معاشرے کی تشکیل کی طرف رہنمائی کرتا ہے جو باہمی اصلاح، اُلفت ویگانگت، مساوات، عدل و انصاف اور امن و سکون کا گہوارہ ہو۔ اسلام کو ماننے والے ہر فرد کا اس بات پر کامل ایمان ہے کہ قرآنِ حکیم میں اسلامی ضابطۂ حیات کے خدوخال اور بنیادی اُصول واضح طور پر بیان کر دیے گئے ہیں۔ خاتَم الانبیاء والمرسلین ﷺ نے ان پر عمل کر کے اپنے اُسوۂ حَسنہ کا جو نمونہ اہلِ ایمان کا سامنے پیش کیا، دنیا اور آخرت میں کامیابی کا انحصار اسی پر عمل کرنے میں ہے۔

آنحضور ﷺ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو ہدایت، پیغام یا تعلیم لے کر مبعوث ہوئے اس کے بنیادی طور پر دو حصّے ہیں، ایک کا تعلّق حُقوق اللہ سے ہے، ان حُقوق میں ایمان، توحیدِ خالص، ذکر و شکر اور ہر قسم کی عبادات شامل ہیں۔ دوسرے کا تعلّق حُقوق العِباد سے ہے۔ ان حُقوق کی دو قسمیں ہیں۔ ایک کا تعلّق معاشرتی احکام و آداب سے ہے مثلاً شوہر کا بیوی سے، بیوی کا شوہر سے، والِدین کا اولاد سے، اولاد کا والِدین سے، قریبی اور دُور کے رشتہ داروں کے ساتھ، ہمسایوں کے ساتھ، زیردستوں کے ساتھ اور عام مخلوق کے ساتھ کیسا برتاؤ اور رَوِیّہ ہونا چاہیے اور ان کے ایک دوسرے پر کیا حقوق ہیں۔

دوسری قسم کے حُقوق العِباد کا تعلّق معاملات سے ہے یعنی تجارت، زراعت، قرض و امانت، خرید و فروخت، ہبہ، وصیّت، مالی لین دین، وغیرہ۔ اس وقت ہماری گفتگو کا موضوع حُقوق العِباد کی پہلی قِسم سے ہے اس کا جامع عنوان

"معاشرت" ہے۔ جس کا ایک نہایت اہم پہلو اسلام کا عائلی نظام ہے۔ عام طور پر عائلی سے مراد شادی بیاہ نکاح طلاق وغیرہ جیسے اُمور لیے جاتے ہیں لیکن فی الحقیقت اس کا مفہوم بہت وسیع ہے۔ اس نظام میں میاں بیوی کے باہمی تعلق کے علاوہ خاندان کے نزدیک اور دور کے دوسرے رشتہ داروں کو بھی خاص اہمیت حاصل ہے۔ اس میں خاوند یا بیوی کے رشتے داروں کی قطعاً کوئی تخصیص نہیں۔ میاں بیوی دونوں کے لیے لازم ہے کہ ایک دوسرے کے رشتہ داروں کے ساتھ ان کا معاملہ حسنِ سلوک کا ہو۔ گویا اسلام کے عائلی نظام کا اِطلاق صرف دو افراد کی ازدواجی زندگی ہی پر نہیں بلکہ پورے خاندان پر ہوتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اس نظام میں میاں بیوی کے درمیان باہمی اعتماد اور خوشگوار تعلقات کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ قرآنِ حکیم میں جہاں عورتوں کو شوہروں کی فرمانبرداری کا حُکم دیا گیا ہے وہاں مردوں کو بھی خاص طور پر حُکم دیا گیا ہے وَعَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ یعنی عورتوں کے ساتھ حُسنِ سلوک یا بھلے طریقے کی زندگی بسر کرو۔ صحیح مسلم میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہٗ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ کوئی ایمان والا شوہر اپنی مومنہ بیوی سے نفرت نہیں کرتا، اگر اس کی کوئی عادت ناپسندیدہ ہوگی تو دوسری کوئی عادت پسندیدہ بھی ہوگی۔ اسی طرح جامع ترمذی میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ مسلمانوں میں وہ شخص کامل الایمان ہے جس کا اخلاقی برتاؤ سب کے ساتھ بہت اچھا ہو اور بالخصوص جس کا سلوک بیوی کے ساتھ لُطف و محبّت کا ہو۔

اب رہے میاں بیوی کے دوسرے رشتے دار تو اِن میں دونوں کے والدین، اولاد، بہن بھائی اور دیگر تمام اہلِ قرابت شامل ہیں۔ اللہ اور اللہ کے رسولؐ نے ان کے ساتھ بھی حُسنِ سلوک اور اُن کے حقوقِ قرابت ادا کرنے کا حُکم دیا ہے۔

قرآنِ حکیم میں ارشاد ہوا ہے

وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْئًا وَّ بِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّ بِذِي الْقُرْبٰى (النِّسَاء: ۳۶)

یعنی اللہ کی عبادت کرو اور کسی شے کو اس کا شریک نہ ٹھہراؤ اور ماں باپ اور قرابت داروں سے نیکی کرتے رہو۔

اہلِ قرابت کے ساتھ حُسنِ سلوک کا نام صلۂ رَحمی ہے جو اسلامی تعلیمات کا خاص عنوان ہے اور جس پر بہت زور دیا گیا ہے۔ سُنَنِ ابی داؤد میں حضرت عبدالرّحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہُ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا، آپؐ فرماتے تھے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کا ارشاد ہے کہ میں اللہ ہوں میں الرّحمٰن ہوں، میں نے رشتۂ قرابت کو پیدا کیا ہے اور اپنے نام رحمان کے مادّہ سے نکال کر اس کو رحم کا نام دیا ہے۔ پس جو اِسے جوڑے گا میں اُس کو جوڑوں گا اور جو اس کو توڑے گا میں اس کو توڑوں گا۔

شارحینِ حدیث نے اس حدیث کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت اور مشیّت سے انسان کی پیدائش کا ایسا نظام بنایا ہے کہ ہر پیدا ہونے والا انسان رشتوں کے بندھنوں میں بندھا ہوتا ہے۔ ان رشتوں کے کچھ فطری تقاضے اور حقُوق ہیں۔ جو بندہ ان حقوق کو پورا کرے گا، اللہ تعالیٰ اس کو اپنا بنا لے گا اور اس پر اپنی برکتیں اور رحمتیں نازل کرے گا۔ اس کے برعکس جو اِن حُقوق کو پامال کرے گا یعنی قطعِ رحمی کرے گا اللہ تعالیٰ اس کو اپنی رحمت اور فضل سے محروم کردے گا۔ صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں حضرت اَنَس بن مالک رضی اللہ عنہُ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ جو شخص یہ چاہتا ہے کہ اس کی روزی میں فراخی اور کُشادگی ہو اور اس کی عمر میں زیادتی ہو تو اس کو چاہیے کہ اپنے رشتہ داروں کے ساتھ صلۂ رَحمی کرے گویا اسلام کے عائلی نظام میں رشتے داروں کو اِس قدر اہمیّت حاصل ہے کہ ان سے حُسنِ سلُوک کو رزق اور عُمر میں برکت کا مُوجب قرار دیا گیا ہے۔ اس حسنِ سلوک کی مختلف صورتیں ہو سکتی ہیں مثلاً ان میں سے جو غریب اور حاجتمند ہوں، ان کی مالی مدد کرنا، اپنے وقت اور زندگی کا کچھ حصہ ان کے کاموں میں لگانا، جو بوڑھے، کمزور یا

معذور ہوں، ان کی خدمت کرنا وغیرہ۔ اسبابی نقطۂ نگاہ سے یہ عام مُشاہَدہ اور تجربہ ہے کہ خاندانی جھگڑے اور تنازعے بالعموم حُقوقِ قرابت کا پاس نہ رکھنے کی بناء پر پیدا ہوتے ہیں اور یہ آدمی کے لیے ذہنی پریشانی، اندرونی کُڑھن اور گھٹن کا باعث بنتے ہیں۔ ایسے تفکّرات لامحالہ صحت اور روزمرّہ کے معمولات کو مُتاثر کرتے ہیں لیکن جو لوگ رشتے اداروں کو مناسب اہمیت دیتے ہیں اور ان سے نیکی اور صلۂ رَحمی کا برتاؤ کرتے ہیں، اُن کی زندگی روحانی آسودگی، طمانیت اور خوش دلی کے ساتھ گزرتی ہے اور ہر لحاظ سے اُن کے حالات بہتر رہتے ہیں۔ پھر اہلِ قرابت کی مدد کرنے میں دوہرا ثواب ہے جیسا کہ جامعِ ترمذی کی ایک حدیث میں رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد نقل ہوا ہے کہ مساکین کو صَدَقہ دینا ایک صَدَقہ ہے اور اہلِ قرابت کو دینے میں دوہرا ثواب ہے ایک صَدَقہ کا اور دوسرا صلہ رَحمی کا۔

احادیث میں تو یہاں تک آیا ہے کہ اگر رشتے دار بدسلوکی اور حَسَد بھی کرتے ہوں تو بھی ان سے بُردباری، درگزر اور حُسنِ سلوک ہی کا معاملہ کرنا چاہیے یہ طرزِ عمل نہ صرف اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کا باعث ہوگا بلکہ نیکی کرنے والوں کو بدسلوکی اور حَسَد کرنے والوں پر غالب رکھے گا۔ اس کے برعکس رشتے داروں سے بے اعتنائی برتنا اور اپنے مفادات کا اسیر رہنا اسلام کے عائلی نظام کی روح سے روگردانی کے مترادف ہے۔ دعا ہے اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنے قرابت داروں سے حُسنِ سلوک کی توفیق عطا فرمائے؛ آمین ثم آمین۔

اسلام کا نظامِ معیشت

تاریخِ عالم پر ایک نظر ڈالیں تو معلوم ہوگا کہ ابتدائے آفرینش سے آج تک روئے زمین پر بیسیوں انقلاب برپا ہوئے جن کے نتیجے میں بعض قومیں صفحۂ ہستی سے مٹ گئیں، بعض قعرِ مذلّت سے نکل کر اوجِ ثریا تک جا پہنچیں، بعض غلامی کی زنجیریں توڑ کر آزادی کی نعمت سے بہرہ ور ہوگئیں اور بعض آزادی کی نعمت سے محروم ہو کر ادبار ونکبت کا شکار ہوگئیں۔ برپا ہونے والے بڑے بڑے انقلابات کا تقابلی مطالعہ کرنے سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ بعض انقلاب محض سیاسی تھے، بعض محض اقتصادی، بعض محض ثقافتی اور بعض محض تعزیری وعلیٰ ہذا القیاس، مگر آج سے چودہ سو سال پہلے جو انقلاب سرورِ کائنات فخرِ موجودات جناب محمد مصطفیٰ ﷺ نے برپا فرمایا، اس سے زیادہ جامع، ہمہ گیر اور بھرپور انقلاب اس روئے زمین پر آج تک برپا نہیں ہوا۔ یہ انقلاب اخلاقی بھی تھا اور معاشرتی بھی، مادّی بھی تھا اور روحانی بھی، سیاسی بھی تھا اور اقتصادی بھی، طبیعیاتی (Physical) بھی تھا اور مابعد طبیعیاتی (Meta Physical) بھی۔ غرض یہ انقلاب زندگی کے ہر شعبے پر محیط تھا۔ پہلے اس نے ریگ زارِ عرب کی کایا پلٹی اور پھر یہ سارے عالَم کے لیے سرچشمۂ ہدایت اور منارۂ نور بن گیا۔ آنحضور ﷺ فی الحقیقت محسنِ انسانیت تھے۔ آپؐ کے برپا کیے ہوئے انقلاب کا خاص الخاص پہلو کفالتِ عامّہ کے ایک انتہائی مؤثر اور حیات بخش نظام کا قیام ہے۔ اصطلاحی طور پر کفالتِ عامّہ سے مراد ہے عام لوگوں یا مخلوقِ خدا کی مادّی ضروریات کو پورا کرنا اور کفالتِ عامّہ کے مؤثر نظام کا مطلب ہے فرسودہ نظامِ معیشت میں انقلابی تبدیلیاں لا کر اسلامی نظامِ معیشت قائم کرنا۔ اسلامی نظامِ معیشت کو ہم بلا تامّل ایسا فلاحی نظام کہہ سکتے ہیں جو بیک وقت روحانی بھی تھا، اخلاقی بھی اور معاشی بھی۔ یہ تینوں پہلو ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح مربوط بلکہ ایک دوسرے کا

جزوِ لاینفک ہیں کہ کسی ایک کے بھی بغیر اسلامی نظامِ معیشت کا تصوّر تک نہیں کیا جا سکتا۔ یہاں اس بات کو ذہن میں رکھنا نہایت ضروری ہے کہ رسولِ اکرم ﷺ کی حیاتِ طیبہ قرآنِ حکیم کی عملی تفسیر تھی۔ قرآنِ پاک کے احکام و منشاء اور حضور ﷺ کے عمل میں سرِ مُو فرق نہ تھا۔ آپؐ نے جو انقلاب برپا فرمایا، یا جو نظام قائم فرمایا وہ یکسر قرآنی انقلاب یا قرآنی نظام تھا۔ قرآنِ پاک بنی نوعِ انسان کو معاش اور معیشت کا جو تصوّر دیتا ہے وہ ایک اخلاقی اور روحانی دستور العمل ہے جو روح اور جسم دونوں کے تقاضوں کو پورا کرتا ہے اور دونوں کے نشوونما اور بالیدگی کی ضمانت دیتا ہے۔ محسنِ انسانیت ﷺ کی سیرتِ طیبہ کے مطالعے سے معیشت میں آپؐ کے لائے ہوئے انقلاب کا جو نقشہ ذہن میں ابھرتا ہے اس کا بنیادی نقطہ رزقِ حلال اور جائز ذرائع سے اس کے حصول کے لیے جدوجہد ہے۔ لیکن بات کسبِ حلال ہی پر ختم نہیں ہو جاتی۔ اسلام جائز ذرائع سے حاصل کیے ہوئے مال پر بھی انسان کو کُلّی تصرف اور اختیار نہیں دیتا بلکہ اس پر کچھ ایسی شرائط اور پابندیاں عائد کرتا ہے جن پر عمل کرنے سے معاشرہ ایک ایسی جنّت بن جاتا ہے جس میں شرفِ انسانی کا احترام بھی ہے اور انسان کی روحانی اور معاشی احتیاج کا علاج بھی۔ اس میں غریب پر زندگی دوبھر نہیں ہوتی اور امیر، امیر تر اور خزانے کا سانپ بننے کا موقع نہیں پا سکتا۔ وہ غریبوں کو اپنی دولت میں حصہ دار بنانے پر مجبور ہوتا ہے۔ اس میں کمزوروں، اپاہجوں، بوڑھوں، بے روزگاروں، یتیموں، بیواؤں اور ناداروں کے حق کو تسلیم کیا جاتا ہے۔ اس میں صرف مسلمان ہی نہیں بلکہ قوم کے غیر مسلم افراد بھی مسلمانوں کی طرح بیت المال سے اپنی احتیاج پوری کر سکتے ہیں۔ اسلامی نظامِ معیشت کے نمایاں خدوخال یہ ہیں:

رزقِ حلال

اسلام نے اسی رزق کو حلال قرار دیا ہے جو نہ صرف دیکھنے میں پاکیزہ اور حلال ہو بلکہ اسے حاصل بھی جائز طریقوں سے کیا گیا ہو اور پھر اس میں سے حقوق اللہ اور حقوق العباد بھی ادا کیے گئے ہوں۔ جائز ذرائع سے رزقِ حلال کے لیے

تگ و دو کرنے کو عبادت کا درجہ حاصل ہے۔ ناجائز ذرائع سے حاصل کردہ حلال چیز بھی حرام ہو جاتی ہے۔ یہ ناجائز ذرائع ہیں، ملاوٹ، غبن، قمار بازی، ذخیرہ اندوزی، دھوکے بازی، کم تولنا، کم ماپنا، رشوت خوری، کام چوری، کسی کا حق غصب کرنا، اپنے اختیارات کا غلط استعمال، ان چیزوں کا کاروبار جو شریعت نے حرام قرار دی ہیں۔ حضورؐ نے ہاتھ کی کمائی کو سب سے بہتر کمائی اور مزدور اور محنت کش کو اللہ کا دوست قرار دیا ہے۔

نظامِ زکوٰۃ

زکوٰۃ ہر صاحبِ حیثیت یا صاحبِ نصاب پر فرض قرار دی گئی ہے۔ یہ ہر غریب کا حق اور حاجت مندوں، معذوروں اور یتیموں کی کفالت کا ذریعہ ہے۔ زکوٰۃ ادا کرنے کی وجہ سے حُبِّ مال کم ہوتی ہے اور ایثار کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ جس طرح نماز حقوق اللہ کا مغز ہے۔ اسی طرح زکوٰۃ حقوق العباد کا مغز ہے۔ صحیح خطوط پر نظامِ زکوٰۃ کا قیام نہ صرف محتاجوں اور غریبوں کی کفالت کا ضامن بلکہ گداگری کے خاتمہ کا بھی مؤثر ذریعہ ہے۔

اِنفاق فی سبیل اللہ

اس کا مطلب ہے اللہ کی راہ میں خرچ کرنا۔ قرآنِ پاک میں جگہ جگہ انفاق فی سبیل اللہ کا حکم دیا گیا ہے اور دولت مندوں سے کہا گیا ہے کہ تم نیکی کو نہیں پہنچ سکتے جب تک اپنی وہ چیزیں اللہ کی راہ میں خرچ نہ کرو جن کو تم عزیز رکھتے ہو۔ آنحضورؐ نے بھی اغنیا کو بار بار تاکید فرمائی کہ تمہارے پاس جو کچھ مال و منال ہے اس میں غریبوں، یتیموں اور مسکینوں کا بھی حق ہے ان کا حق انھیں لوٹا دو۔ اپنے مال کی زکوٰۃ نکال کر اپنے آپ کو فارغ نہ سمجھ لو بلکہ زکوٰۃ کے علاوہ بھی بے دریغ صدقہ و خیرات کرتے رہا کرو۔

قرآنِ پاک میں بخل، مال کو سینت سینت کر رکھنے اور یتیموں اور مساکین سے بدسلوکی کرنے کی سخت مذمت کی گئی ہے۔ سورۂ ھُمَزہ میں ارشاد ہوا ہے:

ہلاکت ہے ہر عیب چینی اور غیبت کرنے والے کے لیے جو مال جمع کرتا اور اس کو گن گن کر رکھتا ہے اور سمجھتا ہے کہ اس کا مال اسے ہمیشہ کی زندگی بخش دے گا۔ ایسا ہرگز نہیں ہوگا۔ سورۂ ماعون میں فرمایا گیا ہے: کیا تو نے اس شخص کو نہیں دیکھا جو جزا کے دن کو جھوٹ سمجھتا ہے۔ یہی ہے جو یتیم کو دھکے دے کر نکال دیتا ہے اور مسکین کو خود کھانا کھلانا تو درکنار اس کی ترغیب بھی نہیں دیتا، تو ایسے شخص کے لیے ہلاکت ہے۔

صحیحین کی ایک حدیث میں رسولِ اکرم ﷺ نے فرمایا ہے: ہر شخص کے پاس صبح کے وقت روزانہ دو فرشتے آتے ہیں۔ ان میں سے ایک کہتا ہے، یا اللہ سخی کو نعم البدل عطا فرما۔ دوسرا کہتا ہے، یا اللہ کنجوس کے مال کو تباہ کر دے۔

گویا رزقِ حلال، انفاق فی سبیل اللہ، سخاوت و ایثار، صلۂ رحمی، باہمی ہمدردی اور خدمتِ خلق، نظامِ زکوٰۃ کے ساتھ مل کر ایسا نظامِ معیشت وجود میں لاتے ہیں جس میں دنیوی اور اخروی خیر و فلاح کا راز مضمر ہے۔ رسولِ اکرم ﷺ نے مدینہ کی اسلامی ریاست کی تاسیس کے بعد یہی نظامِ معیشت اس شان سے قائم فرمایا کہ زمین اللہ کے نور سے جگمگا اٹھی اور ہر طرف رحمت و برکت کے سوتے پھوٹ نکلے یہاں تک کہ ملک بھر میں کوئی زکوٰۃ اور خیرات لینے والا بہت مشکل سے ملتا تھا۔

اسلامی زاویۂ نگاہ سے بچوں کی تعلیم و تربیت

ذرا اپنے معصوم بچّے کو دیکھیے، اس کی آنکھوں میں کتنی چمک ہے، کتنی شوخی ہے اور کس قدر مسرّت بھری ہوئی ہے۔ اب اسے ذرا گُدگُدایئے اور پھر اس کی کِلکاریاں دیکھیے اِنہوں نے سارے گھر میں مسرّت کی لہر دوڑا دی۔ اس کے ہونٹ گلاب کی پنکھڑیوں کی طرح دَمک رہے ہیں۔ اس کی معصُومانہ ادائیں اور شوخیاں دیکھ کر کیا آپ کا دل نہیں چاہتا کہ اُس کو بھینچ بھینچ کر پیار کریں؟ یقیناً چاہتا ہوگا۔ آپ اس کو سینے سے لگائیں گے اُس کا مُنہ سر چومیں گے، اُس کے ساتھ توتلی باتیں کریں گے اور اس کو خوش کرنے کے لیے بچکانہ حرکتیں کریں گے۔ اگر آپ سے پوچھا جائے کہ کیا آپ پسند کریں گے کہ اس بچّے کو آگ میں ڈال دیا جائے یا کسی اندھے کنوئیں میں دھکیل دیا جائے۔ آپ کا جواب یقیناً نفی میں ہوگا بلکہ شاید آپ ایسا سوال کرنے والے کا منہ سر نوچ لیں۔ لیکن یہ بات اچھی طرح سمجھ لیجیے کہ اگر آپ نے اس پھول سے بچے کی مناسب پرورش اور عمدہ تعلیم و تربیت کی طرف سے بے پروائی برتی تو آپ نے یقیناً اسے آگ میں ڈال دیا یا اندھے کنوئیں میں دھکیل دیا۔ یہی وہ بات ہے جس کی طرف قرآنِ حکیم نے نہایت بلیغ انداز میں یوں اشارہ کیا ہے:

یَآاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا قُوْٓا اَنْفُسَکُمْ وَاَهْلِیْکُمْ نَارًا (تحریم: ٦)

یعنی اے ایمان والو! اپنے آپ کو اور اپنے اہل و عیال کو دوزخ کی آگ سے بچاؤ۔ گویا اولاد کی تربیت کی طرَف سے غفلت برتنا نہ صِرف اس کو آگ میں ڈالنے کے مُترادِف ہے بلکہ اپنے آپ کو بھی عذابِ الٰہی کا مُستوجِب بنانا ہے۔

اولاد کی اچھی تربیت کو اسلام میں جو اہمیت دی گئی ہے اِس کا اندازہ دانائے کونین مُحسنِ انسانیت جناب محمّد مُصطفٰی ﷺ کے ان ارشادات سے بھی کیا

جا سکتا ہے:

جامعِ ترمذی میں حضرت سعید بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ کسی باپ نے اپنی اولاد کو کوئی عطیہ حُسنِ اَدب اور اچھی سیرت سے بہتر نہیں دیا یعنی باپ کی طَرَف سے سب سے اعلیٰ اور گراں بہا تُحفہ یہی ہے کہ وہ اپنے بچّوں کی تربیت اِس طرح کرے کہ وہ اچھے اخلاق اور کردار کے مالِک بنیں۔ سُنَنِ ابنِ ماجہ میں حضرت اَنَس بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ سے روایت ہے کہ رَسُولُ اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اپنی اولاد کا اکرام کرو اور اچھی تربیت کے ذریعے اُن کو حُسنِ ادب سے آراستہ کرو حُضُور ﷺ کے اس بلیغ ارشاد میں حقائق و معارف کا ایک سَمَندر مخفی ہے۔ اولاد کی تربیت کے سلسلے میں یہ ایک نہایت ہی جامع اور زرّین گُر ہے کہ اولاد کا اِکرام کیا جائے۔ اِکرام کا مطلب یہ ہے کہ اولاد کو اللہ تعالیٰ کا عَطِیہ اور امانت سمجھ کر اس کی قدر اور لحاظ کیا جائے۔ اسی صورت میں وہ بڑی ہو کر نیک صالح دیندار اور خوش اخلاق ہو گی۔

پرانے بزرگ اولاد کی تکریم کا کس قدر خیال رکھتے تھے اس کا اندازہ ایک چھوٹی سی مثال سے کیا جا سکتا ہے۔ مشہور ادیب خواجہ محمد شفیع دہلوی بیان کرتے ہیں کہ میں جب چھوٹا بچّہ تھا اور دہلی میں رہتا تھا تو مولانا الطاف حسین حالیؔ اکثر ہمارے گھر تشریف لایا کرتے تھے۔ ایک روز مولانا تشریف لائے تو میں گھر کے صحن میں کھیل رہا تھا۔ میری والدہ نے مجھے آواز دی:

”او شفیع اِدھر آ اور مولانا کو سلام کر“

اس پر مولانا حالیؔ نے نہایت شفقت سے میری والدہ سے فرمایا:۔

> ”بیٹی! بچّوں سے اِس طرح بات نہیں کرتے، اِس طرح اُن کے اَخلاق بگڑتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے اس سے منع فرمایا ہے۔ تمہیں اس طرح کہنا چاہیے تھا، میاں محمد شفیع یہاں آؤ، جب تک تم اولاد سے اچھی طرح نہیں بولو گی اولاد کس طرح

اچھے طریقے سے بولنا سیکھے گی۔"

یہ بات کسی دلیل کی محتاج نہیں کہ بچّے ہر ملک اور ہر قوم کا قیمتی سرمایہ ہوتے ہیں' آج کے یہ معصوم اور پیارے بچّے کل کے جوان ہیں۔ قوم اور ملک کی حفاظت اور خدمت کی ذمہ داری انہی کے کندھوں پر ہوگی۔ یہی کسی قوم اور ملک کا مُستقبِل ہیں اور انہی سے ملک وقوم کی امیدیں وابستہ ہیں۔ معاشرے میں بچّوں کی غیر معمولی اہمیّت کے پیشِ نظر ہی سالہا سال پہلے مجلسِ اقوام مُتّحِدہ نے بچّوں کے حُقوق مُتعیَّن کرتے ہوئے اعلان کیا:-

> "نوعِ انسانی بچّوں کے معاملے میں اَخلاقی طَور پر اِس بات کی پابند ہے کہ انہیں ہر وہ بہترین چیز فراہم کرے جو اُس کے قبضے میں ہے"۔

بلاشُبہ یہ ایک شاندار اُصُول ہے اور ترقی یافتہ ممالک میں اس پر بڑی حد تک عَمَل بھی ہو رہا ہے۔ اِن ملکوں میں بچّوں کی تعلیم و تربیت پر خاص تَوجہّ دی جاتی ہے اور اس مقصد کے لئے بجٹ میں بہت بڑی رقوم رکھی جاتی ہیں لیکن یہ ممالک بچّوں کی تعلیم و تربیت کے بارے میں ایک مخصوص نقطۂ نگاہ رکھتے ہیں۔ اُن کے نزدیک اس تعلیم و تربیت کا حاصل یہ ہونا چاہیے کہ بچّے بڑے ہو کر اچھے شہری، اچھے تاجر، اچھے صنعت کار، اچھے مزدور، اچھے عالِم اور اچھے سائنس دان بنیں۔ اس کے ساتھ ہی ان میں اپنے خِطّۂ زمین یعنی وَطَن اور قوم سے اتنا گہرا لگاؤ ہو جس کے ڈانڈے پرستش سے جاملیں۔

ہمین یہ دیکھنا ہے کہ بچّوں کی تعلیم و تربیت کے بارے میں اسلام کا زاویۂ نگاہ کیا ہے۔ اسلام محض رسمی عبادات کا مذہب نہیں بلکہ یہ اللہ کا دین ہے جو زندگی کے ہر شعبے میں بنی نوعِ انسان کی رہنمائی کرتا ہے اور انسانوں کے ہر طبقے کے حُقوق مُتعیَّن کرتا ہے۔ اس کے نظریہءِ حیات میں نہ تنگ نظری ہے اور نہ تعصّب بلکہ یہ آفاقیت اور پوری انسانیت کی فلاح کا عَلَمبردار ہے' اس نے والِدَین پر بچّوں کی پرورش کے ساتھ

ان کی عمدہ تربیت کی ذمہ داری بھی عائد کی ہے۔ اسلام میں بچوں کی عمدہ تربیت سے صرف یہ مراد نہیں کہ وہ بڑے ہو کر اچھے شہری بنیں اور مختلف علوم وفنون میں مہارت حاصل کریں بلکہ اس کے ساتھ وہ اس بات کو بنیادی اہمیت دیتا ہے کہ وہ سچے مسلمان اور اللہ تعالیٰ کے عبادت گزار بندے بنیں۔ خود بھی نیک ہوں اور نیکی کو پھیلانے یا کلمۂ حق کو بلند کرنے کی خاطر سر دھڑ کی بازی لگا دینے والے ہوں کہ یہی قرآنِ حکیم کا انسانِ مطلوب ہے اگر یہ نہیں تو بابا پھر سب کہانیاں ہیں۔ اشتراکی اور سرمایہ دارانہ معاشروں میں بچوں کی تعلیم وتربیت کے معاملے میں دین اور مذہب کو سرے سے کوئی اہمیت ہی نہیں دی جاتی۔ اس کے برعکس اسلامی معاشرے میں بچوں کی تربیت کے معاملے میں دین کو بنیادی اہمیت حاصل ہے اور یہی چیز اس کو مغربی اور لادینی اندازِ تربیت سے ممیز کرتی ہے۔ یہاں اس بات کی وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے کہ بچہ کسی بھی ملک یا قوم کا ہو اس کی فطرت یکساں ہوتی ہے۔ اس فطرت کو سمجھنے کے لئے والدین اور اساتذہ (خواہ وہ کوئی بھی عقیدہ یا نظریہ رکھتے ہوں) اُن کا بچوں کی نفسیات سے کسی نہ کسی حد تک واقف ہونا بہت ضروری ہے ترقی یافتہ ممالک میں بچوں کی نفسیات کے مختلف پہلوؤں پر بے شمار کتابیں لکھی جا چکی ہیں۔ اس قسم کی کتابیں وہاں کے والدین اور اساتذہ کی قدم قدم پر رہنمائی کرتی ہیں کہ وہ بچوں کی تعلیم وتربیت کے لئے کیا انداز اختیار کریں۔ بدقسمتی سے ہمارے ہاں ایسے لٹریچر کی شدید کمی ہے جو بچوں کی تربیت اسلام کے نظریۂ حیات کے مطابق کرنے میں والدین اور اساتذہ کی رہنمائی اور مدد کر سکے۔ اگر والدین اور اساتذہ کو واضح طور پر یہ معلوم ہی نہ ہو کہ اللہ اور رسولؐ کی طرف سے ان پر بچوں کی تربیت کے سلسلے میں کیا فرائض عائد ہوتے ہیں، بچے کی دلچسپیوں اور ضروریات کے تقاضے اسلامی حدود کے اندر رہتے ہوئے کیسے پورے کیے جا سکتے ہیں اور اس کے طبعی رجحانات، فطری میلانات اور نفسیاتی کیفیات کا لحاظ رکھتے ہوئے اس کے ذہن کو اسلامی سانچے میں کس طرح ڈھالا جا سکتا ہے ____ تو وہ بچوں کی اچھی تربیت اور اسلامی خطوط پر اُن کی سیرت

وکردار کی تشکیل کیسے کر سکتے ہیں؟ اس صورتِ حال سے عہدہ برآ ہونے کے لئے ایسے مناسب اور موزوں لٹریچر کا وافر مقدار میں ہونا ہماری اشد ضرورت ہے جو والدین اور اساتذہ کی فکر و نظر کا صحیح رُخ متعیّن کر سکے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ دینی لٹریچر کی ہمارے ہاں کوئی کمی نہیں۔ اگر اس میں سے صحیح قسم کا لٹریچر منتخب کر لیا جائے تو یہ بڑی حد تک والدین اور اساتذہ کی رہنمائی کر سکتا ہے لیکن امرِ واقعہ یہ ہے کہ اس وقت بچوں کی تربیت کے سلسلے میں جن کتابوں پر انحصار کیا جا رہا ہے ان میں سے بیشتر لادین یا مغرب زدہ ذہنوں کی تخلیق ہیں۔ فنی اعتبار سے تو یہ کتابیں بہت خوشنما اور مفید معلوم ہوتی ہیں لیکن ان میں قدم قدم پر اسلام کے بنیادی اصولوں سے انحراف پایا جاتا ہے۔ فی الحقیقت ان کتابوں کا نقطۂ نظر خالص مادّہ پرستانہ ہے یا ان میں ڈارون کا نظریۂ ارتقا کا فرما ہے۔ جب اس قسم کی کتابوں سے مدد لے کر بچّوں کی تربیت کی جائے گی تو اس کا نتیجہ ظاہر ہے۔ آج ہماری نئی نسل دین سے باغی اور اخلاقی اقدار سے روگردان ہو کر صلاح و فلاح کے بجائے فساد فی الارض کا سبب بنتی جا رہی ہے تو اس کا سبب یہ ہے کہ اس کی تربیت اسلامی خطوط پر نہیں کی گئی۔ اس حقیقت سے تو انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس ناخوشگوار صورتِ حال کی ذمہ داری ایک حد تک والدین اور اساتذہ پر عائد ہوتی ہے لیکن سوال یہ ہے کہ اس سلسلے میں والدین اور اساتذہ کی رہنمائی کے لئے قومی سطح پر کیا کیا گیا ہے؟ اس کا جواب بہت مایوس کُن ہے۔ یہ درست ہے کہ بچّوں کے لئے کچھ نہ کچھ کام ضرور ہوا ہے اور ہمارے بعض اہلِ علم نونہالانِ قوم کے لئے ان کی ذہنی استعداد کے مطابق مفید لٹریچر پیش کرنے کی طرف توجہ دے رہے ہیں لیکن والدین اور اساتذہ کے لئے مناسب لٹریچر دُور دُور تک نظر نہیں آتا حالانکہ بچوں اور والدین و اساتذہ کے لئے مناسب لٹریچر ایک دوسرے کے ساتھ لازم و ملزوم ہیں اور اسی سے صحیح نتائج حاصل ہو سکتے ہیں۔ یہاں یہ بات ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ فرد کی شخصیت کے مختلف عناصر کی بنیاد اس کے بچپن ہی میں رکھی جاتی ہے۔ بعد میں اسے تبدیل کرنا اگر ناممکن نہیں تو محال ضرور ہے۔ اس لیے اسلامی خطوط پر بچّوں کی تربیت

کے سلسلے میں والدین اور اساتذہ کے لئے مناسب لٹریچر کی اہمیت اور بڑھ جاتی ہے۔

اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ والدین اور اساتذہ کی رہنمائی کے لئے کس قسم کے لٹریچر کو ''مناسب'' کہا جا سکتا ہے۔ اس سلسلے میں دوسرے لٹریچر سے قطع نظر سب سے اہم اور ضروری رہنما ''کتاب اللہ'' ہے۔ والدین اور اساتذہ کے لئے ضروری ہے کہ وہ قرآنِ حکیم پڑھنا جانتے ہوں اور بچوں کو بھی پڑھا سکتے ہوں۔ خود اس کا آسان زبان میں ترجمہ کر سکتے ہوں تو بہت بہتر ہے ورنہ وہ مُترجَم قرآنِ پاک سے مدد لے سکتے ہیں اور قرآنِ حکیم کے معارِف، احکام اور قصص کو بچوں کے ذہن نشین کرا سکتے ہیں۔

قرآنِ حکیم کے بعد جس لٹریچر سے رہنمائی حاصل کی جا سکتی ہے وہ دو قسم کا ہے پہلی قسم دینی لٹریچر کی ہے اس میں سرفہرست سیرتِ رسول ﷺ ہے۔ والدین اور اساتذہ کو رہبرِ کامل خاتم الانبیا والمرسلین ﷺ کی سیرتِ طیبہ سے مکمل طور پر واقف ہونا ضروری ہے۔ اسی صورت میں وہ حُضور ﷺ کی حیاتِ طیبہ کے واقعات، آپؐ کے ارشادات اور اسوۂ حسنہ سے بچوں کو آگاہ کر سکیں گے۔

دوسرے درجے پر صحابۂ کرامؓ صحابیاتؓ اور دوسرے سلفِ صالحین کی سِیَر ہیں ان سے سبق آموز واقعات اخذ کر کے آسان زبان میں بچوں کو سنانا بڑی افادیت کا حامل ہے۔

تیسرے درجے پر تاریخِ اسلام ہے اس موضوع پر مختصر لیکن جامع کتابیں بہت مفید ہیں۔ والدین اور اساتذہ کا اپنی تاریخ سے واقف ہونا بہت ضروری ہے بالخصوص تاریخ کے وہ ابواب جن میں ہمارے شاندار ماضی کی عکاسی کی گئی ہو، بچوں کو اُن سے آگاہ کرنا بھی ان کی عمدہ تربیت کا ایک حصہ ہے ان کو سچی کہانیوں کے پیرایہ میں بھی بیان کیا جا سکتا ہے۔

چوتھے درجے پر دین کے ضروری مسائل اور دینی اصطلاحات ہیں ایسی کتابیں جن میں دین کے ضروری مسائل بیان کئے گئے ہوں اور دینی اصطلاحات کی

تشریح کی گئی ہو مثلاً توحید، رسالت، فرشتے، یومِ آخرت، خیر، شر، نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، طہارت، فرض، واجب، سُنّت، وغیرہ۔ والدین اور اساتذہ کے لئے ان سے واقف ہونا ضروری ہے تاکہ وہ بچّوں کو اسلام کے ارکان اور اس کی روح سے آشنا کر سکیں۔ فی الحقیقت قرآنِ حکیم کے بعد اس قسم کے لٹریچر کی سب سے زیادہ اہمیت ہے۔ بالخصوص ذرا بڑی عمر کے بچّوں کے لئے تو اس قسم کے لٹریچر سے استفادہ کرنا ناگزیر ہے۔

پانچویں درجے پر دلچسپ اخلاقی کہانیاں ہیں ان میں جِنّوں بھوتوں جادوگروں وغیرہ کے بجائے نیک لوگوں کے واقعات بیان کئے گئے ہوں۔ بچّوں کو ایسی کہانیاں سنا کر ان کے دلوں میں دین اور وطن سے محبت، خدمتِ خلق، ایثار، نیکی، بہادری اور ہمدردی کے جذبات پیدا کئے جاسکتے ہیں۔

دوسری قسم کے لٹریچر میں ایسی کتابوں کی ضرورت ہے:۔

1- جو بچّوں کی نفسیات کے مختلف پہلوؤں مثلاً بچوں کی ضد، بچّوں کی شرارتیں، بچّوں کا خوف، بچّوں کی نفرت' بچوں کا چٹورپن، بچوں کے جھوٹ، وغیرہ کے بارے میں مکمل معلومات بہم پہنچاتی ہوں۔

2 - جو بچوں کی جسمانی صحت اور پرورش کے بارے میں صحیح اور مستند معلومات مہیا کرتی ہوں۔

3- جو بچوں کو کھانے پینے کے آداب سکھاتی ہوں، ان کے اخلاق درست کرتی ہوں اور اچھی عادتیں اپنانے کی تحریک پیدا کرتی ہوں۔

4- جو کھیل اور دوسرے ذرائع سے بچوں کی تربیت کے طریقے بتاتی ہوں۔

5- جو معذور بچّوں کی نگہداشت اور تربیت کے بارے میں رہنمائی کرتی ہوں۔

والدین اور اساتذہ کے لئے مناسب لٹریچر کا یہ ایک مختصر سا خاکہ ہے اس کی اہمیت اور ضرورت اپنی جگہ مُسلّم ہے لیکن سب سے اہم بات جو بچّوں کی سیرت اور

کردار کی تشکیل میں مدد دے سکتی ہے یہ ہے کہ والدین اور اساتذہ خود بچّوں کے لئے ایک عمدہ نمونہ بنیں۔ ہر اس بات اور فعل سے پرہیز کریں جو اللہ تعالیٰ کے حُکم اور فرمودۂ رسولؐ کے خلاف ہو، نہ خود ان کے سامنے کوئی بُری بات کریں نہ اُن کو کوئی بُری بات کرنے دیں اگر اُن کا اپنا نمونہ درست نہیں ہوگا تو بچّوں پر کبھی اس کا اچھا اثر نہیں پڑ سکتا اور وہ کبھی مہذب، مؤدّب اور شائستہ نہیں ہو سکتے اگر ہم خود سچ نہیں بولیں گے، وقت کی پابندی نہیں کریں گے، صبح سویرے نہیں اٹھیں گے، رات کو دیر دیر تک گھر سے باہر رہیں گے، وقت پر نہیں سوئیں گے، کھانے پینے میں اعتدال سے کام نہیں لیں گے، نماز نہیں پڑھیں گے روزہ نہیں رکھیں گے بڑوں کا ادب نہیں کریں گے تو بچّوں سے ان باتوں کی توقّع کیسے کر سکتے ہیں؟

بچّوں کے ساتھ والدین اور اساتذہ کے طرزِ عمل اور سلوک میں اعتدال اور توازن ہونا چاہیے وہ بچوں سے لاڈ پیار ضرور کریں لیکن یہ نہ حد سے زیادہ ہونا چاہیے اور نہ بے موقع۔ کبھی کبھی بچّوں پر سختی کرنے کی ضرورت بھی پیش آجاتی ہے لیکن یہ سختی بھی حد سے زیادہ نہیں ہونی چاہیے اور مار پیٹ تک تو اس کی نوبت ہرگز نہیں پہنچنی چاہیے۔ ان کی عزت کریں اور عزتِ نفس کا خیال رکھیں لیکن ساتھ ہی ان کے دلوں میں بڑوں کی عزّت کرنے کا جذبہ پیدا کریں۔ ان کے ساتھ نرمی اور شفقت کا برتاؤ کریں اور اُن کی جائز ضروریات کو پورا کرنے میں سستی سے کام نہ لیں۔ اُن کو کھیل کود سے منع نہ کریں لیکن ایسی کھلی چھٹی بھی نہ دیں کہ وہ پڑھنے لکھنے سے جی چُرانے لگیں بس یہ ہو کہ وقت پر کھیلیں اور وقت پر پڑھیں، اُن کے دِلی رجحان کے مطابق تعلیم دلائیں یا کوئی ہنر سکھائیں لیکن دینی تعلیم کو ہر حال میں مُقدَّم رکھیں۔ نہ خود بے راہرو ہوں اور نہ اُن کو بے راہرو ہونے دیں، نہ خود بُری صحبتوں میں بیٹھیں اور نہ اُن کو ایسی صحبتوں میں بیٹھنے دیں، نہ خود بُری عادتوں میں مبتلا ہوں اور نہ اُن کو مبتلا ہونے دیں۔ بچے ایک سے زیادہ ہوں تو سب کے ساتھ یکساں سلوک کریں اگر ایک کو دوسرے پر ترجیح دیں گے تو وہ آپس میں حَسَد کرنے لگیں گے اور احساسِ کمتری کا شکار

ہو جائیں گے یا احساسِ برتری میں مبتلا ہو جائیں گے لڑکوں اور لڑکیوں کے درمیان کبھی تفریق نہ کیجیے (ہادیٔ اکرم ﷺ نے ایسی تفریق کرنے سے منع فرمایا ہے) اور سب کے ساتھ یکساں حُسنِ سلوک کیجیے۔ مختصر یہ کہ بچّوں کی تربیت کے لیے اپنی تربیت کرنا بھی ضروری ہے اور جو لٹریچر بچّوں کی تربیت کے لیے والدین اور اساتذہ کی رہنمائی کرسکتا ہے وہی اُن والدین اور اساتذہ کی اپنی تربیت کے لئے بھی مفید ثابت ہوسکتا ہے۔

اس سلسلے میں سب سے اہم بات جس پر ہر مسلمان کا ایمان ہونا چاہیے، وہ یہ ہے کہ ہدایت اور تربیتِ حقیقی فی الحقیقت اللہ تعالیٰ کا کام ہے اس لیے بچّوں کی تربیت اور اُن کے نیک مستقبل کے بارے میں صرف اُسی ذاتِ رحیم وکریم پر پورا بھروسا کرنا چاہیے اور اسی سے اس مقصد کے لیے عجز والحاح کے ساتھ دُعا کرنی چاہیے۔ اپنی ذات یا لٹریچر یا کسی اور طریقے یا ذریعے پر بھروسا کرنا مناسب نہیں ہے۔ بچّوں پر سختی کرنے، ان کو بات بات پر روکنے اور ٹوکنے کا مطلب یہ ہوگا کہ گویا ہدایت یا تربیت کا نتیجہ ہمارے اپنے ہاتھ میں ہے اور ہم ان کی سیرت وکردار کو اپنی مرضی اور خواہش کے مطابق ڈھال لیں گے۔ یہ ایک قسم کا شرکِ خفی ہوگا اس سے اجتناب کرنا چاہیے۔ والدین (یا بچوں کے سرپرستوں) کا کام (اچھی تعلیم وتربیت کے ذریعے) صرف کوشش کرنا ہے کہ ان کے بچّے اچھے اخلاق وکردار کے مالک بنیں لیکن کوشش کا نتیجہ وہ اللہ تعالیٰ پر چھوڑ دیں۔ دیکھا گیا ہے کہ بعض نہایت نیک اور احکامِ الٰہی کے پابند مسلمانوں کی اولاد بھی اچھی تعلیم وتربیت کے باوجود بگڑ جاتی ہے (جیسا کہ حضرت نُوح علیہ السّلام کا بیٹا بگڑ گیا تھا) اس کے اسباب وعِلَل کا علم اللہ تعالیٰ ہی کو ہوتا ہے۔ ہم صرف یہ کرسکتے ہیں کہ جہاں بچوں کی تعلیم وتربیت کا مناسب اہتمام کریں وہاں ان کے لیے تسلسل کے ساتھ دُعا بھی کرتے رہیں اور اپنا پورا بھروسا اللہ تعالیٰ کی رحمت اور اس کے فضل پر رکھیں۔

وَمَا عَلَیْنَا اِلَّا الْبَلَاغ

لمبی امیدیں نعمتوں کی خوشی کو دُور کرتی ہیں

قرآنِ حکیم اللہ تعالیٰ کی آخری کتاب ہے اور اس کی بے شمار صِفتوں میں سے ایک خاص صِفت یہ ہے کہ یہ انسان کے اندر سے تبدیلی لاتی ہے، اُس کا تعلق اللہ جَلَّ شانُہٗ سے اُستوار کرتی ہے اور اُس کے نفس کی برائیوں کو مغلوب کر کے اچھائیوں کو غالب کرتی ہے۔ ایک مومن کی اچھائی یا صفتِ محمود قرآنِ حکیم نے یہ بیان کی ہے کہ دُکھ ہو یا سُکھ، خوشی ہو یا غمی، فراخی ہو یا تنگدستی، سردی ہو یا گرمی، خوشگواری ہو یا ناخوشگواری، وہ ہر حال میں اللہ کی رضا پر راضی رہے۔ حالات سازگار ہوں، اُس کی چاہتیں اُس کو مل رہی ہوں، امیدیں بر آ رہی ہوں تو وہ اِس کو اپنی قوتِ بازو کا نتیجہ نہ سمجھے بلکہ اللہ تعالیٰ کا فضل اور اس کی بخشش سمجھ کر ہر نعمت پر اس کا شکر ادا کرے اور جب کوئی دکھ اور مصیبت پیش آ جائے تو مایوسی اور سراسیمگی کا شکار نہ ہو بلکہ ایمانی صبر و ثبات کے ساتھ اُس کا استقبال کرے اور دل میں اس اِیقان کو تازہ کرے کہ یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے اور وہی اس مصیبت سے نجات دلانے والا ہے۔ اس کے برعکس جو شخص اللہ تعالیٰ کی رضا پر راضی نہیں ہوتا اور طُولِ اَمَل میں مبتلا رہتا ہے اُس کو کبھی اطمینانِ قلب نصیب نہیں ہوتا۔ طُولِ اَمَل یہ ہے کہ لمبی امیدیں باندھی جائیں اور جو کچھ اللہ تعالیٰ نے دے رکھا ہے اس پر قناعت نہ کی جائے بلکہ زیادہ سے زیادہ کی تمنّا کی جائے۔ ایسا شخص حقیقی معنوں میں ناشکرا ہوتا ہے وہ نہ تو اُن نعمتوں کا شکر ادا کرتا ہے جو اِس کو پہلے سے حاصل ہیں اور نہ اس کو کوئی نئی نعمت ملنے پر خوشی ہوتی ہے کیونکہ ہوائے نفس یا حرص و طمع اِس خوشی کو زائل کر دیتی ہے۔ گویا جہاں ہم غنائے نفس یا قناعت اور صبر و شکر کو ساری بھلائیوں کا سرچشمہ کہہ سکتے ہیں وہاں طُولِ اَمَل یا حرصِ دنیا کو ساری برائیوں کی جڑ اور اطمینانِ قلب کی قاطع

کہیں گے۔

قرآنِ حکیم کی سورۃُ النِّساء میں ارشاد ہوا ہے:

وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰہُ بِہٖ بَعْضَکُمْ عَلٰی بَعْضٍ ط (آیة ۳۲)

ترجمہ: ''یعنی اور جو کچھ اللہ نے تم میں سے کسی کو دوسروں کے مقابلہ میں زیادہ دیا ہے اُس کی تمنا نہ کرو۔

اس آیت میں ہمیں جو ہدایت دی گئی ہے اسے اگر ملحوظ رکھا جائے تو ہمارے معاشرے میں ہر ایک کو اَمن و سکون اور اطمینانِ قلب کی لازوال دولت نصیب ہو جائے۔ اس حقیقت سے تو کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ خالقِ کائنات نے تمام انسانوں کو ایک جیسا نہیں بنایا بلکہ ان کے درمیان انواع واقسام کے فرق رکھے ہیں کوئی سالم اور صحیح اعضا کے ساتھ پیدا ہوا ہے اور کوئی پیدائشی طور پر ناقص الاعضاء ہے۔ کوئی خوبصورت ہے اور کوئی بدصورت، کوئی قوی ہے اور کوئی کمزور، کوئی خوش الحان ہے اور کوئی بدآواز، کوئی تاجر ہے اور کوئی مزدور، کسی کو اللہ نے بہتر حالات میں پیدا کیا ہے اور کسی کو بدتر حالات میں، کسی کو زیادہ ذرائع آمدنی دیے ہیں اور کسی کو کم، اِسی فرق و امتیاز کی بنا پر انسانی تمدّن کی عمارت قائم ہے۔ اس فرق کو مٹانے یا اسے نظرانداز کرنے کی کوشش کرنا فطرت سے جنگ کرنے کے مترادف ہے، اسے ہم زمین پر فساد برپا کرنے کی کوشش کا نام بھی دے سکتے ہیں۔ آدمی کی یہ ذہنیت کہ جسے کسی حیثیت سے اپنے مقابلہ میں بڑھا ہوا دیکھے بے چین ہو جائے، یہی اجتماعی زندگی میں کفرانِ نعمت، حسد، رَقَابَت، عداوت، اور باہمی کشمکش کی جڑ ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جب اس کی لمبی امیدیں پوری نہیں ہوتیں اور جو فضل اسے جائز طریقوں سے حاصل نہیں ہوتا اسے وہ ناجائز طریقوں سے حاصل کرنے پر اتر آتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں اسی ذِہنِیَّت سے بچنے کی ہدایت فرمائی ہے۔ اس ارشاد کا مُدَّعَا یہ ہے کہ جو فَضل اس نے تم سے زیادہ دوسروں کو دیا ہے اس کی تمنا نہ کرو اور نہ اپنے دل میں لمبی امیدیں پالو البتہ اللہ سے فَضل کی دعا کرو، وہ جس فَضل

یا نعمت کو اپنے عِلم و حِکمت سے تمہارے لیے مناسب سمجھے گا عطا فرما دے گا۔

حقیقت یہ ہے کہ اپنے دل میں لمبی امیدیں پالنے والے کو عطائے نعمت پر کبھی حقیقی خوشی نصیب نہیں ہوتی بلکہ اس کے دل میں حرص کی آگ اور بھڑک اٹھتی ہے یہ آگ ہر وقت بھڑکتی رہتی ہے یہاں تک کہ فرشتہء اجل اس کو اپنے پنجوں میں دبوچ لیتا ہے سورۂ تکاثُر میں انسان کی اسی کیفیت کو بیان کیا گیا ہے کہ مال کی کثرت اور دنیا کے ساز و سامان کی حرص آدمی کو اللہ اور آخرت سے غافل کر دیتی ہے۔ دن رات اس پر دنیا کمانے کی دُھن سوار رہتی ہے یہاں تک کہ موت اس کے دروازے پر آ دستک دیتی ہے۔ مرنے کے بعد اس کو معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کی حرص نے اس کو مُنعِم حقیقی کی طرف سے غافل رکھا اور اُس نے اُس کے اوامر و نواہی پر عمل نہ کیا جس کے نتیجے میں آتشِ جہنم اس کا مقدر بنی۔ طُولِ اَمَل یا حرص و ہوس کے روگ کا علاج صرف قناعت ہے جس کو قناعت یا غِنائے نفس کی دولت مل گئی اسے سب کچھ مل گیا۔

شیخ سعدیؒ نے کیا خوب کہا ہے:

؎ گفت چشمِ تنگِ دنیا دوست را
یا قناعت پُر کُنَد یا خاکِ گور

یعنی دنیا کی حرص میں مبتلا آدمی کی تنگ آنکھ کو یا تو قناعت بھرتی ہے یا پھر قبر کی مٹی۔ اللہ تعالیٰ سے دعاء ہے کہ ہمیں لمبی امیدوں میں مبتلا ہونے سے بچائے اور قناعت کی دولت نصیب فرمائے۔

فرض صدقہ کے ماسوا صدقات چھپا کر دو

اسلام دینِ فطرت ہے، وہ انسانوں کے مختلف طبقوں میں رزق کی کمی بیشی یا تنگی اور فراخی کو تسلیم کرتا ہے لیکن ساتھ ہی زیادہ رزق والوں پر فرض عائد کرتا ہے کہ وہ کم رزق والوں یعنی فقیروں، مسکینوں، حاجتمندوں، اور مبتلائے مصیبت لوگوں کی دل کھول کر مدد کریں۔ اس سلسلے میں زکوٰۃ ہر صاحبِ نصاب مسلمان پر شرعاً فرض قرار دی گئی ہے۔ مختلف قسم کے اموال اور پیداوار پر اس کی ایک معیّن شرح ہے اور یہ اس شرح کے مطابق سال میں ایک ہی دفعہ دی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ صدقہ دینا بھی ہر ذی استطاعت مسلمان کے لئے لازم قرار دیا گیا ہے اس کی نہ کوئی مقدار مقرر ہے اور نہ کوئی وقت۔ اسلام کی اصطلاح میں صدقہ بالعموم اس عطیّے کو کہتے ہیں جو خلوصِ نیّت کے ساتھ حلال کی کمائی سے محض رضائے الٰہی کی خاطر دیا جائے۔ اس میں نمود و نمائش اور تفاخر کا شائبہ تک نہ ہو، کسی لینے والے پر احسان نہ جتایا جائے، دینے والا صرف اس لئے دے کہ وہ اپنے رب کو راضی کرنے کا سچا جذبہ رکھتا ہے اور اس کا مقصد صرف اور صرف اِنفاق فی سبیل اللہ ہے۔ ایسے صدقے کو اللہ تعالیٰ نے اپنے ذمّے قرض قرار دیا ہے۔ سورۃ الحدید میں ارشاد ہوا ہے:

اِنَّ الْمُصَّدِّقِيْنَ وَالْمُصَّدِّقَاتِ وَ اَقْرَضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا
يُّضَاعَفُ لَهُمْ وَلَهُمْ اَجْرٌ كَرِيْمٌ (آیة ۱۸)

یعنی مردوں اور عورتوں میں جو لوگ صدقات دینے والے ہیں اور جنہوں نے اللہ کو قرضِ حَسَنہ دیا ہے اُن کو یقیناً کئی گُنا بڑھا کر دیا جائے گا اور اُن کے لئے بہترین اجر ہے۔

اب رہا یہ سوال کہ صدقات کیسے دیے جائیں۔ تو اس کے بارے میں سورۃ بقرہ میں ارشاد ہوا ہے:

اِنْ تُبْدُوْا الصَّدَقَاتِ فَنِعِمَّا هِيَ ۚ وَاِنْ تُخْفُوْهَا وَ تُؤْ تُوْ هَا الْفُقَرَآءَ
فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ؕ وَيُكَفِّرُ عَنْكُمْ مِّنْ سَيِّاٰتِكُمْ ؕ
وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ۝ (آیة ۲۷۱)

(یعنی) اپنے صدقات علانیہ دو تو یہ بھی اچھا ہے۔ لیکن اگر چھپا کر حاجت مندوں کو دو تو یہ تمہارے حق میں زیادہ بہتر ہے۔ تمہاری بہت سی برائیاں اس طرزِ عمل سے مِٹ جاتی ہیں اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ کو بہر حال اس کی خبر ہے۔

مُفسّرِین نے اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اگر چہ علانیہ صدقہ دینے کو جائز قرار دیا ہے لیکن شرط یہ ہے کہ اس میں ریا کاری مطلق نہ ہو یعنی یہ لوگوں کے دکھاوے کے لئے ہرگز نہ ہو کیونکہ ریا کاری بدترین گناہ ہے اور دکھاوے کے لئے دیا گیا صدقہ اجر کے بجائے عذاب کا موجب بن جاتا ہے۔ اس طرح صدقہ دینے والے اللہ تعالیٰ کو ناپسند ہیں جیسا کہ سورۃ نساء میں ارشاد ہوا ہے۔

وَالَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ رِئَآءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ
وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ (آیة ۳۸)

(یعنی) اور وہ لوگ بھی اللہ کو ناپسند ہیں جو اپنے مال محض لوگوں کو دکھانے کے لئے خرچ کرتے ہیں اور در حقیقت وہ نہ اللہ پر ایمان رکھتے ہیں نہ روزِ آخر پر۔

فُقہائے اسلام نے ہر قسم کے اعمال کے لئے یہ اُصول مقرر کیا ہے کہ فرائض کا علانیہ انجام دینا فضیلت رکھتا ہے۔ اور نوافل کو چھپا کر ادا کرنا اَولیٰ ہے۔ اس اُصول کی روشنی میں جو صدقہ فرض ہو (مثلاً زکوٰۃ) اس کو علانیہ دینا افضل ہے اور جو صدقہ فرض کے ماسوا ہو اس کا اخفاء زیادہ بہتر ہے۔ حق تعالیٰ نے بھی چھپا کر صدقہ دینے کو صدقہ دینے والے کے حق میں زیادہ بہتر قرار دیا ہے۔ اس لیے کہ چھپا کر نیکیاں کرنے سے انسان کے نفس و اخلاق کی خرابیاں دور ہوتی رہتی ہیں، اس کے

اوصافِ حمیدہ خوب نشوونما پاتے ہیں، اس کی بہت سی برائیاں رفتہ رفتہ محو ہو جاتی ہیں اور یہی بات اس کو بارگاہِ الٰہی میں اتنا مقبول بنا دیتی ہے کہ جو تھوڑے بہت گناہ اس کے نامۂ اعمال میں ہوتے ہیں انہیں اس کے حُسنِ نیت کے ساتھ اخفاء میں دیتے ہوئے صدقات کی بناء پر اللہ تعالیٰ معاف کر دیتا ہے۔

قرآنِ پاک میں مالی صدقات کے مستحقین میں والدین، رشتے داروں، یتیموں، مسکینوں اور مسافروں کا خصوصیت کا ساتھ نام لیا گیا ہے۔ ان کے علاوہ ان تنگ دست لوگوں کو بھی خاص طور پر صدقہ کا مستحق قرار دیا گیا ہے۔ جو اللہ کے کاموں میں ایسے مشغول ہو گئے ہیں کہ اپنی ذاتی کسبِ معاش کے لئے تگ و دو نہیں کر سکتے مگر اپنی خودداری کی وجہ سے کسی کے سامنے دستِ سوال دراز نہیں کرتے، ان کی اعانت تو لازماً رازداری کے ساتھ کرنی چاہیے تاکہ ان کی عزتِ نفس مجروح نہ ہو۔ اللہ کے کاموں سے مراد کسی نہ کسی انداز سے ہمہ وقت دین کی خدمت یا ہمہ وقت دین کی تعلیم حاصل کرنا ہے۔

یہان یہ وضاحت کرنا بے محل نہ ہوگا کہ صدقہ صرف مال ہی کا نہیں ہوتا بلکہ اس کا مفہوم بہت وسیع ہے۔ صحیح بخاری اور صحیح مسلم مین رسول اللہ ﷺ کے یہ ارشادات نقل ہوئے ہیں کہ صدقہ و خیرات کچھ مال ہی پر موقوف نہیں بلکہ دو شخصوں کے درمیان عدل کرنا بھی صدقہ ہے، اچھی بات بھی صدقہ ہے، ایذا دینے والی چیز راستے سے ہٹا دینا بھی صدقہ ہے، ہر قدم جو مسجد کو جاتے وقت اٹھایا جائے وہ بھی صدقہ ہے، لوگوں کو نیکی کا حکم دینا اور برائی سے روکنا بھی صدقہ ہے۔

مُسندِ احمد میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ہر نیکی صدقہ ہے اور ایک نیکی یہ ہے کہ مسلمان بھائی سے خندہ پیشانی سے ملاقات کریں اور ایک نیکی یہ ہے کہ پانی کا ڈول بھر کر کسی مسلمان بھائی کے برتن میں ڈال دیں۔ مطلب یہ کہ معمولی سی نیکی کو بھی حقیر نہیں جاننا چاہیے۔ سنن ابی داؤد اور سنن نسائی کی ایک حدیث کے مطابق جس جگہ پانی نہ ملتا ہو یا اس کے حصول میں دشواری ہو وہاں کنواں لگوانا

صدقہ جاریہ ہے۔

مشکوٰۃ شریف میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ صدقہ پروردگار کی آتشِ غضب کو ٹھنڈا کرتا اور بُری موت سے محفوظ رکھتا ہے۔ صدقہ دینے میں جلدی کرو بلاشبہ بلا یعنی مصیبت صدقہ دینے سے بڑھنے نہیں پاتی۔ ''جلدی کرو'' سے حضورؐ کی مراد یہ ہے کہ موت یا بیماری سے پہلے صدقہ دے دو مختصر یہ کہ رحمتِ عالم ﷺ کا اُمّت پر احسان ہے کہ آپؐ نے زکوٰۃ خیرات کے علاوہ دوسری ہر قسم کی نیکیوں کو بھی صدقہ قرار دیا۔ بلاشبہ ان میں ایسی نیکیاں بھی شامل ہیں جن کو کھلے عام ہی کیا جا سکتا ہے اور ان کو اخفا میں رکھنا ممکن ہی نہیں مثلاً سیلاب میں گھرے ہوئے لوگوں کی مدد کرنا، دشمن کے حملے سے متاثر لوگوں کی مدد کرنا، کسی علاقے میں وبا پھوٹ پڑے تو اس کا شکار ہونے والوں کی مدد کرنا، سبیل لگا کر پیاسوں کو پانی پلانا، کھانا پکوا کر غریبوں کو کھلانا، لوگوں کو کثرت سے سلام کرنا وغیرہ وغیرہ، ان نیکیوں میں ذاتی تشہیر یا سیاسی فائدہ اٹھانے کی خواہش ہرگز نہیں ہونی چاہیے ورنہ نیکی برباد اور گناہ لازم والا معاملہ ہو جائے گا۔ دعا ہے اللہ تعالیٰ ہم سب کو رضائے الٰہی کی خاطر مالی صدقات اور دوسری نیکیاں زیادہ سے زیادہ کرنے کی توفیق دے۔

اپنے یا کسی دوسرے کے ماں باپ کو گالی دینا گناہِ کبیرہ ہے

صحیح بُخاری اور صحیح مُسلِم میں حضرت عبداللہ بن عَمرو بن العاص رضی اللہ عنہُ سے روایت ہے:

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ: مِنَ الْکَبَائِرِ شَتْمُ الرَّجُلِ وَالِدَیْہِ، قَالُوْا یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ وَ ھَلْ یَشْتِمُ الرَّجُلُ وَالِدَیْہِ؟ قَالَ نَعَمْ یَسُبُّ اَبَا الرَّجُلِ فَیَسُبُّ آبَاہُ وَ یَسُبُّ اُمَّہٗ فَیَسُبُّ اُمَّہٗ

یعنی رسولُ اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اپنے ماں باپ کو گالی دینا بھی کبیرہ گناہوں میں سے ہے۔ لوگوں نے عرض کیا، یارسُولَ اللہ! کیا کوئی اپنے ماں باپ کو بھی گالی دے سکتا ہے؟ آپؐ نے فرمایا:۔ ہاں اس کی صورت یہ ہے کہ کوئی آدمی کسی دوسرے کے ماں باپ کو گالی دے۔ پھر وہ جواب میں اُس کے ماں باپ کو گالی دے۔

اس حدیثِ پاک سے معلوم ہوا کہ کسی آدمی کا کسی دوسرے کو ماں باپ کی گالی دینا، یا ایسی بات کہنا یا ایسی حرکت کرنا جس کے جواب میں دوسرا آدمی اس کے ماں باپ کو گالی دینے لگے، اُتنی ہی بُری بات ہے جتنی کہ خود اپنے ماں باپ کو گالی دینا اور یہ بہت بڑا گناہ ہے۔

دانائے کونین رحمتِ دوعالَم ﷺ کے اس ارشادِ مبارک پر قرآنِ حکیم کے بعض واضح احکام اور آپ کی کچھ دوسری احادیثِ مبارکہ کی روشنی میں غور کیا جائے تو اس کی حکمت و مَوعِظت کے کئی پہلو سامنے آتے ہیں اور ہمیں لامُحالہ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ کسی کے ماں باپ کو گالی دینا اپنے ماں باپ کو گالی دینے کے مُترادِف ہے اور یہ فی الواقع گناہِ کبیرہ ہے۔

یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ اسلام میں گالی دینا خواہ وہ کسی بھی قسم کی

ہو اور کوئی بھی اس کا مخاطب ہو، فی نفسہٖ نہایت بری اور گناہ کی بات ہے چہ جائیکہ کسی کے ماں باپ کو گالی دی جائے۔ سرورِ کائنات ﷺ کا ارشاد ہے کہ مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں یعنی اس کی زبان اور ہاتھ سے نہ کسی دوسرے مسلمان کو ایذا پہنچے اور نہ اُس کی دلآزاری ہو۔ گالی دینے کا مطلب ہے دوسرے کو زبان سے تکلیف پہنچانا اور اُس کا دِل دُکھانا گویا گالی دینے کی قبیح حرکت اسلام کا دعویٰ کرنے والے کسی بھی شخص کی شان کے مُنافی ہے۔

اب رہا دوسرے کے ماں باپ کو گالی دینا تو یہ ہر لحاظ سے سخت مذموم حرکت ہے۔ ایک تو یہ کہ اس میں غیبت کا پہلو ہے جسے قرآنِ حکیم میں مُردہ بھائی کا گوشت کھانے کے مُترادِف ٹھہرایا گیا ہے جیسا کہ سورۂ الحُجرات میں ارشاد ہوا ہے:۔

وَلَا يَغْتَبْ بَّعْضُكُمْ بَعْضاً ط اَيُحِبُّ اَحَدُكُمْ اَنْ يَّاْكُلَ لَحْمَ اَخِيْهِ مَيْتاً

یعنی تم میں سے کوئی کسی کو پیٹھ پیچھے بُرا نہ کہے۔ کیا تم میں سے کوئی اس بات کو پسند کرے گا کہ اپنے مرے ہوئے بھائی کا گوشت کھائے؟ (آیۃ-۱۲)

جب دوسرے کے ماں باپ سامنے نہیں ہیں تو ان کو گالی دینا پیٹھ پیچھے ان کی برائی کرنا ہے جو بلا شبہ غیبت ہے اور پھر یہ کہ اس طرح گالی دینے کا مطلب یہ بھی ہے کہ دوسرے مسلمان کو جواب میں اسی طرح کی حرکت کرنے کی ترغیب دی جائے یعنی وہ بھی اپنی زبان کو گندہ کرنے اور غیبت کرنے کے گناہ کا ارتکاب کرے حالانکہ مسلمان کی تعریف یہ ہے کہ وہ دوسروں کو نیکی کی تلقین کرتا ہے اور برائی سے روکتا ہے۔ اس حدیثِ پاک میں سب سے اہم نکتہ جس پر زور دیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ دوسرے کے والدین کو گالی دینا اپنے والدین کو گالی دینے کے برابر ہے اور اپنے والدین کو گالی دینا ان کو ایذا پہنچانے کے مُترادِف ہے۔

صحیح بخاری کی ایک اور روایت میں سرورِ عالم ﷺ نے والدین کی ایذا رسانی کو اکبر الکبائر یعنی بدترین اور خبیث ترین گناہوں میں شمار فرمایا ہے اور اسے شرک کے بعد دوسرے درجہ پر رکھا ہے۔ اس کے برعکس آپؐ نے ماں باپ کی خدمت

اور ان کے ساتھ حسنِ سلوک کو اللہ تعالیٰ کی رضامندی کا ضامن قرار دیا ہے۔ کیونکہ قرآنِ حکیم میں جابجا اِس کی سخت تاکید کی گئی ہے۔ سورۂ بقرہ اور سورۂ بنی اسرائیل مین حکم دیا گیا ہے: وَبِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَانًا ط یعنی والدین کے ساتھ اچھے سے اچھا برتاؤ اور ان کی خدمت کرو۔

سورۂ لقمان میں فرمایا گیا ہے وَوَصَّیْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَیْهِ یعنی ہم نے انسان کو اس کے ماں باپ کے حق میں تاکید کی۔

سورۂ بنی اسرائیل میں حکم دیا گیا:۔

فَلَا تَقُلْ لَّهُمَآ اُفٍّ وَّلَا تَنْهَرْ هُمَا وَقُلْ لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيْمًا ○ وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ وَقُلْ رَّبِّ ارْ حَمْهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِيْ صَغِيْرًا ط (آیة ۲۳، ۲۴)

یعنی ان کو بالکل نہ جھڑکو بلکہ بطور جھڑک کے اُف بھی نہ کہو اور ان کے ساتھ ادب اور عزت کے ساتھ بات چیت کرو۔ اور عجز و نیاز سے ان کے آگے جھکے رہو اور ان کے حق میں دعا کرتے رہو کہ اے میرے پروردگار تو ان دونوں پر رحم کر جس طرح انہوں نے مجھے بچپن میں پالا پوسا تھا۔

قرآنِ پاک میں اور بھی متعدد مقامات پر والدین کی خدمت اور اطاعت کی تاکید کی گئی ہے، سُنَنِ ابنِ ماجہ میں حضرت ابو اُمامہؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا، یا رسُول اللہ ﷺ اولاد پر ماں باپ کا کتنا حق ہے۔ آپؐ نے فرمایا وہ تمہاری جنّت اور دوزخ ہیں۔ صحیح مسلم میں حضرت ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، وہ آدمی ذلیل ہو، وہ خوار ہو، وہ رُسوا ہو، عرض کیا گیا، کون یارسول اللہ ﷺ؟ فرمایا وہ بدنصیب جو ماں باپ کو یا دونوں میں سے کسی ایک ہی کو بڑھاپے میں پائے پھر (ان کی خدمت اور ان کا دل خوش کر کے) جنّت حاصل نہ کرے۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ

اپنے ماں باپ کی خدمت اور اطاعت کرو اس طرح تمہاری اولاد بھی تمہاری فرمانبردار اور خدمت گزار ہوگی۔

حضورؐ نے ماں باپ کی زندگی ہی میں ان کی خدمت اور اطاعت کا حکم نہیں دیا بلکہ تاکید فرمائی کہ ان کے مرنے بعد بھی ان کے حق میں دعا کرتے رہو اور باپ کے انتقال کے بعد اس کے دوستوں سے اِکرام واحترام کا تعلق رکھو۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں اپنے اور دوسروں کے والدین کی عزت واحترام کی توفیق نصیب فرمائے۔ آمین ثم آمین۔

غیبت نہایت گھناؤنا گناہ ہے

"غیبت" کا مطلب ہے ایک دوسرے کو پیٹھ پیچھے بُرا بتانا یا کسی شخص کی غیر حاضری میں اُس کے بارے میں ایسی بات کہنا جو اگر اسے معلوم ہو تو اس کو بُری لگے۔ صحیح مسلم، جامع ترمذی اور بعض دوسری کُتُب حدیث میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے (پوچھے جانے پر) فرمایا کہ:

> "غیبت یہ ہے کہ تو اپنے بھائی کا (اس کے پسِ پشت) ذکر اس طرح کرے جو اسے ناگوار ہو (جس سے وہ ناخوش ہو)۔ عرض کیا گیا" اگر میرے بھائی میں فی الواقع وہ بات پائی جاتی ہو جو میں کہہ رہا ہوں تو اس صورت میں آپ کیا فرماتے ہیں؟ آپؐ نے فرمایا' اگر اس میں وہ بات پائی جاتی ہو تو تُو نے اس کی غیبت کی اور اگر اس میں وہ نہ پائی جاتی ہو تو تُو نے اس پر بہتان لگایا۔"

قرآنِ حکیم میں غیبت کو نہایت گھناؤنا فعل قرار دیا گیا ہے۔ سورۃُ الحُجُرات میں ارشاد ہوا ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اجْتَنِبُوْا كَثِيْرًا مِّنَ الظَّنِّ ز اِنَّ بَعْضَ
الظَّنِّ اِثْمٌ وَّلَا تَجَسَّسُوْا وَلَا يَغْتَبْ بَّعْضُكُمْ بَعْضًا ؕ
اَيُحِبُّ اَحَدُكُمْ اَنْ يَّاْكُلَ لَحْمَ اَخِيْهِ مَيْتًا فَكَرِهْتُمُوْهُ ؕ
وَاتَّقُوا اللّٰهَ ط اِنَّ اللّٰهَ تَوَّابٌ رَّحِيْمٌ ۝ (آیة ۱۲)

ترجمہ: اے لوگو جو ایمان لائے ہو بہت گمان کرنے سے پرہیز کرو کہ بعض گمان گناہ ہوتے ہیں، تجسّس نہ کرو اور تم میں سے کوئی کسی کی غیبت نہ کرے، بھلا تمہارے اندر کوئی ایسا ہے جو اپنے مرے ہوئے بھائی کا گوشت کھانا پسند کرے گا؟

دیکھو تم خود اس سے گھن کھاتے ہو۔ اللہ سے ڈرو، اللہ بڑا توبہ
قبول کرنے والا اور رحیم ہے۔

اس ارشادِ ربانی سے بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ غیبت کس درجہ کا گناہ ہے۔ یہ مکروہ عادت جہاں اللہ تعالیٰ کی ناراضی کا سبب ہے وہاں یہ اکثر باہمی نفرت، عداوت اور فساد کا باعث بھی بن جاتی ہے۔ ہمارے معاشرے میں یوں تو اور بھی متعدد اخلاقی کمزوریاں موجود ہیں لیکن غیبت جیسی مکروہ بداخلاقی سب سے زیادہ پائی جاتی ہے بالخصوص خواتین میں تو یہ مکروہ عادت بہت عام ہے۔ جہاں چند عورتیں مل بیٹھیں وہیں بعض دوسری خواتین کی عدم موجودگی میں ان کی خامیاں اور برائیاں موضوعِ گفتگو بن گئیں۔ مرد حضرات میں بھی اکثر غیبت کو چنداں معیوب نہیں سمجھتے اور دوسروں کی عدم موجودگی میں بڑی بے تکلفی سے ان کی کمزوریاں اور برائیاں گنانے لگتے ہیں۔ ہادیٔ اکرم ﷺ مسلمانوں کو اس گھناؤنے فعل سے بچنے کی بار بار تاکید فرماتے رہتے تھے اس سلسلے میں آپؐ کے بہت سے ارشادات کُتبِ حدیث میں ملتے ہیں ان میں سے چند یہ ہیں۔

۱۔ حضرت عمار رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا،
جو شخص دنیا میں غیبت کرتا رہتا ہے، قیامت کے دن اس کی زبان آگ کی ہوگی۔
(مشکوٰۃ شریف)

۲۔ حضرت ابو سعید خدری اور حضرت جابر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ غیبت زِنا سے سخت تر گناہ ہے۔ صحابہؓ نے عرض کیا، یارسول اللہ! غیبت زِنا سے سخت گناہ کیوں ہے؟

آپؐ نے فرمایا، آدمی زِنا کرتا ہے پھر توبہ کرتا ہے تو اللہ اس کی توبہ قبول فرمالیتا ہے لیکن غیبت کرنے والے کو معاف نہیں کرے گا جب تک وہ شخص اس کو معاف نہ کرے جس کی اس نے غیبت کی ہے۔ (مشکوٰۃ شریف)

۳۔ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ

کو اشارے سے بتایا کہ فلاں عورت ٹھنگنی اور کوتاہ قد ہے۔ آپؐ نے فرمایا، عائشہؓ! تو نے ایسی بات کہی ہے کہ اسے اگر سمندر میں بھی ڈال دیا جائے تو اس کے اثر سے سمندر کا پانی متغیرّ ہو جائے (مشکوٰۃ شریف)

۴۔ حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہُ سے روایت ہے کہ دو شخصوں نے ظہر و عصر کی نماز پڑھی۔ دونوں کا روزہ بھی تھا۔ پھر جب رسول اللہ ﷺ نے نماز ختم کی تو ان سے فرمایا، تم دونوں دوبارہ وضو کر کے نماز پڑھو البتہ روزہ پورا کر لو مگر اس روزے کے بدلے کسی دن ایک اور روزہ رکھنا ہوگا۔ انہوں نے عرض کیا، کس وجہ سے یا رسول اللہ؟ آپؐ نے فرمایا، تم دونوں نے فلاں شخص کی غیبت کی ہے۔ (مشکوٰۃ شریف)

۵۔ حضرت اَنس رضی اللہ تعالیٰ عنہُ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جب مجھے معراج کرائی گئی تو میں ایک ایسی قوم کے پاس سے گزرا جن کے ناخن پیتل کے تھے اور وہ اپنے چہرے اور سینے کھرچ رہے تھے میں نے جبریلؑ سے پوچھا، یہ کون لوگ ہیں؟ جبریلؑ نے بتایا، یہ وہ لوگ ہیں جو لوگوں کی غیبت کیا کر تے تھے۔ (مشکوٰۃ شریف)

غیبت کی ایک قِسم دو آدمیوں کو لڑانے کے لیے چغلی کھانا ہے دوسری غیبت کی طرح شریعت میں یہ بھی حرام ہے ۔ دو حدیثیں ملاحظہ ہوں:

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہُ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ چغل خور جنّت میں داخل نہیں ہوگا۔ (بخاری و مسلم)

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ دو قبروں کے پاس سے گزرے تو آپؐ نے فرمایا' ان دونوں پر عذاب ہو رہا ہے اور یہ عذاب کسی ایسی بات پر نہیں ہو رہا جسے وہ چھوڑ نہیں سکتے تھے (اگر چاہتے تو اس سے بچ سکتے تھے) بلاشبہ ان کا جرم بڑا ہے ان میں سے ایک چغلی کھاتا تھا اور دوسرا اپنے پیشاب کے چھینٹوں سے نہیں بچتا تھا۔ (بخاری و مسلم)

غیبت خواہ کسی شخص کی زندگی میں کی جائے یا اس کے مرنے کے بعد' دونوں

صورتوں میں حرام ہے۔ ابوداؤد کی روایت ہے کہ حضرت ماعزؓ بن مالک اسلمی کو جب زنا کے جرم میں سنگسار کر دیا گیا تو نبی ﷺ نے راہ چلتے ایک صاحب کو اپنے دوسرے ساتھی سے یہ کہتے ہوئے سُنا کہ ''اس شخص (ماعزؓ) کو دیکھو اللہ نے اس کا پردہ ڈھانک دیا تھا مگر اس کے نفس نے اس کا پیچھا نہ چھوڑا جب تک یہ کتے کی موت نہ مار دیا گیا'' کچھ دور آگے جا کر راستے میں ایک گدھے کی لاش سڑتی ہوئی نظر آئی۔ حضور ﷺ رک گئے اور ان دونوں اصحاب کو بلا کر فرمایا ''اتریے اور اس گدھے کی لاش تناول کیجیے'' ان دونوں نے عرض کیا' یارسول اللہ! اسے کون کھائے گا؟ آپؐ نے فرمایا' ابھی ابھی آپ لوگ اپنے بھائی کی عزت پر جو حرف زنی کر رہے تھے' وہ اِس گدھے کی لاش کھانے سے بہت زیادہ بُری تھی۔ (تفہیم القرآن جلد پنجم ص ۹۱)

اگر غیبت کرنے والا اپنی غلطی پر پشیمان ہوکر توبہ کرے اور اپنی لغزش کا کفارہ ادا کرنا چاہے تو اُس کو اس حدیث کے مطابق عمل کرنا ہوگا: ''حضرت انس رضی اللہ عنہُ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، ''غیبت کا ایک کفارہ یہ ہے کہ تو اس شخص کے لیے مغفرت کی دُعا کرے جس کی غیبت کی ہے، دُعا میں یوں کہے کہ اے اللہ تو میری اور اس کی مغفرت فرما۔ اگر وہ شخص موجود ہے اور اس سے اپنا جرم معاف کرایا جاسکتا ہے تو معاف کرائے اور اگر معافی اس کی وفات کی وجہ سے یا اس کے دور دراز علاقوں میں جا بسنے کی وجہ سے ممکن نہ ہو تو پھر اس کے لیے دعائے مغفرت کے سوا کوئی راہ نہیں''۔ (مشکوٰۃ شریف)

غیبت عام حالات میں بلاشبہ نہایت گھناؤنا فعل ہے۔ یہ خواہ واضح الفاظ میں کی جائے یا اشارۃً کنایۃً ہر صورت میں حرام ہے لیکن بعض حالات میں کسی شخص یا گروہ کی عدم موجودگی میں اسکی برائیاں اور غلطیاں بیان کرنا ناگزیر ہوتا ہے اس کے بغیر نہ مظلوم کی دادرسی ہوسکتی ہے' نہ انصاف مل سکتا ہے' نہ ظالم کا ہاتھ پکڑا جاسکتا ہے' نہ کسی مفتی سے صحیح فتویٰ حاصل کیا جاسکتا ہے' نہ فسق وفجور اور دوسرے خلافِ شرع کاموں کے خلاف کوئی قدم اٹھایا جاسکتا ہے چنانچہ فقہا اور محدثین نے حسب ذیل

صورتوں میں کسی شخص یا گروہ کی عدم موجودگی میں اس کے خلاف کچھ کہنے سننے کو جائز قرار دیا ہے بشرطیکہ یہ سراسر حقیقت پر مبنی ہو اور اس میں مبالغے اور جھوٹ کی آمیزش نہ ہو۔

۱۔ استفتا کی غرض سے کسی مفتی کے سامنے کسی شخص یا گروہ کے غلط کام کا ذکر کرنا،

۲۔ کسی شخص یا گروہ کی بدمعاشی' بدکاری اور خلافِ شریعت کاموں کا ذکر ایسے لوگوں کے سامنے کرنا جو ان برائیوں کو روکنے کے لیے کچھ کر سکتے ہوں۔

۳۔ مظلوم کی ظالم کے خلاف ان لوگوں (بشمول حاکمانِ وقت) کے سامنے جو ظالم کو ظلم کرنے سے روک سکتے ہوں یا ظلم کے نتیجے میں جو نقصان ہوا ہو اس کی تلافی کرا سکتے ہوں۔

۴۔ معاشرے میں فسق و فجور' بدعات اور دوسری برائیاں پھیلانے والے لوگوں کے خلاف آواز بلند کرنا۔

۵۔ جو شخص اپنے کسی فعلِ بد کی وجہ سے کسی بُرے نام یا لقب سے مشہور ہو گیا ہو اس کے تعارف کے لیے وہ لقب استعمال کرنا مثلاً ابوجہل 'سلطانا ڈاکو' گاموں جوار یا وغیرہ

۶۔ شادی بیاہ کا رشتہ کرنے، کاروبار میں شرکت کرنے' پڑوس میں مکان کرایہ پر لینے یا خریدنے' کسی کے پاس امانت رکھنے کے لیے دوسرے فریق کے بارے میں آپ سے کوئی مشورہ لے تو اس کے عیب وصواب دونوں پہلو بیان کرنا تا کہ مشورہ لینے والا دھوکا نہ کھائے۔

۷۔ احادیث کی جرح وتعدیل کرتے ہوئے یا کسی تاریخی یا دوسرے واقعہ کا تجزیہ کرتے ہوئے راویوں' گواہوں اور مصنفین کی کمزوریاں بیان کرنا۔

دُعا ہے کہ ان مستثنیات کے سوا اللہ تعالیٰ ہر مسلمان مرد اور عورت کو غیبت جیسے گھناؤنے فعل سے محفوظ رکھے۔

حَسَد کا مُنہ کالا

حَسَد کا مطلب یہ ہے کہ کسی شخص کو اللہ تعالیٰ نے جو خوبی، فضیلت یا مال جائداد وغیرہ کی صورت میں جو نعمتیں عطا فرمائی ہوئی ہوں اس پر کسی دوسرے شخص کا جَل کر یہ چاہنا کہ وہ خوبی، فضیلت یا نعمتیں اس شخص سے چھن کر خود اس (حاسد) کو مل جائیں یا کم از کم اس سے ضرور چھن جائیں۔ قرآنِ حکیم میں کسی شخص یا گروہ کے کسی دوسرے شخص یا گروہ (جماعت) سے حسد کرنے کا سبب اس طرح بیان کیا گیا ہے۔

اَمْ یَحْسُدُوْنَ النَّاسَ عَلٰی مَآ اٰتٰھُمُ اللّٰہُ مِنْ فَضْلِہٖ (النسآء: ۵۴)

(پھر کیا یہ دوسروں سے اس لیے حسد کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے
انہیں اپنے فضل سے نوزا دیا یا کیا وہ لوگوں سے حسد کرتے ہیں
اوپر اس چیز کے جو اللہ نے ان کو اپنے فضل سے عطا کی)

حَسَد فی الحقیقت ایک بدترین اخلاقی اور روحانی بیماری ہے جس کا تعلق انسان کے قلب سے ہے اور یہ خباثتِ نفس، خود پسندی، کینہ توزی، حرص، باہمی عداوت، احساسِ کمتری، غرور، تکبّر، خود اعتمادی کے فقدان اور بدبختی کی علامت ہے۔

یہ ایسی شرّ انگیز برائی ہے کہ قرآنِ حکیم میں اس کا ارتکاب کرنے والے کے شرّ سے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگنے کی تلقین کی گئی ہے۔ سُوْرَۃُ الْفَلَقْ میں جہاں تمام مخلوقات، رات کی تاریکی اور گرہوں میں پھونکنے والوں (یا والیوں) کے شرّ سے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگنے کی ہدایت کی گئی ہے وہاں حاسد کے شرّ سے بھی جب کہ وہ حَسَد کرے، یہ فرما کر بطورِ خاص اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگنے کے لیے فرمایا گیا ہے۔

قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ، مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ...... وَمِنْ شَرِّ حَاسِدٍ اِذَا حَسَدَ

اگر غور کریں تو حَسَد کرنے کو نہ صِرف حاسِد کی دِنایت اور خساستِ طبع بلکہ اللہ تعالیٰ کے نظامِ ربوبیت پر اعتراض کرنے کے مترادف بھی کہا جا سکتا ہے بالفاظِ

دیگر اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں میں جو نعمتیں تقسیم کی ہیں حاسِد اس تقسیم کو مبنی برانصاف نہیں سمجھتا۔ اللہ جَلَّ شانُہٗ جو عادل اور قادرِ مطلق ہے اس کے بارے میں اس قسم کا خیال تک بھی دل میں لانا گناہِ کبیرہ ہے۔ اسی لیے ہادیِ اکرم ﷺ نے مسلمانوں کو حَسَد سے بچنے کی سخت تاکید فرمائی ہے اس سلسلے میں آپ کے چند ارشادات ملاحظہ ہوں۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ حَسَد سے بچو کیونکہ حَسَد نیکیوں کو اس طرح کھالیتا ہے جس طرح آگ لکڑیوں کو کھا لیتی ہے۔ (ابوداؤد)

حضرت اَنَس رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ کسی بندہ کے دل میں ایمان اور حَسَد دونوں جمع نہیں ہو سکتے۔ (بیہقی)

حضرت ضمرہ بن ثعلبہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ لوگوں پر ہمیشہ بھلائی اور خیر سایہ فگن رہے گی جب تک وہ آپس میں حسد نہ کریں۔ (طبرانی)

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ آدمیوں میں سب سے بہتر وہ ہے جو مخموم القلب (یعنی ایسا دل رکھنے والا جس میں کھوٹ اور حَسَد نہ ہو) اور صدوق اللّسان (زبان کا سچّا) ہو۔ (مشکوٰۃ)

حضرت زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تم میں پہلی اُمّتوں کا مرض سرایت کرتا جاتا ہے ایک حَسَد اور دوسرا (باہمی) دشمنی اور ان میں سے ہر چیز (مونڈنے) والی ہے، میں یہ نہیں کہتا کہ بالوں کو مونڈتی ہے بلکہ دین کو مونڈ دیتی ہے۔ (ترمذی)

یہاں یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ حَسَد اور رَشک میں بہت فرق ہے حاسد کی خواہش تو یہ ہوتی ہے کہ دوسرے کو جو نعمت اللہ نے عطا کی ہے وہ اس سے سلب ہو کر حاسد کو مل جائے یا اس سے ضرور چھن جائے لیکن رَشک کرنے والے کی

آرزو یہ ہوتی ہے کہ جو نعمت دوسرے کو ملی ہے وہ نعمت اللہ تعالیٰ اسے بھی عطا کرے۔ وہ دوسرے کی نعمت سے جلتا نہیں اور نہ یہ خیال کرتا ہے کہ اسے یہ نعمت کیوں ملی ہے۔ بس وہ اللہ تعالیٰ کے فضل کا امیدوار ہوتا ہے اور اس کے لیے بارگاہِ الٰہی میں دعا کر کے اپنے آپ کو اس کی رضا کے سپرد کر دیتا ہے۔ اگر اس کو وہ نعمت نہیں ملتی تو صبر اور شکر سے کام لیتا ہے اور جو کچھ اس کے پاس ہے اسی پر قناعت کرتا ہے۔ اس کے برعکس حاسد کے دل میں آگ لگی ہوتی ہے۔ اس آگ میں وہ ہر وقت جلتا رہتا ہے اور اطمینانِ قلب کی دولت سے محروم رہتا ہے۔ بعض دفعہ حاسد محسود کو سازشوں کے ذریعے عملاً نقصان پہنچانے کی کوشش کرتا ہے۔ اگر اس میں کامیاب نہیں ہوتا تو اس کے دل کی جلن میں اور اضافہ ہو جاتا ہے۔ یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ بعض حاسِدین محسود کو جادو ٹونوں کے ذریعے نقصان پہنچانے کا طریقہ اختیار کرتے ہیں۔ اس طرح وہ کفر کا ارتکاب کرتے ہیں اور اپنی دنیا و عاقبت برباد کر لیتے ہیں۔ مختصر یہ کہ حَسَد کے جس پہلو پر بھی نظر ڈالیں وہ دنیا اور دین دونوں کو تباہ کرنے والی ''بدی'' ہی نظر آتا ہے۔ قرآنِ پاک، احادیثِ مبارکہ اور بزرگانِ دین کے اقوال میں حَسَد کی جس شِدّت سے مَذَمَّت کی گئی ہے اس کے پیشِ نظر حاسد کو چاہیے کہ وہ اس قابلِ نفرت خصلت سے نجات حاصل کرنے کے لیے کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کرے۔ اگر اس کے دل میں کسی کی طرف سے برائی پیدا ہو اور اس کو محسوس ہو کہ قلب کی یہ کیفیت کینہ اور حَسَد کی صورت اختیار کر رہی ہے تو وہ بارگاہِ الٰہی میں نہایت عجز و الحاح کے ساتھ التجا کرے کہ وہ رحیم و کریم اس کے دل میں محسود کے لیے کینہ و حسد کی جگہ اُخُوّت اور محبت کے جذبات پیدا کر دے ساتھ ہی وہ محسود کی برائی بیان کرنے کے بجائے اس کی مدح و توصیف کرے (یعنی اس کی زندگی کے اچھے پہلوؤں پر نظر رکھے اور ان کی بنیاد پر محسود کا اچھے پیرائے میں ذکر کرے)۔ اس کو اس عقیدے پر بھی کامل ایمان رکھنا چاہیے کہ حَسَد کا جذبہ میری دنیا اور آخرت دونوں کے لیے مضر ہے اور محسود کو اللہ نے جو نعمت بخشی ہے وہ نعمت حسد کرنے سے زائل نہیں ہوتی بلکہ ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس میں اضافہ کر

دے۔ جہاں تک محسود کا تعلق ہے، اس کو علمائے ربانی نے حسد کے شر سے بچنے کے لیے ذیل کی تدابیر اختیار کرنے کی تلقین کی ہے:

۱۔ حاسد کے شرّ سے اللہ کی پناہ مانگتا رہے (سُورۃُ الْفَلَق کی کثرت سے تلاوت کرتا رہے)

۲۔ اس بات پر پختہ یقین رکھے کہ جب تک اللہ تعالیٰ نہ چاہے کوئی اس کا بال بھی بیکا نہیں کر سکتا۔

۳۔ حاسد کی باتوں پر صبر کرے اور اس کے جواب میں کوئی ایسی بات یا حرکت نہ کرے جس سے وہ اخلاقی طور پر حاسد کی سطح پر آ جائے۔

۴۔ اپنے دل سے حاسد اور اس کے حسد کو یکسر محو کر دے گویا حاسد کا کوئی وجود ہی نہیں ہے۔

۵۔ حاسد اللہ کے خوف اور اپنی عاقبت سے بے نیاز ہو کر خواہ کیسی ہی بیہودہ حرکتیں کرے، محسود تقوٰی پر قائم رہے اور حاسد کی بدی کا جواب بدی سے دینے کا خیال تک دل میں نہ لائے۔

۶۔ حاسد کے لیے دعا کرتا رہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو ہدایت دے اور اس کی عاقبت بخیر ہو

۷۔ اگر کوئی موقع حاسد کے ساتھ نیکی اور بھلائی کرنے کا آئے تو محسود کو اس کے ساتھ احسان اور بھلائی کرنے سے گریز نہیں کرنا چاہیے اور اس بات کی پروا نہیں کرنی چاہیے کہ حاسد اس کے احسان اور بھلائی سے متاثر ہوتا ہے یا نہیں۔ اپنے نیک عمل کے نتیجے کو وہ اللہ تعالیٰ پر چھوڑ دے۔

۸۔ محسود کو اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور نوشتۂ تقدیر پر کامل اور پختہ ایمان رکھنا چاہیے۔ ایسی صورت میں اللہ تعالیٰ کے خوف کے سوا کسی اور کا خوف اس کے دل میں ہرگز نہ آنے پائے گا

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہم سب کو حسد کی لعنت سے محفوظ رکھے۔

بُخل اور اِسراف سے پرہیز

اسلام دینِ فطرت ہے اور وہ زندگی کے تمام اُمور میں میانہ روی یا اعتدال کو بہترین روش قرار دیتا ہے۔ کوئی انفرادی معاملہ ہو یا اجتماعی، اس میں انتہا پسندی اور افراط وتفریط سے کام لینا نہایت برے نتائج پیدا کرسکتا ہے۔ رسولِ اکرم ﷺ کا ارشاد ہے: خَیْرُ الْاُمُوْرِ اَوْسَطُھَا یعنی تمام کاموں میں میانہ روی بہتر ہے۔ اسلام چونکہ زندگی کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کرتا ہے اس لئے قرآنِ حکیم اور احادیثِ نبوی میں بھلائی اور برائی کے تمام کاموں کی واضح طور پر نشاندہی کردی گئی ہے۔ بُخل اور اِسراف دو ایسی خصلتیں ہیں جو اگرچہ ایک دوسرے کی ضد ہیں مگر دونوں کو سخت مذموم قرار دیا گیا ہے اور ہر مسلمان کو ان سے بچنے کی تلقین کی گئی ہے۔ بُخل کا مطلب ہے تنگ دلی اور کنجوسی، حاجت مندوں پر خرچ نہ کرنا اور دوسروں کے کام نہ آنا بھی اسی میں شامل ہے۔ بخیل آدمی حریص، لالچی، بے رحم اور سخت دل ہوتا ہے۔ اللہ کی محبت کی بجائے اس کے دل میں مال اور دولت کی محبت بھری ہوتی ہے۔ ایسے لوگوں کے بارے میں قرآنِ حکیم میں ارشاد ہوا ہے:

وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ بِمَآ اٰتٰهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ هُوَ
خَيْرًا لَّهُمْ ۭ بَلْ هُوَ شَرٌّ لَّهُمْ ۭ سَيُطَوَّقُوْنَ مَا بَخِلُوْا بِهٖ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ

(آلِ عمران: ۱۸۰)

یعنی ”جن لوگوں کو اللہ اپنے فضل سے نوازتا ہے اور پھر وہ بخل سے کام لیتے ہیں، وہ اس خیال میں نہ رہیں کہ یہ بخیلی ان کیلئے اچھی ہے، نہیں، یہ ان کے حق میں نہایت بری ہے۔ جو کچھ وہ اپنی کنجوسی سے جمع کررہے ہیں وہی قیامت کے دن ان کے گلے کا طوق بن جائے گا۔“

جامعِ ترمذی میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا سخی بندہ اللہ سے قریب ہے، اللہ کے بندوں سے قریب ہے، جنت سے قریب ہے اور دوزخ سے دُور ہے اور بخیل آدمی اللہ سے دُور ہے، اللہ کے بندوں سے بھی دُور ہے اور جنت سے دُور اور دوزخ سے قریب اور بلاشبہ ایک بے عِلم سخی اللہ تعالیٰ کو عبادت گزار کنجوس سے زیادہ پیارا ہے۔ ''سُنَنِ نسائی'' کی ایک حدیث میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، حرص و بخل اور ایمان کبھی ایک دل میں جمع نہیں ہو سکتے ---مطلب یہ ہے کہ ایمان کی حقیقت اور بخل کی عادت میں ایسی مُنافات ہے کہ جس دل کو حقیقی ایمان نصیب ہوگا اس میں بخل نہیں آسکتا اور جس کے دل میں بخل ہے اس میں ایمان کا نور نہیں ہے رسولِ اکرم ﷺ فرمایا کرتے تھے کہ اپنے آپ کو بخل سے بچاؤ کہ اس نے پہلی اُمتوں کو ہلاک کردیا پس کسی مسلمان کے شایانِ شان نہیں کہ بخل کرے اور جہنم میں جائے۔

اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ بخیل آدمی کی صرف آخرت ہی برباد نہیں ہوتی بلکہ دنیا میں بھی وہ ذلیل ورسوا ہو جاتا ہے۔ لوگ اس کو حقارت اور نفرت کی نظر سے دیکھتے ہیں اور اُس کے نزدیک نہیں پھٹکتے۔ ایسے شخص کو مال کی حرص کی وجہ سے کبھی اطمینان نصیب نہیں ہوتا۔ اس کے برعکس اللہ کی راہ میں خوشدِلی سے خرچ کرنے والے کو جو روحانی آسودگی حاصل ہوتی ہے، دنیا کی کوئی بڑی سے بڑی نعمت بھی اُس کا بدل نہیں ہوسکتی۔ اسلام نے جس شِدّت سے بخل کی مذمّت کی ہے اُسی شِدّت سے اِسراف کو برا بھی کہا ہے اِسراف کا مطلب ہے فضول خرچی یا غیر مناسب طور پر خرچ کرنا۔ اسلامی نقطۂ نگاہ سے اِسراف تین چیزوں کا نام ہے ایک ناجائز کاموں میں دولت صَرف کرنا خواہ ایک پیسہ ہی کیوں نہ ہو دوسرے جائز کاموں میں خرچ کرتے ہوئے حد سے تجاوُز کرنا خواہ اِس لحاظ سے کہ آدمی اپنی استطاعت سے بڑھ کر خرچ کرے یا اِس لحاظ سے کہ اُس کو جو دولت اپنی ضرورت سے زیادہ مل گئی

اسے وہ اپنے عیش اور ٹھاٹھ باٹھ میں صَرف کرتا چلا جائے۔ اِسراف کی تیسری قسم عجیب نوعیت کی ہے وہ یہ کہ آدمی نیکی کے کاموں پر دل کھول کر روپیہ خرچ کرے مگر اُس کا مقصد اللہ کو راضی کرنا نہ ہو بلکہ رِیا اور نمائش ہو یعنی لوگ اس کو بڑا آدمی سمجھیں اور اس کی سخاوت اور دریا دلی کی تعریفیں کریں۔ اِسراف کی یہ سبھی صورتیں قابلِ مذَمّت ہیں اور ان سے بچنے کی سخت تاکید فرمائی گئی ہے۔

سورۃ الاعراف میں ارشاد ہوا ہے:۔

كُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَلَا تُسْرِفُوْا ۚ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ ٥

(آیۃ۔۳۱)

''یعنی کھاؤ پیو اور اِسراف نہ کرو۔ بے شک اللہ اِسراف کرنے والوں کو
پسند نہیں کرتا۔''

اسی طرح سورۃ بنی اسرائیل میں اِسراف سے بچنے کا حکم دیا گیا ہے اور اِسراف کرنے والوں کے لیے نہایت سخت الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔ ارشاد ہوا ہے:

وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِيْرًا ٥ اِنَّ الْمُبَذِّرِيْنَ كَانُوْٓا اِخْوَانَ الشَّيٰطِيْنِ ؕ

(آیۃ ۲۶۔۲۷)

''یعنی فضول خرچی نہ کرو۔ بے شک فضول خرچی کرنے والے
شیطان کے بھائی ہیں۔''

بُخل اور اِسراف دونوں کا علاج سخاوت، ایثار اور خدمتِ خلق ہے۔ یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کی خاطر ہو اور اس میں نام و نمُود کی خواہش کی مُطلق آمیزش نہ ہو۔ اس راستے پر چلنے والا شخص نہ صرف آخرت میں سُرخرُو ہوگا بلکہ دنیا میں بھی اس کے مال و دولت میں برکت ہوگی لوگ اس کو عزت و احترام کی نظر سے دیکھیں گے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ طمانیتِ قلب کی نعمت سے بہرہ ور ہوگا۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے تمام احکام میں کوئی نہ کوئی حکمت پوشیدہ ہوتی ہے

اوران پر عمل کرنے میں انسان کی اپنی ہی بھلائی ہے۔ بُخل اوراسراف سے اجتناب کرنے میں انسان کا سراسر فائدہ ہی فائدہ ہے۔ اِس سے اُس کے رزق میں برکت، قلب میں راحت پیدا ہوگی اوراس کے گھر پر رحمتوں اور برکتوں کا نزول ہوگا۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہم سب کو بخل اور اِسراف سے گریز کرنے کی توفیق دے۔

……☆……☆……

۱۔ حضرت انس رضی اللہ عنہٗ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ فرمایا کرتے تھے کہ اے میرے اللہ، میں بخل سے تیری پناہ مانگتا ہوں۔

(صحیح بخاری)

۲۔ حضرت شدّاد بن اوس رضی اللہ عنہٗ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جس شخص نے لوگوں کو دکھانے کے لیے نماز پڑھی اس نے شرک کیا اور جس شخص نے لوگوں کو دکھانے کے لیے روزہ رکھا اس نے شرک کیا اور جس شخص نے لوگوں کو دکھانے کے لیے صدقہ کیا اس نے شرک کیا۔

(مسندِ احمد)

وسوسوں کو زبان پر بھی نہ لائیں

صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہُ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:۔

"اللہ تعالیٰ نے میری اُمت کے دل میں آنے والے وسوسوں کو معاف کر دیا ہے۔ اُن پر کوئی مواخذہ نہ ہوگا جب تک اُن پر عمل نہ ہو اور ان کو زبان سے نہ کہا جائے"۔

اس حدیثِ پاک میں ان منکرانہ اور مُلحِدانہ سوالات اور بُرے خیالات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جو کبھی کبھی انسان کے دل میں پیدا ہوتے ہیں اور یہ بتایا گیا کہ ایسے وسوسوں پر جب تک عمل نہ کیا جائے یا ان کو زبان سے نہ نکالا جائے، ان کی کوئی باز پرس نہ ہوگی، حق تعالیٰ نے ان کو معاف فرما دیا ہے۔

وَسوَسہ کے لُغوی معنٰی ہیں پے در پے ایسے طریقے یا طریقوں سے کسی کے دل میں کوئی بُری بات ڈالنا کہ جس کے دل میں وہ ڈالی جارہی ہو اسے محسوس نہ ہو سکے کہ وسوسہ انداز اس کے دل میں بُری بات ڈال رہا ہے۔

وسوسے انسان کے دل میں شیاطینِ جنّ وانس بھی ڈالتے ہیں اور خود انسان کا اپنا نفس بھی اندر سے انہیں پیدا کرتا ہے۔ یہ وسوسے کس نوعیت کے ہوتے ہیں، صحیحین کی ایک اور حدیث میں اس کی طرف یوں اشارہ کیا گیا ہے:

"حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہُ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ تم میں سے کسی کسی کے پاس شیطان آتا ہے اور کہتا ہے کہ فلاں چیز کو کس نے پیدا کیا، فلاں چیز کو کس نے پیدا کیا یہاں تک کہ وہ یہ کہتا ہے کہ اللہ کو کس نے پیدا کیا، جب وسوسے کا سلسلہ یہاں تک پہنچے تو چاہیے کہ بندہ اللہ سے پناہ مانگے اور رُک جائے۔ مطلب یہ ہے کہ اس قسم کے جاہلانہ اور احمقانہ سوال جب شیطان کسی کے دل میں ڈالے تو اس کو چاہیے کہ شیطان کے شرّ سے اللہ کی پناہ مانگے، خیال کو اس طرف

سے پھیر لے، اور ایسے وسوسے کو زبان سے بھی نہ نکالے۔ اللہ جب اُس ہستی کا نام ہے جس کا وُجود اُس کی ذاتی صِفت ہے اور جو تمام موجودات کو وجود بخشنے والا ہے تو اس کے بارے میں ایسا وسوسہ پیدا کرنا محض شیطانی فعل ہے۔ یہ تو وسوسوں کی نوعیت کی محض ایک مثال ہے ورنہ وسوسوں کی بے شمار اقسام ہیں مثلاً اللہ تعالیٰ کے وجود یا اس کی وحدانیت پر شک کرنا، اس کے پیغمبر کی حقانیت میں شک کرنا، اللہ والوں کی مخالفت کرنا، بدعت کی راہیں ڈھونڈنا، معصیّت کی تاویلیں کرنا وغیرہ وغیرہ۔ انسان کا نفس اس کے اندر جو وسوسہ پیدا کرتا ہے اس کی بنیاد اس کے غلَط نظریات ہوتے ہیں جو اس کی عقل کو گمراہ کرتے ہیں، اس کی اپنی ناجائز اغراض وخواہشات اس کی قوّتِ تمیز، قوّتِ ارادی اور قوتِ فیصلہ کو بدراہ کرتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ انسان کا خالق و مالک ہے وہ اس کے دل کا حال خوب جانتا ہے اور اُس کے نفسانی وسوسوں سے بھی آگاہ ہے جیسا کہ اس نے سورۂ قٓ میں ارشاد فرمایا ہے:

وَنَعْلَمُ مَا تُوَسْوِسُ بِهٖ نَفْسُهٗ

''یعنی ہم اس کے نفس سے ابھرنے والے وسوسوں کو جانتے ہیں''

اسی بنا پر رسولِ اکرم ﷺ نے اپنے مشہور خطبۂ مسنونہ میں یہ دعا مانگی ہے:

نَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا " یعنی ہم اللہ کی پناہ مانگتے ہیں اپنے نفس کی شرارتوں سے۔"

یہ اللہ تعالیٰ کی شانِ رحیمی ہے کہ آنحضو ﷺ کے ارشاد کے مطابق وہ ایسے وسوسوں کا مواخذہ نہیں فرمائے گا بشرطیکہ نہ ان پر عمل کیا جائے اور نہ انہیں زبان پر لایا جائے۔ صرف یہی نہیں بلکہ ایسے وسوسوں کو زبان پر نہ لانے کو حضُورؐ نے خالص ایمان قرار دیا ہے۔ صحیح مسلم کی ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے اصحاب میں سے کچھ لوگ آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور دریافت کیا کہ ہمارا حال یہ ہے کہ بعض اوقات ہم اپنے دلوں میں ایسے بُرے خیالات اور وسوسے پاتے ہیں کہ اُن کو زبان سے کہنا بھی بہت بُرا اور بھاری معلوم ہوتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا، کیا واقعی تمہاری یہ حالت ہے؟ انہوں نے عرض کیا، جی ہاں یہی حال ہے۔ آپؐ

نے ارشاد فرمایا، یہ تو خالص ایمان ہے۔ گویا وسوسوں کو بُرا جاننا اور ان کو زبان پر لانے سے اجتناب کرنا خالص ایمان کی نشانی ہے۔

سُنن ابی داوٗد میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں ایک شخص حاضر ہوا اور عرض کیا کہ کبھی کبھی میرے دل میں ایسے بُرے خیالات آتے ہیں کہ جل کر کوئلہ ہو جانا مجھے اس سے زیادہ محبوب ہے کہ میں ان کو زبان سے نکالوں، آپؐ نے ارشاد فرمایا، اللہ کی حمد اور شکر ہے جس نے اس معاملہ کو وسوسہ کی طرف لوٹا دیا ہے۔ گویا حضورؐ نے اس شخص کو بتا دیا کہ فکر مند ہونے کے بجائے اللہ کا شکر ادا کرو کہ ان برے خیالات کو تم وسوسے سمجھتے ہو اور ان کو زبان پر لانا تمہیں کسی صورت گوارا نہیں۔

رحمتِ عالم ﷺ نے ایسے وسوسوں کا حتمی علاج بھی اس اُمت کو بتا دیا ہے صحیحین کی ایک اور حدیث میں آپؐ کا یہ ارشاد نقل ہوا ہے کہ لوگوں میں ہمیشہ فضول سوالات اور چون وچرا کا سلسلہ جاری رہے گا یہاں تک کہ یہ احمقانہ سوال بھی کیا جائے گا کہ اللہ نے سب مخلوق کو پیدا کیا تو پھر اللہ کو کس نے پیدا کیا ہے؟ پس جس کو اس سے سابقہ پڑے وہ یہ کہہ کر بات ختم کر دے کہ اللہ پر اور اس کے رسولؐ پر میرا ایمان ہے۔

مطلب یہ کہ مومن کا طرزِ عمل ایسے وسوسوں کے بارے میں یہ ہونا چاہیے کہ وہ سوال کرنے والے یا وسوسہ ڈالنے والے یا اپنے نفس سے صاف کہہ دے کہ اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان کی روشنی مجھے نصیب ہو چکی ہے اس لیے میرے نزدیک یہ سوال ایسا ہی لایعنی ہے۔ جس طرح کسی آنکھ والے سے یہ سوال کرنا حماقت ہے کہ سورج میں روشنی ہے یا نہیں۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں وسوسوں کے شر سے بچائے اور کسی حالت میں بھی ان کو ہماری زبانوں پر نہ آنے دے۔

آزادیٔ نسواں یا تبرُّجِ جاہلیّہ

یہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ مغرب سے اٹھنے والی ''تحریکِ نسوانیت یا تحریک آزادیِ نسواں'' (Feminist Movement) نے گزشتہ ایک صدی کے اندر نہ صرف سارے یورپ اور امریکہ کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے بلکہ اس نے اکثر ایشیائی اور افریقی ممالک میں بھی اپنے پنجے گاڑ لیے ہیں۔ ان میں نہ صرف اشتراکی بلکہ بہت سے مسلمان ممالک بھی شامل ہیں۔ یہ تحریک جواب تہذیبِ مغرب کا جزوِ لاینفک بن چکی ہے، اس کے عالم آشکارا اغراض و مقاصد یہ ہیں کہ عورت کو معاشرتی، اقتصادی، سیاسی غرض زندگی کے ہر شعبے میں وہی حقوق حاصل ہوں جو مردوں کو حاصل ہیں۔ ان کی شخصی آزادی پر کسی قسم کی قدغن نہ ہو۔ دفتروں اور کارخانوں کی ملازمت ہو یا آزاد تجارتی اور صنعتی پیشے، مختلف قسم کے کھیل ہوں یا دوسرے تفریحی مشاغل، عورت ان سب میں مردوں کے برابر حصہ لینے یا ان کے شانہ بشانہ چلنے کا حق رکھتی ہے۔ ازدواجی زندگی کی ذمہ داریاں، بچوں کی پرورش اور تربیت، خاندان کی خدمت، بزرگوں اور شوہر کا احترام وغیرہ سب دقیانوسی باتیں ہیں۔

اقوامِ مغرب کا دعویٰ ہے کہ (مادّی اعتبار سے) ان کی تحیر خیز ترقی اسی تحریک آزادیٔ نسواں کی مرہونِ مِنّت ہے کیونکہ انہوں نے ہر شعبۂ زندگی میں اپنی خواتین کو مردوں سے مسابقت کا موقع دیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اہلِ مغرب نے گزشتہ ایک صدی میں مادّی اعتبار سے حیرت انگیز ترقی کی ہے لیکن یہ کہنا صحیح نہیں کہ ان کی ترقی محض آزادیٔ نسواں کی بدولت ہے۔ فی الحقیقت اس ترقی کے اور بہت سے اسباب بھی ہیں جن میں بے پناہ قدرتی وسائل اور سائنسی علوم کے حصول کا بے پناہ جذبہ سرِ فہرست ہیں۔ جہاں تک اس تحریک کا تعلق ہے تو اس کے نتیجے میں ان کے ہاں عورتوں کی آزادی اور بے باکی اس حد تک پہنچ چکی ہے کہ ان میں نسائیت کی

پاکیزگی اور اخلاق و عِفّت کی رمق تک باقی نہیں رہی۔ ان میں برائی کا احساس تک مٹ چکا ہے۔ شرم و حیا ان کی آنکھوں سے رخصت ہو چکی ہے اور غیرت کی حیثیت ان کے نزدیک ایک بے معنی لفظ کی ہے۔ بقول مولانا ماہر القادری مرحوم وہاں (یورپ) کے پارکوں، باغوں، چوراہوں اور تفریح گاہوں میں مرد و عورت کے اختلاط کے شرمناک مناظر دیکھ کر ضمیر چیختا ہے کہ یہ انسان نہیں جانور ہیں جنہوں نے خوشنما لباس پہن لیے ہیں۔ انسان سے لغزش اور بھول چُوک ہو سکتی ہے مگر وہ اس قدر بے حیا، اتنا بے شرم اور اس درجہ بے غیرت تو نہیں ہو جاتا، آخر گراوٹ کی کوئی حد تو ہونی چاہیے۔

(ماہنامہ فاران دسمبر 1950ء)

تحریک آزادیٔ نسواں نے مغرب کی عورت کو اخلاقی اعتبار سے جس قعرِ مذلّت میں گرا دیا ہے اس نے صحیح الفکر مغربی مفکّرین اور دانشوروں کو بھی شدید ذہنی کرب میں مبتلا کر دیا ہے اور اب وہ اپنی تحریروں میں عورتوں کی مادر پدر آزادی پر برملا تنقید کر رہے ہیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

لیکن حیرت اور افسوس کا مقام ہے کہ ایک ایسا ملک (اور دنیا کا واحد ملک) جس کی تخلیق کے پیچھے یہ نظریہ کارفرما تھا کہ مسلمان غیروں کی سیاسی، ذہنی اور اقتصادی غلامی سے آزاد ہو کر اسلامی اقدار و افکار کے مطابق زندگی بسر کر سکیں اور اس معاشرے کا ہر فرد اسلام کا انسانِ مطلوب ہو (اور جو لاکھوں جانوں کی قربانی کے بعد مَعرضِ وجود میں آیا) اس کی تخلیق کے فوراً بعد آزادیٔ نسواں یا مغرب زدگی کا فتنہ اس پر پوری قوت سے حملہ آور ہو گیا۔ اس کا بیج ملک کے پہلے وزیر اعظم کی بیگم صاحبہ نے اپوا (APWA آل پاکستان وِمینز ایسوسی ایشن) کی صورت میں بویا۔ اس کے بعد آج تک ہر حکومت اس کی آبیاری کرتی رہی ہے یوں حکومت کی سرپرستی اور ذرائع ابلاغ (بالخصوص ریڈیو اور ٹیلی ویژن) کے بھرپور تعاون کی بدولت یہ فتنہ اب ایک تناور درخت کی شکل اختیار کر چکا ہے۔ اس کی ہولناکی کا اندازہ ٹیلی ویژن پر دکھائے جانے والے ان سوقیانہ پروگراموں سے کیا جا سکتا ہے جو نہایت بیہودہ ڈراموں اور

شرمناک ناچ گانوں پر مشتمل ہوتے ہیں۔ انہیں دیکھ کر یوں معلوم ہوتا ہے کہ ہم نے اخلاقی اور معاشرتی شعبوں میں ترقیِ معکوس کی ہے اور رحمتِ عالم کی بعثت سے پہلے والا ''تبرّجِ جاہلیہ'' کا دور واپس آ گیا ہے۔ وہی تبرّجِ جاہلیہ جس پر اللہ تعالیٰ نے قرآنِ حکیم میں نفرین کی ہے اور اللہ کے رسول ﷺ نے بھی جسے (متعدد احادیثِ صحیحہ میں) سخت ناپسندیدہ بلکہ فعلِ حرام قرار دیا ہے۔

''تبرُّج'' کا لفظ اصل میں بُرج سے ماخوذ ہے۔ ''تبرُّج'' اونچی عمارتوں، بلند و بالا محلوں، قلعوں کی چوٹیوں اور نمایاں تزئین کنگروں کو کہتے ہیں۔ ایک مُتبرّجہ یعنی بے حجاب اور خودنمائی کی دلدادہ عورت ہر نوع کے تصنّع اور تکلّف کو کام میں لا کر اپنے حسن و جمال کے ایک ایک زاویے کو غیر محرم مردوں کے سامنے پیش کرتی ہے، ہر گھورنے والے کو اپنی جانب لطف اندوزی کے لیے اسی طرح راغب کرنا چاہتی ہے جس طرح ایک برج اپنی رفعتِ شان کا اعلان کرتا ہوا ہر دیکھنے والے کی نگاہ کو اپنی جانب ملتفت کر لیتا ہے۔ قرآن و حدیث کی روشنی میں تبرّجِ جاہلیہ کے معنی ہیں عورت کا اپنی زینت، حسن و جمال، اور بناؤ سنگھار کا بے محابا اظہار کرنا، اپنے چہرے مُہرے کے نکھار اور خدوخال کی خوبیوں کا اشتہار دینا، اپنے جسم کے فتنہ خیز ابھار اور اپنے لباس، زیور اور زیب و زینت کی جگہوں کو غیر محرم مردوں کے سامنے ظاہر کرنا اور ہر اس شے کو چھپانے کی کوشش کرنا جو مردوں کی آنکھوں کو ناگوار معلوم ہوتی ہے..... تبرّجِ جاہلیہ عورت کی بے حیائی اور بے غیرتی کی سب سے بڑی نشانی ہے یہ عصمت و عفت کی طرف سے اس کی بے پروائی کی ناقابلِ قدر تردید شہادت ہے۔ یہ تبرج اور بے حیائی اللہ تعالیٰ کے دینِ حق اور شریعتِ اسلامیہ کی کھلی توہین اور تضحیک ہے۔

قرآن میں تو مسلمان خواتین کے لیے واضح حکم ہے۔

وَ قَرْنَ فِیْ بُیُوْتِکُنَّ وَ لَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِیَّةِ الْاُوْلٰی

(سورۃ الاحزاب۔ ۳۳)

"اور اپنے گھروں میں ٹک کر رہو اور قدیم جاہلیت کے زمانے کی سی سج دھج نہ دکھاتی پھرو۔"

یہی نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ نے تو خواتین کو غیر مرد سے بات کرتے ہوئے بھی لوچدار آواز میں گفتگو کرنے سے منع فرمایا ہے۔

فَلَا تَخْضَعْنَ بِالْقَوْلِ فَيَطْمَعَ الَّذِيْ فِيْ قَلْبِهٖ مَرَضٌ (الاحزاب: ۳۲)

"دبی زبان یعنی لوچدار آواز سے بات نہ کیا کرو کہ دل کی خرابی میں مبتلا کوئی شخص لالچ میں پڑ جائے۔"

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے تفہیم القرآن میں سورۃ الاَحزاب کی تفسیر بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

> "یہ ذرا سوچنے کی بات ہے کہ دین عورت کو غیر مرد سے بات کرتے ہوئے بھی لوچدار اندازِ گفتگو اختیار کرنے کی اجازت نہیں دیتا اور اسے مردوں کے سامنے بلا ضرورت آواز نکالنے سے بھی روکتا ہے، کیا وہ کبھی اس کو پسند کر سکتا ہے کہ عورت اسٹیج پر آ کر گائے، ناچے، تھرکے، بھاؤ بتائے اور ناز نخرے دکھائے؟ کیا وہ اس کی اجازت دے سکتا ہے کہ ریڈیو پر عورت عاشقانہ گیت گائے اور سریلے نغموں کے ساتھ فحش مضامین سنا سنا کر لوگوں کے جذبات میں آگ لگائے؟ کیا وہ اسے جائز رکھ سکتا ہے کہ عورتیں ڈراموں میں کبھی کسی کی بیوی اور کبھی کسی کی معشوقہ کا پارٹ ادا کریں؟ یا ہوائی میزبان (Air Hostess) بنائی جائیں اور انہیں خاص طور پر مسافروں کا دل لبھانے کی تربیت دی جائے؟ یا کلبوں اور اجتماعی تقریبات اور مخلوط مجالس میں بن ٹھن کر آئیں اور مردوں سے خوب گھل مل کر بات چیت اور ہنسی مذاق کریں؟ یہ کلچر آخر کس قرآن سے

> برآمد کی گئی ہے؟ خدا کا قرآن تو سب کے سامنے ہے۔ اس میں کہیں اس کلچر کی گنجائش نظر آتی ہو تو اس مقام کی نشان دہی کر دی جائے۔"

مولانا کی یہ تحریر پاکستان میں ٹیلی ویژن آنے سے پہلے کی ہے۔ جب تک وطنِ عزیز میں ٹیلی ویژن نہیں آیا تھا۔ عورتوں کی بے حجابی اور مغرب زدگی کے طوفانِ بدتمیزی کی رفتار قدرے سُست تھی لیکن ٹیلی ویژن آنے کے بعد اس نے جس طرح معاشرے کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے، اسے دیکھ کر حساس اور غیرت مند مسلمانوں کو جس قدر اذیّت ہوتی ہے اس کا لفظوں میں اظہار نہیں ہو سکتا صرف خون کے آنسو ہی اس کو ظاہر کر سکتے ہیں۔ اسلامی جمہوریۂ پاکستان کا ٹیلی ویژن جسے تبلیغِ اسلام، اشاعتِ تعلیم، تطہیرِ اخلاق اور تعمیرِ سیرت و کردار کا سب سے بڑا ذریعہ ہونا چاہیے تھا۔ وہ (اپنے چند دینی اور معلوماتی پروگراموں کو چھوڑ کر) مرد و زن کے آزادانہ اختلاط، بے حجابی اور تہذیبِ مغرب کی آشوب سامانیاں اور برائیاں پھیلانے کا سب سے بڑا آلۂ کار بن گیا ہے۔

آزادیٔ نسواں کی علمبردار مغرب زدہ عورتیں اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کے احکام کی کھلی بغاوت پر اتر آئی ہیں۔ انہوں نے اپنی مادر پدر آزادی کو اپنی ذات تک محدود نہیں رکھا بلکہ قرآنِ حکیم اور احادیثِ مقدسہ میں خواتینؔ کے بارے میں جو احکام وارد ہوئے ہیں وہ ان سے کھلم کھلا بیزاری کا اظہار کر رہی ہیں۔ حیرت تو اس بات پر ہے کہ اس طوفانِ بدتمیزی کے آگے بند باندھنے کے بجائے ملک کے اربابِ حل و عقد نے ہمیشہ اس کی حوصلہ افزائی کی ہے۔ اس کے نتیجے میں وطنِ عزیز میں اُناث و ذکور کا ایک ایسا طبقہ پیدا ہو گیا ہے جس کی فطرت مغربی تہذیب اور مادّی فلسفوں نے مسخ کر دی ہے اور وہ ان ساری حدود و قیود سے آزاد ہو چکا ہے جو اسلامی معاشرے کا طرّۂ امتیاز ہوتی ہیں۔

علامہ اقبالؒ نے عورتوں کی ہوسِ جلوَت کو افکار کی پراگندگی اور ابتری کا

موجب ٹھہرایا ہے۔ فرماتے ہیں ۔

رُسوا کیا اس دَور کو جَلوَت کی ہوس نے
روشن ہے نگہ آیئنۂ دل ہے مکدّر
بڑھ جاتا ہے جب ذوقِ نظر اپنی حدوں سے
ہو جاتے ہیں افکار پراگندہ و ابتر
آغوشِ صدف جس کے نصیبوں میں نہیں ہے
وہ قطرۂ نیساں کبھی بنتا نہیں گوہر

پھر دخترانِ مِلّت کو یہ سبق دیتے ہیں ۔

اگر پندے زِ درویشے پزیری
ہزار اُمّت بمیرد تو نمیری
بتولے باش و پنہاں شو ازیں عصر
کہ در آغوش شبّیرے بگیری

اس میں کوئی شک نہیں کہ مرد و زن کے آزادانہ اختلاط، بے حجابی، عریانی و فحاشی کے فتنۂ عظیم کے بارے میں تمام دینی مکاتبِ فکر اور دینی جماعتیں دو رائیں نہیں رکھتیں، سب کو اس کی مضرت اور اس کے ہولناک نتائج کا احساس ہے مگر یہ دیکھ کر دُکھ ہوتا ہے کہ ابھی تک سوائے گنتی کے چند علمائے کرام اور اصحابِ فکر و نظر کے، دینی جماعتوں نے منظم طریقے سے پوری قوت کے ساتھ اس فتنۂ عظیم کی مزاحمت نہیں کی جبکہ اربابِ اقتدار، مغرب زدہ طبقے اور متعدد بے ضمیر اباحیت پسند صحافیوں کی سرپرستی اور بھرپور تعاون کی بدولت یہ فتنۂ عظیم اللہ تعالیٰ کے غضب کو دعوت دینے کی حد تک پہنچ گیا ہے۔ اب وقت آ گیا ہے کہ تمام دینی جماعتیں یک دل و یک جان ہو کر اس فتنہ کے خلاف پرامن عملی جدوجہد کریں۔ اہلِ پاکستان کی اکثریت میں ابھی تک اللہ کے فضل و کرم سے احساسِ غیرت اور دینی حمیّت باقی ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ یہ

اکثریت اس ہولناک فتنے کے خلاف کسی بھی منظم تحریک کا بھرپور ساتھ دے گی۔ اس تحریک کا پہلا قدم یہ ہونا چاہیے کہ وہ ایسے صالح لٹریچر کی زیادہ سے زیادہ اشاعت کا اہتمام کرے جس میں خواتین کو مؤثر انداز میں بتایا گیا ہو کہ اسلام میں ان کا کیا مقام و مرتبہ ہے، ان کے فرائض و حقوق کیا ہیں اور یہ کہ تبرُّجِ جاہلیہ میں مبتلا عورتیں اسلام کی خواتینِ مطلوب نہیں ہیں بلکہ اسلام کی مطلوب وہ خواتین ہیں جن کو قرآنِ حکیم میں مسلمات، مؤمنات، قانتات، محصنات، ذاکرات، خاشعات، صادقات، صابرات، متصدّقات، صائمات اور حافظات کہہ کر پکارا گیا ہے۔ اس کے برعکس متبرّجہ خواتین کی قرآن و حدیث میں جو تعریف کی گئی ہے اس کی تحقیق وہ خود ہی کر لیں یا کسی عالمِ دین سے پوچھ لیں۔

ہمارے دکھ کی شدت اور بڑھ جاتی ہے جب ہماری تجدّد زدہ / ماڈرن بہنیں اور بیٹیاں اپنی غلط روش کے جواز میں اس قسم کے سوال کرتی ہیں ....

''قرآن میں کہاں لکھا ہے کہ عورتوں کو گھروں میں بند رکھو۔'' واقعی قرآن میں یہ کہیں نہیں ہے کہ عورتوں کو گھروں میں بند رکھو مگر مسلمان خواتین کو یہ حکم ضرور دیا گیا ہے کہ اپنے گھروں میں قرار پکڑو یا ٹِک کر رہو اور لوگوں کو اپنی سج دھج دکھانے کے لیے باہر نہ نکلو.......... جائز ضروریات کے لیے یا جہاد فی سبیل اللہ کے کسی شعبے میں یا تعلیم اور خدمتِ خلق وغیرہ کے شعبوں میں حصہ لینے سے تو اسلام منع نہیں کرتا اور پھر قرآن میں یہ کہاں لکھا ہے کہ بن ٹھن کر ٹی وی پر آؤ، ناچو گاؤ ڈراموں میں غیر مردوں سے عشق لڑاؤ یا ان کی بیوی اور محبوبہ بنو، نا کتخدا ہوتے ہوئے بھی زچّہ اور بچوں کی ماں بنو، ہاکی کرکٹ اور جمناسٹک کے کھیلوں میں حصہ لو، اشتہاروں میں ماڈل گرل بن کر ناز نخرے دکھاؤ۔ راگ رنگ کے مخلوط اجتماعات میں شریک ہو کر فحش گانوں پر تالیاں بجاؤ۔

کاش ہماری یہ بہنیں اور بیٹیاں تہذیبِ مغرب کو اپنانے سے پہلے یہ معلوم کر لیتیں کہ اسلام نے انہیں ماں، بہن، بیٹی اور بیوی ہر حیثیت سے کتنا بلند مقام اور مرتبہ دیا ہے اور ساتھ ہی ان کو اتنے شاندار حقوق دیے ہیں کہ کسی دوسرے معاشرے

میں ان کا تصوّر بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اس وقت ضرورت ہے کہ مادّی قوت کے ساتھ ہم اپنے اندر ایمانی قوت بھی پیدا کریں کہ فی الوقت یہی قوت دین اور دنیا میں ہماری کامیابی کی ضامن ہے اور یہ قوت ہمیں اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کے احکام پر عمل کرنے ہی سے حاصل ہو سکتی ہے۔

فضائے بَدُر پیدا کَر فرشتے تیری نُصرت کو
اُتَر سکتے ہیں گردُوں سے قطار اندر قطار اب بھی
(ظفر علی خانؒ)

ملاوٹ

ایک بدترین گناہ

''ملاوٹ'' کا مفہوم تو بڑا وسیع ہے لیکن عام طور پر کسی گراں قیمت کی چیز میں کسی سستی چیز کے ملانے کو ملاوٹ کہتے ہیں مثلاً خالص دودھ میں پانی ملانا، خالص (دیسی) گھی میں چربی یا بناسپتی گھی ملانا۔ پسی ہوئی مرچوں میں اینٹوں یا لکڑی کا برادہ ملانا، چنے کے چھلکوں کو ایک خاص طریقے سے چائے کی پتی میں ملانا وغیرہ وغیرہ۔

ملاوٹ کی ایک اور قسم یہ ہے کہ کسی جنس کی اچھی قسم میں اُسی جنس کی ناقص، گھٹیا یا عیب دار قسم ملانا۔ ملاوٹ کی کوئی بھی قسم ہو اس کا مقصد ناجائز منافع کمانا ہوتا ہے۔ اس ناجائز منافع کی مقدار اکثر اوقات اتنی بڑھ جاتی ہے کہ ملاوٹ کرنے والا لالچ میں اندھا ہو جاتا ہے اور دولت کمانے کی انتہائی بڑھی ہوئی ہوس اسے مجبور کرتی ہے کہ ہر خطرے کو مول لے کر یا انتظامیہ کے بددیانت کارندوں کو رشوت دے کر ملاوٹ کا کاروبار جاری رکھے۔ ملاوٹ خواہ کھانے پینے کی چیزوں میں کی جائے یا دوسری اشیا میں، ہر صورت میں بدترین گناہ ہے لیکن افسوس صد افسوس کہ آج کل وطنِ عزیز میں ملاوٹ ایک ''منافع بخش'' کاروبار یا تجارت کی صورت اختیار کر گئی ہے اور ملاوٹ شدہ یا جعلی اشیا تجارتی منڈیوں (مارکیٹوں) میں کھلم کھلا فروخت ہو رہی ہیں۔ یہ دیکھ کر اور بھی دُکھ ہوتا ہے کہ ملاوٹ کا کاروبار کرنے والوں میں ایسے لوگ بھی شامل ہیں جن کا دعوٰی ہے کہ وہ اللہ اور رسولؐ سے محبت رکھتے ہیں اور ارکانِ اسلام کی سختی سے پابندی کرتے ہیں (نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ) لیکن یہ گھناؤنا کاروبار کرتے ہوئے ان کے ضمیر میں ذرا سی چبھن بھی محسوس نہیں ہوتی حالانکہ ملاوٹ کا کاروبار کئی برائیوں کا مجموعہ ہے مثلاً:

۱۔ دوسروں کو فریب دینا یا دھوکے بازی

۲۔ بددیانتی
۳۔ جھوٹ
۴۔ حرام خوری
۵۔ دوسروں کی صحت برباد کرنا (کھانے پینے کی ملاوٹ شدہ ناقص چیزیں کھِلا پلا کر)

اسلام میں ان میں سے کسی بھی برائی کا ارتکاب سخت گناہ ہے۔ ملاوٹ کرنے والا ان سب برائیوں کا مرتکب ہوتا ہے۔ اس سے اُس کے گناہ کی سنگینی کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ کسی چیز میں ملاوٹ کرنے سے وہ چیز عیب دار ہوجاتی ہے اور کوئی عیب دار چیز فروخت کرنا جائز نہیں جب تک خریدنے والے کو اس کا عیب بتلا نہ دیا جائے۔ جو ایسا نہیں کرے گا وہ اللہ کے غضب کو دعوت دے گا۔ اس سلسلے میں ہادیِ اکرم ﷺ کے ارشادات ملاحظہ ہوں:

> حضرت واثلہ بن اُسقع رضی اللہ تعالیٰ عنہُ سے روایت ہے کہ میں نے خود سنا، رسول اللہ ﷺ ارشاد فرماتے تھے کہ جس شخص نے کوئی عیب دار چیز کسی کے ہاتھ فروخت کی اور خریدار کو وہ عَیب بتلا نہیں دیا تو اس پر ہمیشہ اللہ کا غضب رہے گا یا آپؐ نے یہ فرمایا کہ اللہ کے فرشتے ہمیشہ اس پر لعنت کرتے رہیں گے۔
>
> (سنن ابنِ ماجہ)

> حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہُ سے روایت ہے کہ ایک دفعہ رسول اللہ ﷺ غلّہ کے ایک ڈھیر کے پاس سے گزرے جو ایک دکاندار کا تھا۔ آپؐ نے اپنا ہاتھ اس ڈھیر کے اندر داخل کیا تو آپؐ کی انگلیوں نے گیلا پن محسوس کیا آپؐ نے اس

غلّہ فروش دکاندار سے فرمایا، تمہارے ڈھیر کے اندر یہ تَری کیسی ہے؟

اس نے عرض کیا، غلّہ پر بارش کی بوندیں پڑ گئی تھیں (تو میں نے اوپر کا بھیگ جانے والا غلّہ نیچے کر دیا اور خشک غلّہ اس کے اوپر) آپؐ نے فرمایا، تم نے اس بھیگے ہوئے غلّہ کو اوپر کیوں نہ رہنے دیا تا کہ خریدنے والے لوگ اس کو دیکھ سکتے۔ (سُن لو) جو آدمی دھوکے بازی کرے (دوسروں کو دھوکا دے) وہ ہم میں سے نہیں ہے۔ (صحیح مسلم)

طبرانیؒ نے معجمِ کبیر اور معجمِ صغیر میں یہی واقعہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہٗ سے روایت کیا ہے اس کے آخر میں ان الفاظ کا اضافہ ہے:

”اس طرح کی دغابازی اور فریب کا انجام جہنّم ہے“ (معارف الحدیث جلد ہفتم)

اس میں کوئی شک نہیں کہ ملاوٹ کے ذریعے مال کمانا ناجائز ہے اور ناجائز ذریعے سے کمایا ہوا مال مطلق حرام ہے..... حرام مال کی نحوست اور بد انجامی کو رسولِ اکرم ﷺ نے اس طرح بیان فرمایا ہے:

> ” حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہٗ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ایسا نہیں ہوتا کہ کوئی بندہ (کسی ناجائز طریقے سے) حرام مال کمائے اور اس میں سے لِلّٰہ صدقہ کرے تو اُس کا صدقہ قبول ہو اور اس میں سے خرچ کرے تو اس میں (اللہ تعالیٰ کی طرف سے) برکت ہو اور جو شخص حرام مال (مرنے کے بعد) پیچھے چھوڑ کر جائے گا تو وہ اس کے لیے جہنّم کا توشہ ہی ہوگا۔ یقیناً اللہ تعالیٰ بدی کو بدی سے نہیں

مٹاتا بلکہ بدی کو نیکی سے مٹاتا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ گندگی گندگی کو نہیں دھو سکتی۔ (معارف الحدیث جلد ۷ بحوالہ مسندِ احمد)

ملاوٹ کی طرح ماپ تول میں کمی بھی بدترین گناہ ہے۔ اس طریقے سے کمایا ہوا مال بھی مطلق حرام ہوگا۔ قرآنِ حکیم اور احادیثِ نبویؐ میں اس کے لیے سخت وعیدیں آئی ہیں۔ ملاوٹ کے مرتکب کی طرح اس کے مرتکب کی عاقبت بھی برباد ہو جائے گی۔

ناجائز ذرائع سے حرام مال کمانے والوں کے برعکس جائز ذرائع سے حلال رزق کمانے والوں کو آخرت میں بہت بلند درجہ حاصل ہوگا...... حضرت ابوسعید خُدری رضی اللہ عنہٗ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ پوری سچائی اور ایمانداری کے ساتھ کاروبار کرنے والا تاجر نبیوں اور صِدِّیقوں اور شہیدوں کے ساتھ ہوگا۔ (جامع ترمذی، سنن دارمی)

آج کل بازار میں ایسی نقلی اور جعلی اشیا بھی فروخت ہورہی ہیں کہ اگر ان کو اصلی چیزوں کے ساتھ رکھ دیا جائے تو اصلی اور نقلی میں تمیز کرنا محال ہے مثلاً مصنوعی زعفران، ساگودانہ، مُشک، عنبر، شکر سے بنا ہوا شہد، پھلوں کے ایسے شربت جن میں مبیّنہ پھلوں کے رس کا ایک قطرہ بھی شامل نہ کیا گیا ہو، مصنوعی روغنِ بادام، دارچینی وغیرہ وغیرہ۔

ان چیزوں کا کاروبار کرنے والے اسی طرح کے مجرم ہیں جیسے ملاوٹ کا کاروبار کرنے والے۔ ملاوٹ، ماپ تول میں کمی اور جعلی (نقلی) اشیا کو اصلی ظاہر کر کے بیچنے جیسی برائیاں ہمارے معاشرے کا ناسور بن چکی ہیں۔ اگرچہ ان کا ارتکاب ملکی قوانین میں بھی جُرم ہے لیکن ان کا مرتکب کوئی مجرم شاید ہی کبھی قانون کی گرفت میں آیا ہو۔ اس کا سبب یہ ہے کہ حکومت کی طرف سے جو لوگ ایسے جرائم کی روک تھام کے لیے مقرر کیے جاتے ہیں وہ اپنے فرائض دیانت داری کے ساتھ انجام نہیں

دیتے اور بددیانت تاجروں کے ساتھ مل جاتے ہیں۔ ایسے جرائم کا انسداد صرف اسی صورت میں ہوسکتا ہے کہ ملک میں اسلامی نظام قائم ہو اور متعلقہ قوانین کا پوری قوّت سے نفاذ کیا جائے۔ جب تک یہ نظام قائم نہیں ہوتا، علماءِ کرام اور اصلاحِ معاشرہ کا کام کرنے والے اصحاب (بشمول خواتین) کو چاہیے کہ ان برائیوں کے انسداد کے لیے اپنی پوری توانائیاں صَرف کردیں۔ حکومت کا بھی فرض ہے کہ وہ ایسے بھیانک جرائم کا قلع قمع کرنے کے لیے کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کرے۔

جہیز کی بیماری

ہمارے معاشرے میں جن رسموں نے غریب اور متوسط طبقے کے لوگوں کی زندگی اجیرن کر رکھی ہے ان میں سے ایک رسم جہیز کی ہے۔ جہیز اس سامان کو کہتے ہیں جو کسی لڑکی کی شادی کے موقع پر اس کے والدین یا سرپرست اس کو دیتے ہیں۔ اس میں زیورات، کپڑے، فرنیچر وغیرہ سبھی کچھ شامل ہے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ لڑکی کے والدین یا سرپرست قانونی، اخلاقی یا مذہبی طور پر قطعاً اس بات کے پابند نہیں کہ وہ لڑکی کو جہیز کے نام سے کوئی چیز دیں۔ ہاں اگر وہ اپنی حیثیت کے مطابق کچھ سامان اپنی خوشی سے خاموشی کے ساتھ لڑکی کو دے دیں تو اس پر کوئی اعتراض کی گنجائش نہیں۔ لیکن بدقسمتی سے یہاں یہ ہو رہا ہے کہ لڑکے والے باقاعدہ ایسے جہیز کا مطالبہ کرتے ہیں جس میں باقاعدہ بڑی بڑی چیزیں شامل ہوتی ہیں مثلاً ٹیلی ویژن سیٹ، ریڈیو، ریفریجریٹر، زیورات، سکوٹر وغیرہ وغیرہ۔ ایسا کرتے وقت لڑکی والوں کی حیثیت کا بالکل خیال نہیں کرتے اور ان کی مجبوری کا فائدہ اٹھاتے ہیں۔ دوسری طرف امیر اور خوشحال لوگ اپنی بیٹیوں کی شادی میں ہزاروں لاکھوں کی اشیاء جہیز میں دیتے ہیں اور ان کی خوب نمائش کرتے ہیں۔ جہیز کی یہ نمود و نمائش ایک غریب اور متوسط طبقے کے آدمی کو یہ سوچنے پر مجبور کر دیتی ہے کہ اگر وہ اپنی بچی کی شادی پر زیادہ سے زیادہ جہیز نہ دے گا تو معاشرے اور برادری میں اس کی ناک کٹ جائے گی۔ سوچنے کا یہ انداز لوگوں کو رسمی اور نمائش کے کاموں پر ابھارتا ہے جس کے نتیجے میں لوگ حیثیت نہ ہونے کے باوجود جہیز کا وافر سامان فراہم کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ شادی کی تقریب میں کیا امیر اور کیا غریب، جہیز کی باقاعدہ نمائش کر کے لوگوں کو دکھاتے ہیں تا کہ ان کو خوب داد ملے۔ جس لڑکی کا باپ جہیز دینے کی استطاعت نہیں رکھتا وہ سخت ذہنی پریشانی میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ کیونکہ ایک سلیقہ شعار، صحتمند اور

قبول صورت لڑکی کے لیے بھی جہیز کے بغیر رشتہ ملنا مشکل ہوتا ہے۔ باپ مجبوراً قرض لے کر اپنی بیٹی کے لیے جہیز کا سامان فراہم کرتا ہے۔ اس کے نتیجے میں اس کی معاشی حالت خراب ہو جاتی ہے اور بعض مرتبہ سخت ناخوشگوار واقعات پیش آتے ہیں۔

لڑکے والوں کے لیے لڑکی والوں سے جہیز کا مطالبہ کرنا سخت گھٹیا حرکت ہے۔ بعض اوقات وہ لڑکی والوں سے ایسی ایسی چیزوں کا مطالبہ کرتے ہیں جن کا مہیا کرنا ان کی استطاعت سے باہر ہو جاتا ہے لیکن حالات انہیں یہ مطالبہ پورا کرنے پر مجبور کر دیتے ہیں خواہ اس کے لیے انہیں کتنی ہی بھاری قیمت ادا کرنی پڑے۔ ہونا تو یہ چاہیے کہ ایسے مطالبے کرنے والوں کو منہ ہی نہ لگایا جائے کیونکہ لالچ کی کوئی حد نہیں ہوتی۔ جو لوگ لڑکی جیسی دولت لے کر خوش نہیں ہوئے انہیں سب کچھ دے دلا کر بھی اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ لڑکی ایسے لالچی سسرال میں خوش رہے گی۔ اگر ہمارا معاشرہ باشعور ہو تو ایسے لالچی لوگوں کو کبھی نہ بھولنے والا سبق دیا جا سکتا ہے۔ اس قسم کی ایک عمدہ مثال حال ہی میں سننے میں آئی ہے۔

پنجاب کے ایک گاؤں میں ایک نوجوان نے اپنے ہونے والے خسر سے جہیز میں سکوٹر کا مطالبہ کیا۔ لڑکی اور اس کے والدین نے اس پر ناگواری کا اظہار کیا اور عین تقریب نکاح کے وقت شادی سے انکار کر دیا۔ گاؤں کے لوگوں نے بھی ان کا ساتھ دیا۔ مجبوراً دولہا اور برات کو ذلیل ہو کر شادی کے بغیر واپس جانا پڑا۔

ایک عجیب صورت یہ بھی دیکھنے میں آئی ہے کہ بعض والدین جہیز کا سامان نہ ہونے پر اپنی لڑکی کے لیے سخت پریشان رہتے ہیں لیکن جب ان کے اپنے بیٹے کی شادی کا مسئلہ سامنے آتا ہے تو ایسی لڑکی ڈھونڈتے ہیں جو زیادہ سے زیادہ جہیز لے کر اپنے ساتھ آئے۔ گویا وہ جس چیز کو اپنے پر بار سمجھتے ہیں دوسروں سے اسی کا مطالبہ کرنے لگتے ہیں۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو ان کا رَوِیّہ اخلاقی لحاظ سے سخت ناپسندیدہ ہے۔ جو چیز ہم اپنے لیے پسند نہیں کرتے دوسروں کے لیے اس کو پسند کرنا کہاں کا انصاف ہے؟

حقیقت میں جہیز ایک بیماری ہے جو انسان کے جذبات اور اس کے اخلاق پر بری طرح اثر انداز ہوتی ہے۔ اچھے جذبات کی پرورش اور اخلاق کی تعمیر کے لیے ضروری ہے کہ دکھاوے کے کاموں سے پرہیز کیا جائے اور جہیز کو نمود و نمائش کا ذریعہ نہ بنایا جائے۔ دکھاوا اللہ کو بھی پسند نہیں۔ وہ تو صرف ان کاموں کو پسند کرتا ہے جو حقیقتاً بھلائی کے کام ہوں اور خلوص کے ساتھ انجام دیے گئے ہوں۔ باپ اگر صاحب حیثیت ہے تو وہ اپنی بیٹی کو بہت کچھ دے سکتا ہے۔ لیکن یہ ضروری نہیں کہ سب کچھ شادی کے موقع پر ہی دے اور اس کی نمائش کر کے غریب والدین کے لیے مشکلات پیدا کی جائیں۔ باپ اپنی زندگی میں کسی وقت بھی اپنی بیٹی کو جو چاہے دے سکتا ہے اور مرنے کے بعد تو بیٹی ویسے ہی باپ کی وراثت میں شریک ہوتی ہے اس لیے یہ خیال کرنا بالکل غلط ہے کہ شادی کے موقع پر باپ نے بیٹی کو کچھ کم دیا تو بعد میں دینے کا موقع نہ ہوگا یا جہیز دینے کے بعد لڑکی باپ سے ورثہ نہیں پائے گی۔ اسلام کی رو سے وہ ہر حال میں ورثہ پانے کی حقدار ہے خواہ باپ نے اسے جہیز دیا ہو یا نہ دیا ہو۔

اس معاملے کے ایک اور پہلو پر غور کیجیے کہ مرد جب جہیز کا مطالبہ کرتا ہے اور فرمائشوں کی فہرست ہونے والے سسرال کے سامنے رکھ دیتا ہے تو حقیقت میں وہ اپنے آپ کو اپنے اصل مقام سے گرا دیتا ہے کیونکہ شوہر کا مقام یہ ہے کہ وہ بیوی پر خرچ کرے۔ اس کا مہر ادا کرے اور اس کا نان نفقہ بھی پورا کرے لیکن جہیز کا مطالبہ اس کے بالکل برعکس ہے اور مرد کے لیے بڑی بے غیرتی کی بات ہے کہ ایسا مطالبہ کر کے دینے کے مقام سے اتر کر لینے یا مانگنے کے مقام پر آ جائے۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ گزشتہ سالوں میں جہیز کی خرابیوں کو حکومت کی سطح پر شدت سے محسوس کیا گیا اور ان پر قابو پانے کے لیے قانون کا سہارا لینے کی کوشش بھی کی گئی لیکن اس کا کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔ دراصل اس بیماری کا علاج قانون کے ذریعے ہونا مشکل ہے۔ اس کے لیے عوام کے شعور کو بیدار کرنے، جہیز کی برائیوں کی تشہیر کرنے اور اس کے خلاف منظم تحریک چلانے کی ضرورت ہے۔ صرف عوامی دباؤ

ہی کے ذریعے اس بیماری کی روک تھام کی جاسکتی ہے۔ اگر عوام جہیز کا مطالبہ کرنے والے اور جہیز کی نمائش کرنیوالے دونوں قسم کے لوگوں سے نفرت کا اظہار کریں تو آہستہ آہستہ یہ بیماری خود بخود ختم ہو جائے گی۔

مجموعی طور پر پاکستانی معاشرہ ایک مسلمان معاشرہ ہے۔ اس لیے ہم میں سے ہر ایک کو رسولِ اکرمؐ کا یہ ارشاد ہمیشہ اپنے پیشِ نظر رکھنا چاہیے کہ ”جس نکاح میں جتنا کم خرچ کیا گیا ہو اتنا ہی وہ نکاح خیر و برکت کا باعث ہوگا۔ (مشکوٰۃ)

بعض لوگ جہیز کے جواز میں یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنی بیٹی حضرت فاطمۃ الزاہراؓ کو جہیز دیا تھا۔ یہ دلیل صحیح نہیں ہے کیونکہ حضور ﷺ نے حضرت فاطمہؓ کو ضرورت کی چند چیزیں مشکیزہ، چکیاں، کھجور کے پتوں سے بھرا ہوا گدا وغیرہ دی تھیں جنکی موجودہ زمانے کے رسمی جہیز سے کوئی نسبت ہی نہیں۔ چونکہ حضرت علیؓ کے پاس گھر بار نہیں تھا اس لیے ضرورتاً آپؐ نے یہ چیزیں عنایت فرمائیں۔ حضرت عائشہؓ کا نکاح اس سادگی کا حقیقی تصور تھا جو اسلام پیدا کرنا چاہتا ہے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے ان کو کوئی جہیز نہیں دیا۔ دراصل صحابہء کرامؓ کے زمانے میں جہیز کا تصوّر تک نہ تھا۔

غرض جہیز کی جو رسم رائج ہو گئی ہے اور جس بنا پر لڑکے والے لڑکی والوں سے طرح طرح کی چیزوں کا مطالبہ کرتے ہیں اس کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں۔ جہیز کی رسم یقیناً ایک بیماری ہے اور اس سے نجات پانے کے لیے ہم سب کو کوشش کرنی چاہیے۔ لڑکے والوں کو کسی قسم کا مطالبہ نہیں کرنا چاہیے۔ اسی طرح لڑکی والوں کو چاہیے کہ جو لوگ جہیز کا مطالبہ کریں ان کو لڑکی نہ دیں۔ لڑکی والے اگر اپنی خوشی سے کچھ سامان لڑکی کے ساتھ کر دیں تو اس کی نمود و نمائش ہرگز نہ کریں۔ دوسری طرف لڑکے والے لڑکی کو جہیز کم لانے کا طعنہ کبھی نہ دیں بلکہ لڑکی ہی کو سب سے بڑی دولت سمجھیں اور اس کو اپنی بیٹی کا درجہ دیں۔ اسی طرح معاشرہ کی صحت مند بنیادوں پر تعمیر ہو سکتی ہے۔

مُردوں کو بُرا مت کہو

صحیح بخاری میں اُمّ المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ لَا تَسُبُّو الْاَمْوَاتَ فَاِنَّھُمْ قَدْ اَفْضَوْا اِلٰی مَاقَدَّمُوْا:

”یعنی رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ تم مُردوں کو بُرا مت کہا کرو کہ بے شک انہوں نے جیسا بھی عمل کیا اس کو پہنچ گئے“۔

اس حدیثِ پاک میں سرورِ عالم ﷺ نے بطورِ خاص مُردوں کو برا کہنے سے اس لیے منع فرمایا ہے کہ مرنے کے ساتھ ہی ان کا دنیا سے تعلق ٹوٹ چکا اب ان کا معاملہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہے اگر انہوں نے دنیا میں اچھا عمل کیا ہے تو اس کا انہیں اچھا بدلہ دیا جائے گا اور اگر بُرا عمل کیا ہے تو اس کا بُرا بدلہ دیا جائے گا جیسا کہ قرآنِ حکیم میں ارشاد ہوا ہے:۔

فَمَنْ یَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّۃٍ خَیْرًا یَّرَہٗ ؕ۝
وَمَنْ یَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّۃٍ شَرًّا یَّرَہٗ ؕ۝

”یعنی جس نے ذرّہ بھر نیکی کی ہوگی وہ اس کو دیکھ لے گا“
”اور جس نے ذرّہ بھر برائی کی ہوگی وہ اسے دیکھ لے گا“

فی الحقیقت اسلام کی اخلاقی تعلیمات میں بدگوئی، بدگمانی، عیب چینی، طعنہ زنی، تجسّس اور تمسخر کو نہایت بُرے خصائل قرار دیا گیا ہے۔ کسی زندہ و سلامت آدمی پر سب وشتم کرنا تو کُجا اسلام نے کُفّار کے سامنے ان کے بتوں کو بھی بُرا کہنے سے منع کیا ہے کہ مبادا وہ اس کے جواب میں ہمارے سچے خدا کو بُرا کہیں اور جب کوئی آدمی مرجائے تو اس کا اپنے اعزّہ و اقرباء سے کوئی تعلق باقی رہتا ہے نہ دوستوں سے

نہ دشمنوں سے اور نہ دنیا کے کسی اور معاملے سے، اب نہ وہ اپنی مدافعت کر سکتا ہے نہ اپنے خلاف کسی بات کا جواب دے سکتا ہے اس لیے اس کو بُرا کہنا عَبَث محض ہے۔ بلکہ کسی مرنے والے کو برائی سے یاد کرنے میں کئی خطرات مُضمر ہیں۔ ہوسکتا ہے اللہ تعالیٰ نے اسے کسی نیکی پر بخش دیا ہو۔ اب اس کو بُرا کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ غفور الرّحیم پر اعتراض کر رہے ہیں اس نے تو اپنے بندے کی مغفرت کر کے اسے اچھوں میں شامل کر لیا ہے، لیکن ہم اس کو منشائے الٰہی کے خلاف بُروں میں شامل کر رہے ہیں ظاہر ہے کہ یہ بڑے گناہ کی بات ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ ہم جس ظاہری سبب کی بناء پر کسی مرنے والے کو برا بھلا کہہ رہے ہوں، وہ اس میں معذور ہو اور اس کے عذر یا مجبوری کا ہمیں علم ہی نہ ہو۔ اس کی مثال یوں سمجھئے کہ مرنے والا نماز ادا کرنے کے لیے مسجد میں نہ آتا تھا اور اس کا سبب اس کی کوئی ایسی جسمانی بیماری تھی جس کو وہ ظاہر نہیں کر سکتا تھا جیسے پسینے میں بدبو، سر چکرانا، ٹانگوں میں درد یا کمزوری وغیرہ اب ہم اگر یہ کہہ کر اس کی برائی کریں کہ فلاں شخص بے نماز تھا، وہ مسجد میں نہ آتا تھا، فاسق تھا وغیرہ وغیرہ تو یہ بڑی زیادتی ہوگی۔ ہوسکتا ہے کہ وہ شخص اپنی سہولت کے مطابق گھر نماز پڑھ لیتا ہو اور رب کریم سے مغفرت طلب کرتا رہتا ہو۔ اب اس کا معاملہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہے تو ہم اس کو برائی سے یاد کر کے غیبت اور بدگمانی کے مرتکب کیوں ہوں؟ اسی لئے حُضور ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے کہ کسی شخص کے ظاہری اعمال کی بناء پر اس کو حتمی طور پر جنّتی یا جہنمی قرار نہ دو، ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو کسی ایسے عمل کی بنا پر جو تمہاری نگاہوں سے پوشیدہ ہو، بخش دے یا سزا دے۔

امام جلال الدین سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب ''شرح الصدُور'' میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ میّت کی خوبیوں کا ذکر کرو اور برائیوں سے اپنی زبان بند رکھو۔

مطلب یہ ہے کہ ہر انسان میں خوبیاں بھی ہوتی ہیں اور خامیاں بھی۔ بہتر یہ ہے کہ اس کی خامیوں کو نظر انداز کر دیا جائے اور خوبیوں کا ذکر کیا جائے۔ شاید

رحمتِ خداوندی کو جوش آجائے اور مرنے والے کا ذکرِ خیر ہی اس کی مغفرت کا سبب بن جائے۔

حضور ﷺ رحمتِ دوجہاں اور معلمِ انسانیت تھے آپؐ نے نہ صرف اپنے زندہ بھائیوں سے حُسنِ سلوک کی تعلیم دی ہے بلکہ اس دنیا سے گزر جانے والوں کا بھی احترام کرنا سکھایا ہے یہاں تک کہ کافروں کی لاشوں کی بھی بے حرمتی کرنے کی اجازت نہیں دی۔ عرب میں رواج تھا کہ دشمن کی لاش کا مُثلہ کرڈالتے تھے یعنی اس کے ہونٹ، ناک اور کان وغیرہ کاٹ ڈالتے تھے اور بعض دوسرے اعضاء کو بھی بگاڑ دیتے تھے حضورؐ نے اس کو نہایت بُری حرکت قرار دیا اور سختی سے اس کی ممانعت فرمائی۔

غزوۂ بدر میں کفار کے ستر آدمی مارے گئے یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے آپؐ اور آپؐ کے صحابہؓ کو ستانے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی تھی یہاں تک کہ آپؐ کو اور آپؐ کے نام لیواؤں کو اپنا گھر بار اور وطن چھوڑنا پڑا تھا آپؐ چاہتے تو ان کی لاشیں کتوں، درندوں اور چیلوں کے لیے چھوڑ سکتے تھے لیکن آپؐ کی شانِ رحیمی کو یہ گوارا نہ ہوا۔ ان سب کی لاشوں کو ایک بڑے کنوئیں میں ڈال کر اس کو مٹی سے بند کرا دیا اور پھر ان کو برا بھلا کہنے کے بجائے صرف یہ ارشاد فرمایا کہ اے فلاں اے فلاں تم نے دیکھ لیا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنا وعدہ سچا کر دکھایا۔

ایک لڑائی میں ایک مسلمان نے کسی مقتول کافر کی لاش کا مُثلہ کرنا چاہا۔ حضورؐ کو معلوم ہوا تو آپ سخت ناراض ہوئے اور فرمایا ایسا کرو گے تو کیا خبر اللہ تعالیٰ آخرت میں تمہارے اعضاء بھی بگاڑ دے۔

ایک مرتبہ حضورؐ کسی جگہ تشریف فرما تھے کہ آپؐ کے سامنے سے ایک جنازہ گزرا۔ آپؐ احتراماً کھڑے ہوگئے۔ صحابہ کرامؓ نے عرض کیا ''یا رسول اللہ یہ جنازہ تو ایک یہودی کا تھا۔'' حضورؐ نے فرمایا ''تو کیا ہوا وہ بھی تو ایک جان تھی''۔ یہ تھی شرف انسانیت کی معراج جس کا نمونہ رحمتِ دوعالم ﷺ نے دنیا کے سامنے پیش کیا۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں حضورؐ کے اُسوۂ حَسَنہ پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے اور ہماری زبانوں کو مُردوں کی برائیاں بیان کرنے سے آلودہ نہ ہونے دے۔

آمین ثم آمین

☆☆☆☆☆

حدیثِ نبویؐ

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، لوگو! تمہیں معلوم ہے کہ غیبت کیا ہے۔ انہوں نے عرض کیا کہ اللہ اور اس کا رسولؐ بہتر جانتے ہیں۔ آپؐ نے فرمایا، غیبت یہ ہے کہ تو اپنے بھائی کی وہ بات اس کے پسِ پُشت بیان کرے جس سے وہ ناخوش ہو۔ کسی نے عرض کیا، اگر میرے بھائی میں وہ (بری) بات موجود ہو جو میں کہتا ہوں تو پھر کیا حکم ہے۔ آپؐ نے فرمایا، اگر اس میں واقعی وہ بات موجود ہے جو تو کہتا ہے تو تُو نے اس کی غیبت کی اور اگر وہ بات اس میں نہیں ہے تو تُو نے اس پر بہتان باندھا۔ (صحیح مسلم)

اپنی زبان پر قابو رکھیے

زبان دیکھنے میں تو گوشت کا ایک چھوٹا سا لوتھڑا ہے لیکن دراصل یہ نفرت اور محبت، دوستی اور دشمنی، سکون اور بے چینی، امن اور فساد کی کنجی اور جڑ ہے۔ اگر اسے ایک منہ زور گھوڑا بنا کر بے لگام چھوڑ دیا جائے تو انسانی معاشرے میں جھگڑے، فساد اور دشمنی کے شعلے بھڑکنے لگتے ہیں اور معاشرہ ایک خطرناک آتش فشاں کی صورت اختیار کر لیتا ہے اور اگر اسی زبان پر قابو رکھا جائے اور اس کو صحیح طریقے سے استعمال کیا جائے تو معاشرے پر نہایت خوشگوار اثر پڑتا ہے اور یہ بھائی چارے، باہمی شفقت، ہمدردی اور محبت کے پرسکون گلزار اور باغ و بہار میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ تاریخ میں ایسی بہت سی مثالیں ملتی ہیں جب کسی ملک کے حکمران نے زبان سے کسی دوسرے ملک کے خلاف کوئی تلخ جملہ نکال دیا تو دونوں ملکوں کے درمیان جنگ کے شعلے بھڑک اٹھے اور ہزاروں قیمتی جانیں ضائع ہو گئیں۔ دوسری جو بربادی ہوئی وہ الگ۔ اس کے برعکس کسی حکمران نے دوسرے ملک کے لیے نیک تمناؤں کا اظہار کیا، اس کے حکمران اور باشندوں کے لئے محبت آمیز الفاظ استعمال کیے تو دونوں ملکوں کے درمیان دوستی اور باہمی تعاون کا خوشگوار رشتہ قائم ہو گیا۔

زبان کا بے قابو ہونا کیا ہے؟ زیادہ ضرورت کے بغیر باتیں کرنا، لغو اور فضول باتیں کرنا، سختی اور تلخی سے بات کرنا، گالی دینا یا بدزبانی کرنا، بات بات پر قَسم کھانا، کسی کی پیٹھ پیچھے اس کی بُرائی کرنا، کسی کے خاندان یا نسب میں کیڑے ڈالنا، کسی کی شکل وصورت، رنگ روپ یا جسمانی ہیئت پر طعنہ زنی کرنا، کسی کو غریبی کا طعنہ دینا اور اپنی بڑائی ظاہر کرنا، بچوں کو ہر وقت ڈانٹ ڈپٹ کرتے رہنا، بڑوں کے ساتھ گستاخی سے پیش آنا، دو رُخی یا دوغلا پن کی بات کرنا، جھوٹ بولنا، ڈینگیں مارنا، چغلی کھانا، کسی پر بہتان باندھنا، دوسروں پر بدگمانی کا اظہار کرنا، کسی پر احسان کر کے اس

کو جتانا، خوشامد کرنا، زبان کے چسکے کی خاطر نقصان دِہ چیزوں کے کھانے پینے سے پرہیز نہ کرنا وغیرہ وغیرہ۔ یہ سب باتیں زبان کے بے قابو ہونے کو ظاہر کرتی ہیں۔

اس کے برعکس زبان پر قابو رکھنا یہ ہے کہ ان سب باتوں سے بچا جائے۔ دوسروں کے ساتھ بڑی میٹھی اور نرم زبان میں گفتگو کی جائے۔ سخت کلامی اور چڑچڑا پن کام بگاڑتا ہے اور شیریں زبانی کام سنوارتی ہے اور دوسروں کا دل جیتتی ہے۔ بڑوں کو ادب اور احترام سے مخاطب کیا جائے۔ اگر آج آپ ان کے ساتھ گستاخی سے پیش آتے ہیں تو کل آپ کے بچے بھی آپ کے ساتھ اسی طرح پیش آئیں گے۔ مثل مشہور ہے، ''جو بوؤ گے سو کاٹو گے''۔ اگر کوئی شخص جو بیج کر یہ امید رکھے کہ گندم کاٹے گا تو اس سے بڑا کوئی احمق نہیں۔

جس طرح بڑوں کا ادب و احترام کیا جائے اسی طرح چھوٹوں پر پیار اور محبت کے پھول برسائے جائیں۔ چھوٹوں پر بے جا سختی کرنا اور ان کے ساتھ رُکھائی اور تلخی سے بات کرنا کبھی اچھے نتائج پیدا نہیں کرتا۔ ہمیشہ سچ بولنے کی کوشش کی جائے کیونکہ جھوٹ سب برائیوں کی جڑ ہے۔

دوسروں کو سلام کرنے میں پہل کی جائے۔ جو آدمی کسی مصیبت میں مبتلا ہو، اس کے ساتھ ہمدردی کی جائے۔ بیمار کے پاس جا کر اس کو تسلی دی جائے اور اس کو خوش کرنے والی باتیں کی جائیں۔ ایسی نہیں جن سے وہ اور پریشان ہو جائے۔ زیادہ اور بے ضرورت باتیں کرنے سے بچا جائے کہ اس سے بہت سی خرابیاں پیدا ہوتی ہیں۔ صرف وہی چیزیں کھائی یا پی جائیں جو صحت کے لیے مضر نہ ہوں۔ محض زبان کے چسکے کے لیے کھٹی میٹھی اور چٹ پٹی چیزوں کا وقت بے وقت زیادہ استعمال نہ کیا جائے بلکہ وقت پر جو کھانا کھایا جائے اس سے بھی قدرے بھوک رکھ کر ہاتھ کھینچ لیا جائے۔

اسلام میں زبان کی حفاظت اور اس کے صحیح استعمال پر زور دیا گیا ہے۔ قرآنِ حکیم میں حکم ہے کہ لوگوں سے اچھے اور عمدہ طریقے سے بات کرو۔ جب جاہل

لوگ تم سے مخاطِب ہوں اور جہالت کی باتیں کریں تو ان سے الجھو اور لڑو نہیں بلکہ کہو کہ ہم تو تمہارے لیے سلامتی کی دعا کرتے ہیں۔ والدین کا اتنا ادب کرو کہ انہیں اُف تک نہ کہو۔ بڑھاپے میں انسان چڑچڑا ہو جاتا ہے۔ جب وہ چڑچڑے پن کا اظہار کریں تو تم خاموش رہو یا نرمی اور محبت سے جواب دو۔ جب غصہ آئے تو اس پر قابو پانے کی کوشش کرو اور اول فول نہ بکو۔ دوسروں کو بڑی محبت اور شفقت کے ساتھ نیکی کی نصیحت کرو اور برے کاموں سے روکو۔ ہمیشہ سچ بولو۔ چغلی، غیبت اور تہمت طرازی سے بچو۔ رسولِ اکرم ﷺ فرمایا کرتے تھے کہ جس چیز سے کسی آدمی کو زیادہ سے زیادہ خطرہ ہوسکتا ہے وہ زبان ہے۔ آپ لوگوں کو اس بات کی بڑی تاکید فرماتے تھے کہ زبان کو قابو میں رکھا جائے اور ہر قسم کی بری باتوں سے بلکہ بے ضرورت اور بے فائدہ باتیں کرنے سے بھی زبان کو روکا جائے اور جب بات کرنے کی کوئی خاص ضرورت نہ ہو اور اس بات سے کسی بہتری اور فائدہ کی امید نہ ہو تو خاموش ہی رہا جائے۔

ایک مرتبہ آپؐ نے فرمایا: کیا میں تم کو ایسے شخص کی خبر نہ دوں جس پر دوزخ کی آگ حرام ہے، یہ ہر ایسا شخص ہے جو مزاج کا تیز نہ ہو، نرم ہو، لوگوں سے قریب ہونے والا ہو، نرم خُو ہو۔

حضرت انس رضی اللہ عنہٗ کہتے ہیں کہ میں مدینہ میں دس سال رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں رہا اور میں نوعمر لڑکا تھا۔ اس لیے میرا ہر کام رسول اللہ ﷺ کی مرضی کے بالکل مطابق نہیں ہوتا تھا لیکن دس سال کی اس مدت میں کبھی آپؐ نے اُف کہہ کے بھی مجھے نہیں ڈانٹا اور نہ کبھی یہ فرمایا کہ تم نے یہ کیوں کیا یا کیوں نہیں کیا۔

رسولِ اکرم ﷺ لوگوں کو ہمیشہ شیریں زبانی اور خوش کلامی کی نصیحت فرماتے تھے اور بدزبانی اور سخت کلامی سے شدت کے ساتھ منع فرماتے تھے یہاں تک کہ بُری بات کے جواب میں بھی بُری بات کہنے کو آپؐ پسند نہیں فرماتے تھے۔ ایک دفعہ چند یہودی آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور شرارتاً کہا ''السَّامُ علیکم'' (جو دراصل ایک

گالی ہے اور جس کا مطلب ہے کہ تم کو موت آئے) حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے ان کے یہ گستاخانہ الفاظ لیے۔ انہوں نے جواب میں کہا: تم ہی کو موت آئے اور تم پر خدا کی لعنت ہو اور اس کا غضب ہو۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اے عائشہ! زبان روکو، نرمی کا رویّہ اختیار کرو اور سختی اور بدزبانی سے اپنے کو بچاؤ۔

حضورؐ جس طرح لوگوں کو شیریں زبان بننے کی تلقین فرماتے تھے، اسی طرح غیبت، چغل خوری، بہتان، دوُرخے پن اور جھوٹ بولنے سے بھی منع فرماتے تھے اور سچ بولنے کی ترغیب دیتے تھے۔ آپ کا ارشاد ہے: اللہ کے بندوں کی پیٹھ پیچھے برائی نہ کیا کرو اور ان کے چھپے ہوئے عیبوں کے پیچھے نہ پڑو ورنہ اللہ تمہیں گھر میں ذلیل کر دے گا۔ بدترین لوگ وہ ہیں جو چغلیاں کھاتے ہیں اور دوستوں میں جدائی ڈالتے ہیں۔ کسی پر بہتان باندھنا غیبت سے بھی بُرا گناہ ہے اور بہتان یہ ہے کہ تم کسی شخص سے ایسی برائی اور عیب منسوب کرو جو اس میں موجود نہیں۔ قیامت کے دن سب سے بُرا حال اس آدمی کا ہوگا جو دوُرخا ہے یعنی کچھ لوگوں کے پاس جاتا ہے تو اس کا رُخ اور ہوتا ہے اور دوسروں کے پاس جاتا ہے تو اور۔

زبان کو جھوٹ سے آلودہ نہ کرنے کے بارے میں آپؐ نے فرمایا ہے کہ جھوٹ سے ہمیشہ بچتے رہو کیونکہ جھوٹ بولنے کی عادت آدمی کو بدکاری کے راستے پر ڈال دیتی ہے اور بدکاری اس کو دوزخ تک پہنچا دیتی ہے۔ تم سچائی کو لازم پکڑو اور ہمیشہ سچ ہی بولو کیونکہ سچ بولنا نیکی کے راستے پر ڈال دیتا ہے اور نیکی جنت تک پہنچا دیتی ہے۔

اللہ اور رسولؐ کے احکام کی روشنی میں ہمارا فرض ہے کہ اپنی زبان کو قابو میں رکھیں اس میں نہ صرف ہماری بلکہ معاشرے کی بہتری بھی ہے۔ زبان کی نرمی اور مٹھاس اور راست بازی سے ہم میں محبت، یگانگت اور بھائی چارے کا جذبہ پیدا ہوگا جو کسی بھی قوم کی فلاح اور ترقی کا ضامن ہے۔

چند عجیب عادتیں

ہم میں سے بعض لوگ کچھ عجیب قسم کی عادتوں میں مبتلا ہیں۔ ان کو دیکھ کر ہنسی بھی آتی ہے اور غصہ بھی۔ سچ پوچھیے تو یہ عادتیں عجیب نہیں بلکہ بُری ہیں، بہت ہی بُری، لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ ان عادتوں میں مبتلا لوگوں کو ان کے بُرا ہونے کا احساس ہی نہیں ہوتا۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ان کی حرکتوں کو کوئی دوسرا نہ دیکھ رہا ہے اور نہ کسی پر ان کا اثر ہوتا ہے۔ حالانکہ دوسروں کو ان سے تکلیف بھی ہوتی ہے اور ان کا دِل بھی بُرا ہوتا ہے۔ چونکہ لوگ ان عادتوں میں لاشعوری طور پر مبتلا ہوتے ہیں اس لیے ہم انہیں عجیب ہی کہیں گے۔ آیئے ذرا ان میں سے چند عجیب عادتوں پر ایک نظر ڈالیں اور پھر سوچیں کہ ان سے کیسے چھٹکارا حاصل کیا جاسکتا ہے:

دوست احباب یا کچھ اور لوگ بیٹھے ہیں ایک صاحب ان کے سامنے بے تکلفی سے اپنی ناک صاف کرنا شروع کر دیتے ہیں یا زور زور سے کھانس کر بلغم تھوکنے لگتے ہیں۔ ان کی اس حرکت سے دوسرے لوگ گو منہ سے کچھ نہ کہیں لیکن سخت کراہت محسوس کرتے ہیں۔ کیا ان کی نظروں سے دُور ہو کر ناک صاف نہیں کی جاسکتی یا بلغم نہیں تھوکی جاسکتی؟

آپ دوستوں کے ساتھ بیٹھ کر چائے پی رہے ہیں اور چائے کے ہر گھونٹ کے ساتھ سُرکیاں لیتے ہیں۔ کیا آپ نہیں جانتے کہ یہ بدتمیزی ہے اور اس طرح آپ دوسروں کو اپنے اوپر ہنسنے کی دعوت دیتے ہیں۔

عزیزوں اور دوستوں سے ملاقات کے لیے ضرور جانا چاہیے لیکن یہ ضروری نہیں کہ آپ ہمیشہ بغیر اطلاع کے جائیں یا ایسے وقت جائیں جو ان کے آرام کا وقت ہو یا وہ کسی ضروری کام میں مشغول ہوں۔ آخر آپ کا بے وقت جانا ان کے لیے خوشی کا

باعث کیسے ہوسکتا ہے؟ یہ الگ بات ہے کہ وہ مروّت کے مارے کچھ نہ کہیں۔

آپ کو کسی دعوت میں بلایا جاتا ہے۔ صرف آپ اکیلے کو۔ لیکن دعوت میں آپ اپنے ایک یا دو بچوں یا کسی اور دوست کو بھی ساتھ لے جاتے ہیں۔ میزبان بے چارہ تو منہ سے کچھ نہ کہہ سکے گا لیکن آپ ذرا سوچیے کیا آپ کی یہ حرکت میزبان کے انتظامات کو درہم برہم نہیں کرسکتی؟

آپ دوستوں، عزیزوں اور کچھ دوسرے لوگوں کے درمیان بیٹھے ہیں۔ خوش گپیاں ہورہی ہیں۔ اس دوران میں آپ بار بار ناک میں انگلی ڈال کر گندا مواد نکالتے ہیں، اسے زمین پر ڈال دیتے ہیں یا انگلیوں میں مسلنے لگتے ہیں اور پھر جس صوفے، کرسی یا چارپائی وغیرہ پر بیٹھے ہیں، اس کے ساتھ چپکا دیتے ہیں۔ کیا دوسرے لوگ آپ کی اس حرکت سے کراہت محسوس نہیں کریں گے؟ اسی طرح اگر آپ کان سے مَیل نکال نکال کر اپنی انگلیوں میں مَسلیں گے یا اپنی نشست گاہ سے چپکائیں گے تو کیا دیکھنے والوں کا دل مَیلا نہ ہوگا؟

دوست احباب کی محفل جمی ہے، ہنسی مذاق ہو رہا ہے۔ آپ بار بار قہقہے لگاتے ہیں اور پاس بیٹھے ہوئے کسی دوست کی طرف اپنا ہاتھ بڑھادیتے ہیں کہ وہ اپنا ہاتھ اس پر مار کر آپ کی تائید کرے۔ کیا آپ کو معلوم نہیں کہ آپ کی یہ حرکت دوسروں کے لیے سخت کوفت کا باعث ہوتی ہے؟

آپ کو نسوار کھانے کی عادت ہے۔ اگر آپ اسے ترک نہیں کرسکتے تو آپ کی مرضی مگر کیا یہ ضروری ہے کہ آپ بھری محفل میں نسوار کھائیں اور بار بار تھوک کر دوسروں کا دل خراب کریں۔

آپ مرچ کم کھاتے ہیں یا پرہیزی کھانا کھاتے ہیں۔ چلیے یہ آپ کی مجبوری ہے۔ اس میں آپ کا کوئی قصور نہیں لیکن جب آپ کو کسی دعوت میں بلایا جاتا ہے اور کھانا آپ کے سامنے رکھا جاتا ہے، تو آپ ''نخرے'' شروع کردیتے ہیں کہ میں تو مرچ نہیں کھاتا، گوشت نہیں کھاتا، چاول نہیں کھاتا، یہ نہیں کھاتا، وہ نہیں کھاتا۔

اس طرح مہمان کی دل شکنی کرنے کی بجائے کیا یہ بہتر نہیں ہے کہ دعوت میں جانے سے پہلے آپ میزبان کو آگاہ کر دیں کہ آپ فلاں قسم کا کھانا کھائیں گے۔

آپ کا کوئی دوست یا جاننے والا تیزی سے کہیں جا رہا ہے۔ آپ اس کو روک کر باتیں شروع کر دیتے ہیں۔ وہ اخلاقاً کھڑا ہو جاتا ہے لیکن ہو سکتا ہے کہ وہ جس کام کے لیے جا رہا ہے وہ نہ ہو سکے یا وہ مقررہ وقت کے بعد پہنچے۔ کیا اس طرح کسی کو خواہ مخواہ روکنا ضروری ہے؟

آپ بازار میں یا سڑک پر جا رہے ہیں۔ راستے میں کوئی دوست مل جاتا ہے۔ آپ اس سے اسی جگہ کھڑے ہو کر طویل گفتگو شروع کر دیتے ہیں۔ یقین جانیے یہ شریفوں کا طریقہ نہیں ہے۔ اگر گفتگو کرنا ضروری ہے تو سڑک اور بازار سے ہٹ کر بھی کی جا سکتی ہے۔

آپ دوست احباب یا عزیزوں کے ساتھ مل کر کھانا کھا رہے ہیں۔ کھانا کھاتے ہوئے آپ ایسی چیزوں کے نام لیتے ہیں جن سے سننے والوں کو گھن پیدا ہوتی ہے۔ کیا آپ ایسی حرکت سے اجتناب نہیں کر سکتے؟

بچے سب کو پیارے لگتے ہیں، ان سے پیار کیجیے لیکن ان کو ہنسی ہنسی میں آپ اچھالنے لگتے ہیں یا کھڑکی سے باہر لٹکاتے ہیں۔ کیا اس طرح خطرہ مول لینا ضروری ہے؟

آپ کسی دوست کے ہاں جاتے ہیں ان کے سامنے کچھ کاغذات رکھے ہیں۔ آپ ان کو اٹھا کر دیکھنا شروع کر دیتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ آپ کا دوست کسی کاغذ کو آپ سے پوشیدہ رکھنا چاہتا ہو۔ کیا آپ کی اس حرکت سے اس کو تکلیف نہ ہو گی؟

آپ کسی کے ہاں مہمان جاتے ہیں۔ وہاں میزبان کے ملازم کو تحکمانہ لہجے میں کہتے ہیں پانی لاؤ، یہ کرو...... وہ کرو...... یقین جانیے آپ کا یہ لب و لہجہ ملازم کو ناگوار گزرے گا۔ کیا آپ اس کے ساتھ نرمی اور اخلاق کے ساتھ گفتگو نہیں کر سکتے؟

آپ کے جوان بچے ہیں، اپنا برا بھلا سمجھتے ہیں، ان کی کوئی حرکت آپ کو پسند نہیں آتی، آپ جھلا اٹھتے ہیں۔ ان کو ڈانٹ ڈپٹ کرتے ہیں اور چیخ چیخ کر گھر سر پر اٹھا لیتے ہیں۔ اچھی طرح سمجھ لیجیے کہ اس طرح بچوں میں ضد پیدا ہوتی ہے اور ساتھ ہی آپ کے خلاف نفرت کا جذبہ۔ کیا آپ ان کو دوستانہ طریقے سے نہیں سمجھا سکتے؟

کسی مریض کی عیادت یا بیمار پُرسی کے لیے جانا بہت اچھی بات ہے۔ لیکن کیا ضروری ہے کہ اس کے پاس بہت دیر تک بیٹھا جائے، بلند آواز سے اوٹ پٹانگ باتیں کی جائیں، بیمار کو تسلی دینے کی بجائے اس کو بیماری کے برے نتائج سے ڈرایا جائے۔ یہ تو بیمار پُرسی نہیں، مریض کو تکلیف پہنچانا ہے اور پھر جب عیادت کے لیے جاتے وقت چھوٹے بچوں کو بھی ساتھ لے جائیں تو ان کے شور وغل سے مریض کو جو تکلیف ہو گی کیا آپ کو اس کا کچھ اندازہ ہے۔ کیا یہ بہتر نہیں کہ مریض کے پاس تھوڑی دیر بیٹھیں۔ اس کو تسلی دیں اور واپس آ جائیں!

ہمسایوں کے ساتھ حُسنِ سلوک

دینِ اسلام محض عقائد و عبادات کے مجموعے کا نام نہیں بلکہ وہ ایک مُکمل اور جامع نظامِ حیات ہے جس کی نظیر دنیا کے کسی دوسرے نظام میں نہیں ملتی۔ اسلام میں انسانی زندگی کے ہر ہر پہلو اور ہر ہر رُخ کے لئے اَبدی ہدایات واَحکام موجود ہیں اور یہ اپنے انقلاب آفریں مُعاشَرتی نظام میں حُقوق العِباد کی ادائیگی پر بہت زور دیتا ہے۔ حُقوق العِباد کا ایک خاص الخاص پہلو ہمسایوں سے حُسنِ معاملہ ہے۔ انسان کا اپنے والِدَین، اپنی اولاد اور قریبی رشتہ داروں کے علاوہ ایک مُستَقِل واسطہ اور تعلّق ہمسایوں اور پڑوسیوں سے بھی ہوتا ہے اور اِس کی خوشگواری کا زندگی کے سُکھ چین اور اَخلاق کے بناؤ بگاڑ پر بہت زیادہ اَثر پڑتا ہے۔ رحمتِ عالَم ہادیٔ برحق ﷺ نے اپنی تعلیم و ہدایت میں ہمسائیگی اور پڑوس کے اس تعلّق کو بڑی عظمت بخشی ہے اور اس کے احترام و رعایت پر اس قدر زور دیا ہے کہ اس کو جُزوِ ایمان اور داخلۂ جنّت کی شرط اور اللہ و رسول کی محبت کا معیار قرار دیا ہے۔ حضرت معاویہ بن حَیدَہ رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ سے مروی ایک حدیث میں خیر الخلائق ﷺ نے ہمسایوں کے حُقوق اس طرح معیّن فرمائے ہیں ــــــ پڑوسی کے حُقوق تم پر یہ ہیں کہ اگر وہ بیمار ہو جائے تو اس کی عِیادت اور خبر گیری کرو، اگر وہ انتقال کر جائے تو اس کے جنازے کے ساتھ جاؤ، اگر وہ قرض مانگے تو (بشرطِ استطاعت) اس کو قرض دو، اگر وہ کوئی بُرا کام کر بیٹھے تو اُس کی پردہ پوشی کرو، اگر اُسے کوئی نِعمت ملے تو اُس کو مُبارکباد دو، اس کو کوئی مصیبت پہنچے تو تعزیت کرو، اپنی عمارت اس کی عمارت سے اس طرح بلند نہ کرو کہ اُس کے گھر کی ہوا بند ہو جائے اور تمہاری ہانڈی کی مہک پڑوسی کے لئے باعثِ ایذا نہ ہو اِلّا یہ کہ اُس میں سے تھوڑا سا کچھ اُس کے گھر بھیج دو۔

قریب قریب اسی مضمون کی حدیث حضرت عبداللہ بن عَمرو بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہُما سے بھی مروی ہے اور اُس میں یہ اضافہ ہے کہ...... اگر تم کوئی پھَل

خرید کر لاؤ تو اُس میں سے پڑوسی کے ہاں بھی ہدیہ بھیجو اور اگر ایسا نہ کر سکو تو اُس کو چھپا کر لاؤ اور تمہارا کوئی بچّہ وہ پھل لے کر گھر سے باہر نہ نکلے تا کہ پڑوسی کے بچّے کے دل میں اسے دیکھ کر جلن پیدا نہ ہو۔

دانائے کونین ﷺ کی اِن ہدایات پر غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ اِن پر عمل کرنے سے جہاں ہمسایوں سے خوشگوار تعلّقات قائم ہوں گے وہاں اللہ اور رسولؐ کی خوشنودی بھی حاصل ہوگی۔ ہمسایوں کو ایذا پہنچانے یا ان کے ساتھ کوئی شرارت کرنے کو آنحضور ﷺ نے جس قدر گھناؤنا فعل قرار دیا ہے اس کا اندازہ صحیحین کی اس حدیث سے کیا جا سکتا ہے: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہُ سے روایت ہے کہ رسولِ اللہ ﷺ نے ایک دن ارشاد فرمایا، خدا کی قسم وہ شخص مومن نہیں ہو سکتا، خدا کی قسم اُس میں ایمان نہیں، خدا کی قسم وہ صاحبِ ایمان نہیں، صحابہ نے عرض کیا' یا رَسُولَ اللہ! کون شخص؟ آپؐ نے ارشاد فرمایا، وہ آدمی جس کے پڑوسی اس کی شرارتوں اور مفسِدہ پردازیوں سے مامُون اور بے خوف نہ ہوں۔

اس خدیث کی رُو سے ہر صاحبِ ایمان پر لازِم ہے کہ ہمسایوں سے اس کا برتاؤ اور رَوِیّہ ایسا شریفانہ ہو کہ وہ اُس کی طرف سے بالکل مطمَئن اور بے خوف رہیں۔ صحیح مُسلِم میں حضرت اَنَس رضی اللہ تعالی عنہ سے روایت ہے کہ رَسُولُ اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ وہ آدمی جَنّت میں داخل نہ ہو سکے گا جس کی شرارتوں اور ایذا رسانیوں سے اسکے ہمسائے مامون نہ ہوں۔ ان دو حدیثوں سے سمجھا جا سکتا ہے کہ رسولِ اکرم ﷺ کی تعلیم و ہدایت میں ہمسایوں کے ساتھ حُسنِ سُلُوک کا کیا درجہ اور مقام ہے۔ لِسانِ رسالت سے کسی عَمَل کی سخت تاکید اور دین میں اُس کی انتہائی اہمیّت جِتانے کی آخری تعبیر یہی ہوتی ہے کہ اُس میں کوتاہی کرنے والا مومن نہیں یا یہ کہ وہ جَنّت میں داخل نہ ہو سکے گا۔ گویا ہمسایوں کے ساتھ حُسنِ معاملہ کی فکر نہ کرنا شقاوت اور بدبختی کی نشانی ہے۔ ہمسائیوں کے ساتھ حسنِ معاملہ کا ایک اور پہلو بھی ہے جس کا ذِکر مُسنَدِ بزّار میں حضرت اَنَس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی اس

حدیث میں کیا گیا ہے: رسُول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے کہ وہ آدمی مجھ پر ایمان نہیں لایا جو ایسی حالت میں اپنا پیٹ بھر کر رات کو سو جائے کہ اُس کے برابر رہنے والا پڑوسی بھوکا ہو اور اُس آدمی کو اُس کے بھوکے رہنے کی خبر ہو۔ گویا ایک پڑوسی کا دوسرے پڑوسی پر یہ حق بھی ہے کہ کہ اس کے بھوک پیاس کے مَسئلوں اور اسی قسم کی دوسری ضرورتوں سے بھی بے فِکر اور بے نیاز نہ ہو۔

ایک اور حدیث میں پڑوسیوں کے ساتھ حُسنِ معاملہ کو اللہ اور رسول کی محبت کا مِعیار قرار دیا گیا ہے۔ اس حدیث میں حضرت عبدالرّحمٰن بن ابی قُراد رضی اللّٰہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ ایک دن رسول اللہ ﷺ نے وُضُو فرمایا تو صحابہؓ آپؐ کے وُضُو کا پانی لے لے کر اپنے اپنے جِسم پر مَلنے لگے۔ آپؐ نے اُن سے فرمایا کہ تمہارے لیے اس کا کیا باعِث اور مُحرِّک ہے؟ انہوں نے عرض کیا بس اللہ اور رسولؐ کی محبت۔ آپؐ نے ارشاد فرمایا، جس کی یہ خوشی اور خواہش ہو کہ اس کو اللہ اور رسول سے مُحبّت کرنا نصیب ہو، تو اسے چاہیے کہ وہ اِن تین باتوں کا اہتمام کرے، بات کرے تو سچ بولے جب کوئی امانت اس کے سپرد کی جائے تو امانت داری کے ساتھ اس کی حفاظت اور واپسی کا فریضہ ادا کرے اور اپنے ہمسایوں کے ساتھ اچھا رَوِیہ رکھے۔

صحیح بُخاری اور صحیح مُسلِم میں حضرت ابوشُریح عَدَوی رضی اللہ تعالیٰ عنہُ سے مَروی ایک حدیث می رسول اللہ ﷺ نے یہاں تک فرمایا ہے کہ جو شخص اللہ اور یومِ آخرت پر ایمان رکھتا ہو، اُس کے لئے لازم ہے کہ اپنے پڑوسی کے ساتھ اِکرام کا مُعامَلہ کرے۔

صحیحین ہی کی ایک اور حدیث میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور حضرت ابنِ عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صَلّی اللہ علیہ وسَلّم نے فرمایا کہ جبرَئیل پڑوسی کے حق میں مجھے اللہ تعالیٰ کی طرَف سے برابر وصیت اور تاکید کرتے رہے یہاں تک کہ میں خیال کرنے لگا کہ وہ اُس کو (ایک پڑوسی کو دوسرے پڑوسی کا)

وارث قرار دے دیں گے۔

ہمسایوں کے ساتھ حُسنِ معاملہ میں یہ بات ہی شامل نہیں ہے کہ ان کی مادّی ضرورتوں کا خیال رکھا جائے اور ان کے ساتھ خوشگوار تعلقات رکھے جائیں بلکہ یہ بھی ہے کہ اُن کی تعلیم و تربیت کا خیال بھی رکھا جائے۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی ”کتاب الوحدان“ میں حضرت اُبزٰی خُزاعی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک دن ارشاد فرمایا کہ کیا ہو گیا ہے اُن لوگوں کو کہ وہ اپنے پڑوسیوں کو دین سکھانے اور اُن میں دین کی سمجھ بوجھ پیدا کرنے کی کوشش نہیں کرتے، نہ اُن کو وعظ و نصیحت کرتے ہیں نہ امر بالمعرُوف و نہی عَنِ المنکَر کی ذمہ داری ادا کرتے ہیں اور کیا ہو گیا ہے اُن بے علم اور پسماندہ لوگوں کو کہ وہ اپنے پڑوسیوں سے دین سیکھنے اور دین کی سمجھ بُوجھ پیدا کرنے کی فکر نہیں کرتے اور نہ اُن سے نصیحت لیتے ہیں۔

رحمتِ عالَم ﷺ نے صِرف مُسلِم پڑوسی ہی کے ساتھ حُسنِ معاملہ کی تاکید نہیں فرمائی بلکہ غیر مسلم ہمسائے کے ساتھ بھی حسنِ سُلوک کی ہدایت فرمائی ہے۔ مُسنَدِ بزّار میں حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا، پڑوسی تین قِسم کے اور تین درجے کے ہوتے ہیں ایک وہ پڑوسی جس کا صرف ایک ہی حق ہو، کم درجہ کا پڑوسی ہے۔ دوسرا وہ جس کے دو حق ہوں اور تیسرا وہ جس کے تین حق ہوں، تو ایک حق والا وہ مُشرک پڑوسی ہے جس سے کوئی رشتہ داری بھی نہ ہو، دو حق والا وہ پڑوسی ہے جو مسلم بھی ہو اس کا ایک حق مسلمان ہونے کی وجہ سے ہے اور دوسرا پڑوسی ہونے کی وجہ سے اور تین حق والا وہ پڑوسی ہے جو مسلم بھی ہو اور رشتہ دار بھی ہو اس کا ایک حق مسلمان ہونے کا ہوگا دوسرا حق پڑوسی ہونے کا اور تیسرا حق رشتہ داری کا ہوگا۔

دعا ہے اللہ تعالیٰ، ہم سب کو ہمسایوں کے ساتھ حسنِ معاملہ کی توفیق دے۔

گھریلو ملازموں سے برتاؤ!

ہمارے ملک کے کھاتے پیتے گھرانوں میں ملازم رکھنے کا عام رواج ہے۔ یہ ملازم مرد بھی ہوتے ہیں اور عورتیں بھی۔ دیکھا گیا ہے کہ بعض گھرانوں میں یہ ملازم ساری ساری عمر گزار دیتے ہیں لیکن بہت سے گھرانے ایسے ہیں جن میں ملازم ٹِک کر نہیں رہتے یا گھر والوں کو آئے دن ملازم بدلنے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ اس کا بڑا سبب گھر والوں کا ملازموں کے ساتھ برتاؤ ہے۔ یہ کہنا تو صحیح نہ ہوگا کہ ہمیشہ گھر والوں ہی کا قصور ہوتا ہے۔ بعض دفعہ ملازموں کا رَوِیَّہ بھی ٹھیک نہیں ہوتا لیکن عام طور پر ملازموں کا کسی گھرانے کی ملازمت چھوڑنا گھر والوں کے نامناسب سلوک کی وجہ سے ہوتا ہے۔

سب سے پہلے آپ کو یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ کوئی شخص گھریلو ملازمت کی زندگی خوشی سے اختیار نہیں کرتا۔ اس کی وجہ اس کی غریبی، ضرورتیں اور دوسری مجبوری ہوتی ہیں۔ آپ اس کو مقررہ تنخواہ یا اجرت ضرور دیتے ہیں لیکن یہ معاوضہ اس کی عزت اور خودداری کا نہیں۔ اس لیے کسی ملازم کو زرخرید غلام سمجھ کر اس پر سختی کرنا یا اس کی عزت اور خودداری کو ٹھیس پہنچانا کسی صورت میں جائز نہیں۔ کیا آپ نے کبھی غور کیا ہے کہ آپ جب کسی ملازم یا ملازمہ کو کسی کام کا حکم دیتے ہیں تو آپ کا لہجہ اس قسم کا ہوتا ہے کہ آپ اسے بہت حقیر سمجھتے ہیں۔ اس قسم کا لہجہ اور برتاؤ ملازم میں احساسِ کمتری پیدا کرتا ہے اور یہی بات سب خرابیوں کی جڑ ہے۔ اس سے ملازم خود کو غیر سمجھتا ہے اور اس کو صرف اپنی تنخواہ سے غرض ہوتی ہے۔ آپ کے دُکھ درد یا فائدے نقصان کی کوئی پروا نہیں ہوتی۔ اس کے بجائے اگر آپ کا رویہ ملازموں کے ساتھ محبت اور شفقت کا ہو تو آپ ان کے دلوں میں گھر کر سکتے ہیں۔

جب وہ یہ سمجھتے ہیں کہ گرے پڑے کام کرنے کے باوجود وہ آپ کی نظروں میں حقیر اور ذلیل نہیں ہیں تو ان میں احساسِ ذمہ داری پیدا ہوتا ہے اور انھیں آپ کے دُکھ درد اور نفع ونقصان کا ہمیشہ خیال رہنے لگتا ہے۔ بعض گھرانوں میں ملازموں کے ساتھ اچھوتوں جیسا سلوک کیا جاتا ہے۔ ان کے کھانے پینے کے برتن الگ رکھے جاتے ہیں اور ان کو بچا کھچا کھانا دیا جاتا ہے۔ اسی طرح ان کے کپڑوں کی طرف بھی دھیان نہیں دیا جاتا اور یہ نہیں دیکھا جاتا کہ وہ پھٹے پرانے اور میلے کچیلے کپڑے پہنے ہوئے ہیں۔ اس سے ملازموں کے دلوں میں گھر والوں کے خلاف نفرت کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ وہ گھر والوں کو بہت مغرور جانتے ہیں اور خود کو ان کا ہمدرد اور خیر خواہ نہیں بلکہ صرف نوکر ہی سمجھتے ہیں جن کا مقصد آپ کے گھر میں کام کرنے سے صرف اپنی روزی کمانا ہوتا ہے۔ یہ نقطۂ نظر خطرناک ہے۔ اگر آپ چاہیں تو تھوڑی سی توجہ سے اس میں خوش گوار تبدیلی لا سکتے ہیں۔ جن برتنوں میں آپ خود کھاتے ہیں، ویسے ہی برتنوں میں ملازموں کو کھانا دیں اور جو کھانا آپ خود کھاتے ہیں ان میں سے گھر کے تمام افراد کی طرح ان کا حصہ بھی نکالیں۔ اسی طرح ان کے لباس کا بھی اس حد تک خیال رکھیں کہ یہ گھر والوں کے لباس کی طرح عمدہ اور قیمتی نہ سہی صاف ستھرا اور مناسب ضرور ہو۔ آپ کے ایسا کرنے سے کوئی وجہ نہیں کہ ملازم اپنے آپ کو گھر کا فرد نہ سمجھنے لگیں اور ان کے دلوں میں آپ کی خیر خواہی کا جذبہ پیدا نہ ہو۔

بعض اوقات کوئی ملازم آپ کی بہتری کی خاطر گھریلو کام میں آپ کو کوئی مشورہ دیتا ہے، لیکن آپ اسے محض اس بنا پر جھڑک دیتے ہیں کہ وہ نوکر ہو کر گھر کے کاموں میں دخل دیتا ہے حالانکہ اس کا مشورہ مان لینے میں آپ کا سراسر فائدہ ہوتا۔ ملازموں کو اس طرح جھڑک کر ان کی حوصلہ شکنی کبھی نہ کیجیے۔ اگر آپ ملازم کے مشورے کو درست نہیں سمجھتے تو پیار اور بے تکلفی سے بتائیے کہ اس میں یہ نقصان ہے اور اگر اس کا مشورہ صحیح ہے تو کھلے دل سے مان لیجیے اور اس کو شاباش دیجیے۔ پھر آپ دیکھیں گے کہ ملازم آپ پر کس طرح جان چھڑکتے ہیں۔ غلطیاں کس سے نہیں

ہوتیں، ملازم بھی انسان ہیں، ان سے بھی غلطیاں ہوسکتی ہیں۔ ان کے منہ سے کوئی نامناسب بات نکل سکتی ہے۔ آپ کے گھر پہنچنے میں ان کو دیر ہوسکتی ہے۔ آپ انھیں سودا لانے کے لیے کچھ رقم دیتے ہیں، یہ رقم ان سے گر جاتی ہے۔ ایسی غلطیوں پر آپ کو آپے سے باہر نہیں ہوجانا چاہیے۔ ان کی وضاحت کو ٹھنڈے دل سے سنیں اور جہاں تک ہو سکے ان کو معاف کر دیں۔ لیکن اگر آپ نے ان کو ڈانٹ ڈپٹ اور لعنت ملامت کی یا ان سے نقصان کی رقم وصول کر لی نقد یا تنخواہ سے کاٹ کر' تو اس سے ان کے دلوں میں آپ کے خلاف سخت نفرت پیدا ہوجائے گی۔ ایسے معاملوں میں صرف نرمی' درگزر اور چشم پوشی ہی سے آپ ان کے دل جیت سکتے ہیں۔ ایک بڑا مسئلہ جو ہر گھر میں پیدا ہوتا ہے۔ وہ ملازموں پر اعتبار اور اعتماد کا ہے۔ ملازموں کو کبھی یہ احساس نہ ہونے دیجیے کہ آپ ان کی دیانت پر شک کرتے ہیں۔ یہ ضروری نہیں کہ آپ ہر ملازم پر ہر حالت میں پورا اعتبار کریں لیکن جب تک اس کی بد دیانتی کا کوئی پورا ثبوت آپ کے ہاتھ میں نہ آئے اس کی طرف سے بدگمانی کرنا درست نہیں۔ ملازموں کو سودا سلف لانے کے لیے بازار بھیجیں تو ان سے کرید کرید کر ایک ایک پیسے کا حساب نہ لیں۔ ہاں اگر آپ یہ محسوس کریں کہ وہ ہر بار سودے کی قیمت زیادہ بتاتا ہے تو رازداری سے ان چیزوں کے نرخ بازار سے دریافت کریں۔ اگر یہ ثابت ہوجائے کہ وہ سودا سلف کی رقم میں سے کچھ رقم اڑانے کا عادی ہو چکا ہے تو پھر آپ اس کو نکال بھی سکتے ہیں اور مناسب احتیاطی تدابیر بھی اختیار کر سکتے ہیں۔

ملازموں کو بد دیانتی سے بچانے کے لیے ان کے گھریلو حالات اور ضرورتوں سے بھی کسی حد تک باخبر رہنا ضروری ہے۔ اگر وہ تنگ دست ہیں اور مصیبت میں مبتلا ہیں تو ان سے زبانی ہمدردی بھی کرنی چاہیے اور ان کو مالی امداد بھی دینی چاہیے۔ اگر وہ بیمار ہو جائیں تو بڑی ہمدردی اور توجہ سے ان کا علاج کرانا چاہیے۔ اسی طرح جیسے گھر کے کسی بیمار فرد کا کرایا جاتا ہے۔

ملازموں کے ساتھ اچھا سلوک کرنے سے یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ وہ خود کو

آپ کے برابر سمجھنے لگیں گے۔ یہ بالکل غلط خیال ہے۔ ملازم اپنی حیثیت کو اچھی طرح سمجھتے ہیں۔ وہ کبھی گھر والوں کی برابری کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ ہاں اپنے اچھے برتاؤ سے آپ ان کو اپنا سچا خیر خواہ اور وفادار بنا سکتے ہیں۔ اس طرح وہ آپ کے دُکھ کو اپنا دُکھ سمجھیں گے اور آپ کی خوشی یا فائدے کو اپنی خوشی یا فائدہ سمجھیں گے۔

اکثر ملازم یا تو اَن پڑھ ہوتے ہیں یا ان کی تعلیم بہت کم ہوتی ہے۔ اس لیے شروع شروع میں ان کی عادات و اطوار میں گنوار پن پایا جاتا ہے۔ اگر آپ ان کی تعلیم و تربیت پر مناسب توجہ دیں تو تھوڑے ہی عرصے میں وہ بہت شائستہ اور تمیز دار بن جائیں گے۔ ملازموں کی تعلیم و تربیت پر توجہ دینا اس لیے بھی ضروری ہے کہ گھر کے بچوں کو اکثر ان سے واسطہ پڑتا ہے۔ اگر ملازم تمیز والے ہوں گے اور ان کی عادتیں اچھی ہوں گی تو بچوں پر بھی ان کو بہت اچھا اثر پڑے گا۔

اسلام میں ملازموں سے اچھا برتاؤ کرنے پر بڑا زور دیا گیا ہے اور یہاں تک حکم دیا گیا ہے کہ جو تم خود کھاتے ہو وہی ان کو کھلاؤ اور جو تم خود پہنتے ہو وہی ان کو پہناؤ اور اگر وہ کوئی غلطی کریں تو ان کو مُعاف کر دیا کرو۔ ملازموں پر ہاتھ اٹھانا اور ان کو مارنا پیٹنا نہ صرف سخت گناہ ہے بلکہ اس سے وہ آپ کے دشمن بن سکتے ہیں اور کسی وقت نقصان پہنچا سکتے ہیں۔ رسولِ اکرم ﷺ نے فرمایا ہے کہ "سب سے برا وہ شخص ہے جس کو اللہ نے افسری اور حکومت دی ہو لیکن اس کے ماتحت اس سے بیزار ہوں اور اس کو برا سمجھیں"۔

مختصر یہ کہ ملازموں سے اچھا برتاؤ کرنے سے اللہ بھی راضی ہوتا ہے اور ہمارا اپنا بھلا بھی ہوتا ہے اس لیے ان کو کٹھ پتلیاں نہیں بلکہ باعزت انسان اور اپنے گھر کے افراد سمجھنا چاہیے۔

یہ عادتیں اپنائیے

یوں تو انسان کی زندگی کسی نہ کسی ڈھب سے گزر ہی جاتی ہے لیکن زندگی کو سنوارنے یا بگاڑنے میں انسان کی بعض عادتیں بڑا اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ کچھ عادتیں ایسی ہوتی ہیں جن کو اپنا کر انسان ہمیشہ فائدے میں رہتا ہے۔ یہاں ہم ایسی ہی چند عادتوں کا ذکر کریں گے۔ بظاہر یہ باتیں معمولی معلوم ہوں گی لیکن غور سے دیکھا جائے تو ان میں سراسر بھلائی ہی بھلائی ہے اور ان کو اپنا کر بے شمار فائدے حاصل کیے جاسکتے ہیں۔

چھینکتے وقت منہ پر کپڑا رکھ لیا کریں

کوئی انسان ایسا نہیں جس کو کبھی چھینک نہ آئے۔ چونکہ چھینکتے وقت چہرے کی حالت بدل جاتی ہے جس سے دوسروں کی ہنسی اور کراہت کا سامان پیدا ہوسکتا ہے اس لیے چھینکتے وقت ہمیشہ منہ پر ہاتھ یا کپڑا رکھ لینا چاہیے۔ اس طرح کھلے منہ میں مکھی یا مچھر یا دوسرے جراثیم بھی داخل نہ ہوسکیں گے۔ رسول مقبول ﷺ جب چھینکتے تھے تو ہمیشہ اپنا منہ ہاتھ یا کپڑے سے ڈھانک لیا کرتے تھے اور آواز کو نہایت آہستہ کرلیا کرتے تھے۔ آواز کو آہستہ کرنے کا سبب یہ ہے کہ چھینکتے وقت اکثر زبان سے صحیح الفاظ نہیں نکلتے اور کچھ پلے نہیں پڑتا۔ البتہ اگر نہایت آہستگی سے بات کی جائے تو سمجھ میں آجاتی ہے اور دوسروں کے مذاق کا نشانہ نہیں بننا پڑتا۔ حضورؐ نے زور سے چھینک مارنے سے بھی منع فرمایا ہے کیونکہ یہ بدتہذیبی کی علامت ہے۔ آپؐ نے جمائی لیتے وقت بھی منہ پر ہاتھ رکھنے کی ہدایت فرمائی ہے۔

سلام کرنے میں پہل کریں

میل ملاپ کا سب سے بہتر طریقہ سلام کرنا ہے۔ بعض لوگ دوسروں سے سلام کی توقع رکھتے ہیں اور خود سلام نہیں کرتے۔ اس میں غرور پایا جاتا ہے جو اللہ کو سخت ناپسند ہے۔ سلام میں پہل کرنے سے اللہ بھی راضی ہو جاتا ہے اور دوسرے کے دل میں بھی سلام کرنے والے کے لیے محبت اور شفقت کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ رسولِ اکرم ﷺ نے فرمایا ہے کہ وہ شخص اللہ کو بہت پیارا ہے جو سلام کرنے میں پہل کرے۔

سونے سے پہلے ہاتھ صاف کر لیا کریں

سونے سے پہلے اگر کوئی چیز کھائی یا پی جائے تو اس کا کچھ نہ کچھ اثر ہاتھوں پر ضرور رہ جاتا ہے۔ اگر آدمی ہاتھ صاف کیے بغیر سو جائے تو ہو سکتا ہے سوتے میں ہاتھ جسم کے کسی نازک حصے (آنکھ، ناک وغیرہ) کو لگ جائیں اور اس کو تکلیف پہنچے یا ہاتھ کو کوئی چوہا چھچھوندر وغیرہ کاٹ لے۔ رسولِ مقبول ﷺ نے فرمایا ہے کہ جو شخص ہاتھ صاف کیے بغیر رات کو سو جائے اور اس کو کوئی تکلیف پہنچے تو اسے اپنے آپ کو ملامت کرنی چاہیے۔

سونے سے پہلے بستر کو جھاڑ لیا کریں

کئی دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ بستر پر کوئی کیل، کانٹا یا کوئی دوسری نوک دار چیز پڑی ہوتی ہے اگر آدمی بے خبری کے عالم میں بستر پر لیٹ جائے تو اس کو تکلیف پہنچ سکتی ہے۔ اس کے علاوہ اس بات کا بھی احتمال ہے کہ کوئی زہریلا کیڑا بستر میں چھپا بیٹھا ہو۔ بستر کو جھاڑے بغیر اگر آدمی لیٹ جائے تو یہ کیڑا اس کو ضرر پہنچا سکتا ہے۔ اسی لیے رسولِ اکرم ﷺ نے فرمایا کہ جب کوئی شخص اپنے بستر پر لیٹنے کا ارادہ کرے تو پہلے اس کو کپڑے سے جھاڑ لے۔ کپڑے سے جھاڑنے میں یہ حکمت ہے کہ کوئی چیز ہاتھ

میں چبھ نہ جائے یا کوئی کیڑا نہ کاٹ کھائے۔ انسان کو ایسے ہی ضرر سے بچانے کے لیے حضورؐ نے یہ ہدایت فرمائی ہے کہ جوتا بھی پہننے سے پہلے جھاڑ لینا چاہیے۔

نیند سے جاگ کر پہلے ہاتھ دھوئیں

آدمی سو کر اٹھے تو اس کو معلوم نہیں ہوتا کہ رات کو نیند میں اس کے ہاتھ بدن کے کس کس حصے پر پھرتے رہے ہیں۔ اس لیے صفائی اور پاکیزگی کا تقاضا ہے کہ وہ بیدار ہونے پر کسی چیز کو ہاتھ لگانے سے پہلے ہاتھ دھو لے۔ رسولِ مقبول ﷺ کا ارشاد ہے کہ جب تم میں سے کوئی شخص سو کر اُٹھے تو کسی برتن میں اپنا ہاتھ نہ ڈالے جب تک تین مرتبہ ہاتھ نہ دھو لے کیونکہ اس کو معلوم نہیں کہ رات کو اس کا ہاتھ کہاں کہاں رہا۔

کھانے سے پہلے اور بعد ہاتھ ضرور دھوئیں

کھانے سے پہلے ہاتھ دھونا اس لیے ضروری ہے کہ وہ گرد، میل وغیرہ سے صاف ہو جائیں اور کھانے کے بعد ہاتھ دھونا اس لیے ضروری ہے کہ اگر ان کو چکنائی یا سالن وغیرہ لگ گیا ہو تو وہ دُور ہو جائے۔ اس طرح کپڑے بھی داغ دھبے سے بچے رہیں گے اور آنکھ ناک جیسے نازک اعضاء کو بھی انگلیوں کے مَس سے کوئی ضرر نہیں پہنچے گا۔ رسولِ اکرم ﷺ فرمایا کرتے تھے کہ کھانے سے پہلے ہاتھ دھو کر انہیں تولیے سے ہرگز صاف نہ کریں بلکہ کھانے کے بعد ہاتھ دھو کر تولیہ استعمال کریں۔

کھانے کے بعد منہ ضرور صاف کیا کریں

دن رات میں کوئی چیز بھی کھائی جائے، اس کے بعد اچھی طرح کلیاں کر کے منہ ضرور صاف کر لیا کریں۔ اس سے کھائی جانے والی چیز کے ذرّے دانتوں اور حلق سے نکل جاتے ہیں اور منہ میں بدبو پیدا نہیں ہوتی۔ شربت اور دودھ پینے کے بعد بھی کلّی ضرور کریں۔ اگر ایسا نہ کیا جائے تو شربت کی مٹھاس دانتوں کو خراب کر سکتی

ہے اور دودھ کی چکناہٹ سے منہ میں بدبو پیدا ہوسکتی ہے اور چہرے پر مکھیاں بیٹھ سکتی ہیں۔ منہ صاف نہ کرنے سے دانت بھی بہت جلد خراب ہو جاتے ہیں اور دوسری کئی بیماریاں بھی آدمی کو آ گھیرتی ہیں۔

سبزیاں زیادہ کھایا کریں

یہ ایک طبّی اور سائنسی حقیقت ہے کہ سبزیاں حیاتین (وٹامنز) سے بھرپور ہوتی ہیں اور انسانی صحت کے لیے بے حد مفید ہیں۔ ان سے معدہ، جگر، دل، دماغ، انتڑیوں اور ہڈیوں کو طاقت ملتی ہے اور انسان چاق چوبند رہتا ہے۔ جس شخص کو جو سبزی موافق آجائے اسے اس سبزی کا خوب استعمال کرنا چاہیے۔ پودینہ، سلاد، ٹماٹر وغیرہ کو پکانے کی بھی ضرورت نہیں۔ یہ کچے بھی کھائے جاسکتے ہیں۔ رسولِ اکرم ﷺ نے سبزیوں کی افادیت ہی کے پیش نظر ہدایت فرمائی ہے کہ اپنے دستر خوان کو سبز چیزوں سے زینت دیا کرو۔

راستے سے تکلیف دہ چیز دور کر دیا کریں

راستے میں اگر کیلوں اور خربوزوں کے چھلکے، کانٹے والی ٹہنی، کانچ کے ٹکڑے اور اینٹ پتھر وغیرہ پڑے ہوں تو ان سے راستہ چلنے والوں کو جو تکلیف پہنچ سکتی ہے، وہ ظاہر ہے۔ اگر کوئی شخص ایسی کسی تکلیف دِہ چیز کو راستے سے ہٹا دے تو ہر ایک کو فائدہ پہنچے گا اور اس کا یہ کام خدمتِ خلق میں شمار ہوگا جو اللہ کو بہت پسند ہے۔ اسی لیے رسولِ اکرم ﷺ نے ہدایت فرمائی ہے کہ راستے سے تکلیف دِہ چیزوں کو دُور کر دیا کرو۔

کسی کا دروازہ کھٹکھٹاتے وقت اپنا نام بتائیں

کسی کے دروازے پر دستک دیتے وقت (یا گھنٹی بجاتے وقت) اگر اندر

سے پوچھ لیا جائے کون ہے؟ تو اپنا نام بتانا چاہیے۔ ''میں ہوں، میں ہوں'' نہیں کہنا چاہیے۔ نام بتانے سے گھر والے اس کو پہچان جائیں گے اور کسی الجھن میں نہیں پڑیں گے۔ رسولِ اکرم ﷺ کو یہ بات سخت ناپسند تھی کہ دستک دینے والا اپنا نام بتانے کے بجائے ''میں ہوں'' کہے۔

..........☆..........☆..........

۱۔ حضرت اَنس بن مالک رضی اللہ عنہٗ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، رات کا کھانا مت چھوڑو، اس سے بڑھاپا جلد آ جاتا ہے۔

(کتاب الطب ابو نعیمؒ)

۲۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا سب سے زیادہ مبغوض ہمیشہ لڑنے جھگڑنے والا آدمی ہے۔

(صحیح بخاری)

۳۔ حضرت انس رضی اللہ عنہٗ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے فرمایا، اے بیٹے بہت نہ ہنسا کرو کیونکہ زیادہ ہنسنا دل کو مردہ بنا دیتا ہے۔

(مشکوٰۃ)

اعتدال کا راستہ اپنائیے

اعتدال کا مطلب ہے نہ حد سے زیادہ اور نہ حد سے کم۔ اسی کو میانہ روی بھی کہا جاتا ہے۔ داناؤں کا قول ہے کہ ہر کام میں بے اعتدالی کرنے سے نقصان کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ محسنِ انسانیت رسولِ اکرم ﷺ نے بھی اعتدال پر بے حد زور دیا ہے اور فرمایا ہے:

"اے لوگو! اعتدال اختیار کرو۔ اللہ کسی کو تکلیف میں نہیں ڈالتا جب تک تم خود مشقت میں نہ پڑو۔ (یاد رکھو) تمام کاموں میں اعتدال سب سے بہتر ہے۔"

درحقیقت اِعتدال قُدرت کا سچا اور پکا اُصول ہے۔ دنیا کا تمام کارخانہ اسی پر قائم ہے کوئی کام خواہ دینی ہو یا دُنیاوی ایسا نہیں جس میں اِعتدال کی ضرورت نہ ہو۔ انسان کو اطمینان کی زندگی اسی وقت نصیب ہوتی ہے جب وہ اعتدال پر کاربند ہو اور کبھی اعتدال کو ہاتھ سے نہ جانے دے۔ آج ہمارے معاشرے میں جتنی خرابیاں دکھائی دیتی ہیں ان میں سے بیشتر کا سبب یہ ہے کہ لوگ اپنے کاموں میں بے اعتدالی سے کام لیتے ہیں حالانکہ ہمارا دعوٰی ہے کہ ہم ایک اسلامی معاشرے کے افراد ہیں۔ سچ پوچھیے تو یہ محض زبانی دعوٰی ہے۔ عملی زندگی میں ہم اس بات کو بالکل نظرانداز کر دیتے ہیں کہ اِسلامی طرزِ معاشرت میں اعتدال بُنیادی اُصول کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہاں تک کہ عبادت میں بھی اعتدال کی تلقین کی گئی ہے۔ متواتر روزے رکھنا یا ساری ساری رات عبادت میں مصروف رہنا اور نہ صِرف اپنے گھر والوں سے بلکہ دُنیا کے دُوسرے کاموں سے بھی غافل ہو جانا اِعتدال کا طریقہ نہیں ہے۔ اسی لیے اس کو ناپسندیدہ قرار دیا گیا ہے اِسلام کا حُکم تو یہ ہے کہ دین کو مُشکل مت بناؤ۔ عبادت اسی حد تک درُست ہے جب تک تمہارا دل اس میں لگا رہے۔ اتنی زیادہ عبادت نہ کرو کہ طبیعت اُکتا جائے اور رُوحانی سکون ملنے کی بجائے وحشت ہونے لگے۔ دُوسری

طرف دُنیا کے دھندوں میں اس قدر مشغول نہ ہو جاؤ کہ اللہ کی یاد سے غافل ہو جاؤ۔

سوچنے کی بات ہے کہ جب اللہ اپنی عبادت میں بے اعتدالی پسند نہیں کرتا تو اسے دُنیاوی کاموں یہ کیسے پسند آسکتی ہے، لیکن آج ہم میں سے کتنے لوگ ہیں جو شادی بیاہ، بچّوں کی پیدائش اور دوسرے رسُوم ورواج پر اعتدال کے دائرے کے اندر رہتے ہیں۔ ہم تو ایسے موقعوں پر زیادہ سے زیادہ خرچ کر کے لوگوں کی واہ وا حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ اگر حکومت ہمارے بھلے کی خاطر مہمانوں کی تعداد اور کھانوں پر پابندی لگاتی ہے تو ہم بے اعتدالی کرنے کے لیے چوری چھپے ایسے طریقے اختیار کرتے ہیں کہ اس پابندی کا مقصد ہی فوت ہو جاتا ہے۔ ایسی بے اعتدالیوں نے کئی گھرانوں کا سُکھ چین چھین لیا ہے اور وہ قرض اور افلاس کے چکّر میں ایسے پھنسے ہیں کہ اس سے چھٹکارا پانا مشکل ہے۔ اگر اپنی چادر دیکھ کر پاؤں پھیلائے جائیں تو اس میں اپنا بھی فائدہ ہے اور قوم اور ملک کا بھی۔

مثلاً: ورزش انسانی صحت کے لیے بہت مُفید ہے لیکن جب حد سے بڑھ کر ورزش کی جائے یہاں تک کہ آدمی تھک کر چُور ہو جائے تو یہی ورزش سخت نقصان دہ ثابت ہوتی ہے۔

اچھی اور متوازن غذا صحت بخش ہوتی ہے، لیکن خواہ کیسی عُمدہ خوراک ہو، اگر اس کے استعمال میں اعتدال سے کام نہ لیں اور بار بار تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد مُنہ چلاتے رہیں تو وہ فائدہ دینے کی بجائے زہر بن جاتی ہے۔ معدہ خراب ہو جاتا ہے اور آدمی طرح طرح کی بیماریوں میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

مُطالعہ بہت اچھی عادت ہے لیکن اس میں بھی بے اعتدالی سخت نقصان کا باعث ہوتی ہے۔ وقت بے وقت مطالعہ میں مصروف رہنے سے نہ صرف آنکھوں پر بوجھ پڑتا ہے بلکہ عام جسمانی صحت بھی خراب ہو جاتی ہے۔

بچوں سے پیار محبت بہت ضروری لیکن اس میں بھی آپ حد سے بڑھ گئے تو بچّے بگڑ جائیں گے۔

گفتگو اور بول چال سے کسی انسان کی خُوبیاں اور خامیاں ظاہر ہوتی ہیں۔

مُنہ سے بات نِکالنے میں اِحتیاط اور اعتدال سے کام نہ لیا جائے تو انسان دُوسروں کی نظر سے گر جاتا ہے۔ اگر ایک شخص میں چھچھورپن ہے، وہ ڈینگیں مارتا ہے، دوسروں کی غیبت کرتا ہے، بے محل ہنستا ہے، بار بار بگڑتا ہے اور رُوٹھتا ہے، تو وہ لوگوں مین ذلیل ہو جائے گا۔ اسی طرح اگر کوئی شخص حد سے زیادہ خاموش رہتا ہے یا حد سے زیادہ کم گو ہے تو یہی سمجھا جائے گا کہ وہ مغرور ہے اور دُوسروں کو حقیر سمجھتا ہے۔ آپس میں ہنسی مذاق کرنا بُرا نہیں، لیکن جب یہ حد سے بڑھ جائے اور تہذیب کے دائرے سے باہر ہو جائے تو لڑائی اور دُشمنی کا سبب بن جاتا ہے۔

کنجوسی اور بخیلی ایک بُری عادت ہے لیکن اپنی آمدنی سے بڑھ کر خرچ کرنا اس سے بھی زیادہ بُرا ہے۔ بعض لوگ خوراک اور پوشاک پر اپنی آمدنی سے بڑھ کر خرچ کرتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہمیشہ تنگ دستی کا شکار رہتے ہیں۔ اگر کوشش کر کے سادہ خوراک کی عادت ڈالی جائے اور چٹخارے بازی سے پرہیز کیا جائے تو اس سے خرچ کافی کم ہو سکتا ہے اسی طرح پوشاک زیادہ قیمتی ہونے کے بجائے سادہ اور صاف ستھری ہو تو اس پر خرچ بھی کم آئے گا اور عزّت میں بھی کوئی کمی نہیں آئے گی۔

مختصر یہ کہ اِعتدال اور میانہ روی میں فائدہ ہی فائدہ ہے اور نقصان کا کوئی پہلو نہیں۔ اگر آج ہم اعتدال کو اپنی زندگی کا اُصول بنا لیں تو کوئی وجہ نہیں کہ ہمارے معاشرے کی بہت سی خرابیاں تھوڑی ہی مدّت میں نیست و نابود نہ ہو جائیں۔ آیئے سچّے دل سے عہد کریں کہ ہم کھانے پینے، خرچ کرنے، پڑھنے لکھنے، پہننے اوڑھنے، دوڑنے بھاگنے، ہنسنے بولنے، غرض ہر کام میں اعتدال اور میانہ روی سے کام لیں گے۔ اگر آپ نے یہ عہد پورا کیا تو آپ دیکھیں گے کہ اس سے صرف آپ ہی کا بھلا نہیں ہو گا بلکہ قوم اور ملک کو بھی بے انتہا فائدہ پہنچے گا۔

حُسنِ تکلّم یا خوش کلامی

حُسنِ تکلّم یا خوش کلامی (شیریں گُفتاری) ایک ایسی اعلیٰ اخلاقی صِفت ہے جس کے نتائج اور اثرات نہایت خوشگوار اور دُور رَس ہوتے ہیں اسے اگر سحرِ حلال (وہ جادو جو جائز ہو) کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ خوش کلامی دوست تو دوست دشمن کا دل بھی موہ لیتی ہے۔ جس سے میٹھی زبان میں بات کی وہ اپنا بن گیا۔

جہاں رام ہوتا ہے میٹھی زباں سے
نہیں لگتی کچھ اس میں دولت زیادہ

خوش کلامی ضِد ہے بدزبانی اور تلخ کلامی کی۔ اسلام میں جہاں بدزبانی اور تلخ کلامی کو ناپسند کیا گیا ہے وہاں خوش کلامی یا شیریں گفتاری کی بہت تاکید کی گئی ہے۔ خوش کلامی کا اِطلاق صرف گفتگو یا بات چیت ہی پر نہیں ہوتا بلکہ زبان سے نکلنے والی تمام باتوں پر ہوتا ہے۔ قرآنِ حکیم میں حُکم دیا گیا ہے:

وَقُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا (سورۃ بقرہ:۸۳)

(یعنی اے مومنو: لوگوں سے خوش کلامی سے پیش آؤ یا لوگوں سے بھلی بات کہو)

سورۂ بنی اسرائیل میں فرمایا گیا ہے:

وَقُلْ لِعِبَادِیْ یَقُوْلُوا الَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ (ط) (آیۃ ۵۳)

یعنی (اور اے محمدؐ) میرے بندوں سے کہہ دو کہ
زبان سے وہ بات نکالا کریں جو بہترین ہو

اس آیت مبارکہ میں مسلمانوں کو یہ تلقین کی گئی ہے کہ کُفار اور مشرکین ہوں یا کسی دوسرے مذہب کے پیرو اور دینِ اسلام کے مخالف، ان سے گفتگو یا بحث میں تلخ کلامی، برہمی، مبالغے اور غُلو سے کام نہ لیں۔ وہ خواہ کیسی ہی ناخوشگوار اور اشتعال انگیز باتیں کریں مسلمانوں کو نہ تو کوئی خلافِ حق بات زبان سے نکالنی چاہیے اور نہ مشتعل

ہوکر بیہودہ اور لغو باتوں کا جواب بیہودہ اور لغو باتوں سے دینا چاہیے بلکہ ٹھنڈے دل سے نرمی اور شائستگی کے ساتھ وہی بات کہنی چاہیے جو سچی ہو جچی تُلی ہو اور دعوتِ حق کے تقاضے (یعنی وقار اور شائستگی) کے مطابق ہو۔ بعض لوگ چیخ چیخ کر یا بِلا ضرورت بہت بلند آواز سے باتیں کرنے کے عادی ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے نزدیک یہ عادت اور اندازِ گفتگو سخت ناپسندیدہ ہے۔ جیسا کہ سورۂ لُقمان میں ارشاد ہوا ہے:

وَاغْضُضْ مِنْ صَوْتِكَ ؕ اِنَّ اَنْكَرَ الصَّوْتِ لَصَوْتُ الْحَمِيْرِ (آیۃ19)

یعنی اپنی آواز کو پست (نیچا) رکھو۔ بدترین آواز گدھے کی ہوتی ہے۔

ایک مومن اور ایک مومنہ کی یہ صفت بھی ہے کہ وہ نہ صرف آہستگی نرمی اور شائستگی سے بات کرتے ہیں بلکہ لغویات سے بھی دُور رہتے ہیں جیسا کہ سورۃ المُؤمنُون میں فرمایا گیا ہے:

وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ

(یعنی (اور وہ مومنین) لغویات سے دُور رہتے ہیں)

لغویات سے دُور رہنے کا ایک مفہوم تو یہ ہے کہ وہ لغو باتوں سے پرہیز کرتے ہیں اور دوسرا مطلب یہ ہے کہ وہ کسی بھی قسم کی لغویات کی طرف رُخ نہیں کرتے۔ نہ ان میں کوئی دلچسپی لیتے ہیں اور نہ اُن لوگوں کے قریب جاتے ہیں جو کسی قسم کی لغویات (گندے اور فحش گیت گانے اور سننے، ٹھٹھے بازیوں، فضول گپ بازیوں، پتنگ بازی وغیرہ) میں مشغول ہوں۔ اگر کسی ایسی جگہ سے ان کا گزر ہوتا ہے جہاں لغو اور بیہودہ باتیں ہو رہی ہوں یا لغو اور خلافِ شریعت کام ہو رہے ہوں تو وہ وہاں سے شریفانہ انداز سے گزر جاتے ہیں اور ان لغویات پر ایک نگاہِ غلط انداز بھی نہیں ڈالتے جیسا کہ :رۂ الفرقان میں ارشاد ہوا ہے:

وَاِذَا مَرُّوْ بِاللَّغْوِ مَرُّوْا كِرَامًا (آیۃ ۷۲)

(یعنی) اور اگر انہیں کسی لغو کے پاس سے (یا کسی لغو چیز پر ان کا

گزر ہو جائے تو شریف آدمیوں کی طرح گزر جاتے ہیں

مسلمانوں کو یہ حکم بھی دیا گیا ہے کہ وہ پیچدار اور ذُو معنی بات کے بجائے صاف اور سیدھی بات کریں۔ سورۃ الاحزاب میں فرمایا گیا ہے:

يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا تَّقُو اللّٰهَ قُوْلُوْا قَوْلًا سَدِيْدًا (آية ۳۳)

(اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور ہمیشہ صاف واضح محکم سیدھی بات کرو)

ایک مومن کی ایک صفت اور شان یہ بھی ہے کہ وہ اپنی باتوں میں سچ کو کبھی نہیں چھپاتا اور نہ سچ میں جھوٹ ملاتا ہے سورۂ بقرہ میں ارشاد ہوا ہے:

لَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُوا الْحَقَّ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ (آیۃ ۴۲)

یعنی اپنی باتوں میں سچ کو جھوٹ کے ساتھ خلط ملط مت کرو
اور نہ جانتے بوجھتے حق کو چھپانے کی کوشش کرو

اس ارشادِ ربانی کے مطابق خوش کلامی یا حُسنِ تکلم میں یہ چیز بھی شامل ہے کہ (کسی مصلحت کے تحت یا کسی اور غرض سے) سچ میں جھوٹ ملا کر یا حق پر باطل کا رنگ چڑھا کر اس کو مشتبہ نہ بنایا جائے اور نہ جان بوجھ کر حق کو چھپانے کی کوشش کی جائے۔ اس کے برعکس زبان سے وہی بات نکالی جائے جو بہترین ہو اور اللہ کے غضب کو دعوت دینے کے بجائے اس کی خوشنودی کا باعث ہو۔

خَاتَمَ الانبیاء وَالْمُرسَلِین ﷺ کے نزدیک خوش کلامی کی کیا اہمیت تھی، اس کا اندازہ آپؐ کے اِن ارشادات سے کیا جا سکتا ہے:

حضرت عدی بن حاتم رضی اللہ عنہُ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ (صدقہ کر کے) دوزخ کی آگ سے بچو اگرچہ وہ صدقہ کھجور کے ایک ٹکڑے کا ہو اور اگر اتنا بھی نہ ہو سکے تو اچھی بات کہہ کر دوزخ سے بچو۔

(صحیح بخاری باب طیب الکلام)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہُ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے

فرمایا، کہ جو شخص اللہ پر اور یومِ قیامت پر ایمان رکھتا ہے اسے چاہیے کہ اچھی بات کہے ورنہ خاموش رہے۔ (صحیح بخاری باب من کان جارہ)

حضرت عَمرو بن عَبَسہ رضی اللہ عنہُ سے روایت ہے کہ میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا، یا رَسُولَ اللہ ! اسلام کیا چیز ہے۔ آپ نے جواب میں فرمایا، خوش کلامی۔ (طِیبُ الکلام / مُسنَدِ احمد)

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہُ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، مومن بندہ نہ زبان سے حملہ کرنے والا ہوتا ہے، نہ لعنت کرنے والا اور نہ بدگو اور نہ گالی بکنے والا۔ (جامع ترمذی)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہُ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، کہ:۔ اچھی اور میٹھی بات بھی ایک صدقہ ہے (یعنی نیکی کی ایک قسم ہے جو اللہ تعالیٰ کو بہت پسند ہے)۔ (صحیح بخاری)

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ فحش کام کرنے والے اور فحش باتیں کرنے والے سے محبت نہیں رکھتا اور نہ اس سے محبت رکھتا ہے جو بازاروں میں چلاّتا پھرے۔ (مشکوٰۃ)

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ قیامت کے دن اللہ کے نزدیک درجہ کے لحاظ بدترین آدمی وہ ہوگا جس کی بدزبانی اور تلخ کلامی کے ڈر سے لوگ اس کو چھوڑ دیں (یعنی اس سے ملنے جُلنے اور بات کرنے سے بچنے کی کوشش کریں)۔ (صحیحین وسُنَنِ ابی داوٗد)

رسولِ اکرم ﷺ کی حیاتِ اطہر کو اللہ تعالیٰ نے تمام مسلمانوں کے لیے نمونہ بنایا۔ آپؐ بے حد خوش خُلق اور نرم مزاج تھے۔ کسی کا دل نہیں دُکھاتے تھے اور ہر ایک سے بڑی محبّت اور نرمی سے گفتگو فرماتے تھے۔ چہرۂ مبارک ہر وقت کِھلا رہتا تھا۔ زبان میں اتنی مٹھاس تھی کہ ملنے والوں کا دل موہ لیتی تھی۔ جو (سلیم الفطرت) شخص آپؐ سے ملتا، آپؐ ہی کا ہو کر رہ جاتا تھا۔ قرآنِ حکیم نے آپؐ

کی نرم مزاجی اور خوش خُلقی کی شہادت یوں دی ہے:۔

فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ ۚ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَا نْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ ص (آل عمران:۱۵۹)

یعنی (اے نبیؐ!) یہ اللہ کی بڑی رحمت ہے کہ تم ان لوگوں کے لیے بہت نرم مزاج (خوش خُلق) واقع ہوئے ہو ورنہ اگر کہیں تم تُند خُو اور سنگ دِل ہوتے تو یہ سب تمہارے گردو پیش سے چھٹ جاتے۔

اُمّ المؤمنین حضرت عائشہ صِدّیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا بیان کرتی ہیں کہ ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ سے ملاقات کے لیے (کاشانۂ اقدس کے اندر آنے کی) اجازت چاہی آپؐ نے ہم لوگوں (اہلِ خانہ) سے فرمایا کہ یہ شخص (اپنی ترش روئی یا بدمزاجی کی وجہ سے) اپنے قبیلے کا بُرا آدمی ہے۔ پھر آپؐ نے فرمایا، اس کو اندر آنے کی اجازت دے دو۔ جب وہ اندر آ گیا تو آپ نے اس کے ساتھ بڑی نرمی سے گفتگو فرمائی۔ جب وہ چلا گیا تو میں (عائشہؓ) نے آپؐ سے عرض کیا، یارسول اللہ! آپؐ نے تو اس شخص سے بڑی نرمی کے ساتھ گفتگو فرمائی اور پہلے آپ نے اس شخص کے بارے میں فرمایا تھا کہ وہ اپنے قبیلے کا بُرا آدمی ہے۔ آپؐ نے فرمایا قیامت کے دن اللہ کے نزدیک سب سے بُرا آدمی وہ ہوگا جس کی بدزبانی اور سخت کلامی کی وجہ سے لوگ اس سے ملنا جلنا چھوڑ دیں۔ (صحیح بخاری وصحیح مسلم)

دوستوں اور عقیدت مندوں کے علاوہ آنحضور ﷺ دشمنوں کے ساتھ بھی خندہ پیشانی سے پیش آتے تھے اور ان کے گستاخانہ رویّے کے باوجود ان کے ساتھ نہایت نرمی سے گفتگو فرماتے تھے۔ دشمن خواہ کیسی ہی بدزبانی سے کام لیں آپ ان کے لہجے میں ان کو جواب نہیں دیتے تھے۔ ایک دفعہ چند شریر یہودی کاشانۂ اقدس میں حاضر ہوئے اور آپؐ سے مخاطب ہو کر ازراہِ خباثت ''السّلام علیکم'' کے بجائے ''السّام عَلَیکُم'' کہا (یہ ایک قسم کی گالی تھی جس کا مطلب ہے ''تم کو موت آئے'') اُمّ المؤمنین حضرت عائشہ صِدّیقہ رضی اللہ عنہا پاس ہی موجود تھیں ان کو یہودیوں کی

اس گستاخی پر غصہ آ گیا اور انہوں نے جواب میں فرمایا، تم ہی کو موت آئے اور تم پر اللہ کی لعنت اور اس کا غضب ہو حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا، اے عائشہ! زبان روکو، نرمی کا رویّہ اختیار کرو اور سختی اور بدزبانی سے اپنے کو بچاؤ۔ (صحیح بخاری)

دعا ہے اللہ تعالیٰ ہم سب کو خوش کلامی اور نرم مزاجی کی خصلت سے بہرہ ور فرمائے اور اُس ذاتِ اقدس ﷺ کے اسوۂ حَسَنہ پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے جس نے دشمنوں سے گالیاں سُن کر ان کو دعائیں دیں۔

اچھّے پڑوسی بنیے

داناؤں کا قول ہے کہ انسان کسی نہ کسی کا پڑوسی یا ہمسایہ ضرور ہوتا ہے اور یہ بھی حقیقت ہے کہ جب سے دنیا پیدا ہوئی ہے اور انسان نے مِل جُل کر رہنا سیکھا ہے اسے کسی نہ کسی کا پڑوسی ضرور بننا پڑا ہے۔ انسان کا اپنے ماں باپ، بہن بھائیوں، اولاد اور قریبی رشتہ داروں کے علاوہ ہمسایوں پڑوسیوں سے مستقل رابطہ رہتا ہے اور اس کی خوش گواری اور ناخوشگواری کا نہ صرف زندگی کے سُکھ اور سکون بلکہ اخلاق کے بناؤ بگاڑ پر بھی بہت اثر پڑتا ہے۔ اسی لیے کہا جاتا ہے کہ اچھا پڑوسی خدا کی رحمت ہوتا ہے اور بُرا پڑوسی خدا کا عذاب۔ دراصل پڑوسی ایک دوسرے کے اتنے قریب ہوتے ہیں کہ وہ ایک دوسرے کی زندگی کے ہر رُخ کو، خواہ وہ ظاہر ہو یا ڈھکا چھپا، جانتے ہیں۔ ذرا بھی غم ہوا، کوئی بھی دُکھ ہُوا کسی قسم کی ضرورت ہوئی ہم آپ سب کا طریقہ یہ ہے کہ پڑوسی کی طرف لپکتے ہیں۔ لیکن آج کل دیکھنے میں آیا ہے کہ پڑوسیوں کے باہمی تعلقات اکثر خراب رہتے ہیں اور ان کی باہمی رنجش بات بات پر جھگڑوں کا باعث بن جاتی ہے۔ اس طرح فریقین کی زندگی تلخ ہو جاتی ہے۔ ایسا کیوں ہے؟
اس کے کئی اسباب ہو سکتے ہیں مثلاً:

1 بچوں کے جھگڑوں میں ایک پڑوسی ہمیشہ دُوسرے پڑوسی کے بچوں کو قصوروار ٹھہرائے۔

2 نادار پڑوسی مالدار پڑوسی سے حسد کرے۔

3 مالدار پڑوسی نادار پڑوسی کو حقارت سے دیکھے اور اس سے نفرت کرے۔

4 ایک پڑوسی دوسرے پڑوسی کے دُکھ درد میں شریک نہ ہو اور اس کے معاملات سے بالکل لاتعلق رہے۔

5 ایک پڑوسی دوسرے کے بارے میں خواہ مخواہ بدگمانی کرے۔

6 ایک پڑوسی مذہب اور عقیدے کے اختلاف کی وجہ سے دوسرے پڑوسی سے نفرت کرے۔

7 ایک پڑوسی دوسرے پڑوسی سے بار بار قرض مانگے یا ضرورت کی دوسری چیزیں ہر وقت مانگتا رہے۔

8 قرض یا دوسری چیزیں لے کر واپس نہ کرے یا عاریتاً لی ہوئی چیزوں کو خراب کر کے واپس کرے۔

9 ریڈیو، ٹیلویژن یا ٹیپ ریکارڈر کو استعمال کرتے وقت ایک پڑوسی دُوسرے پڑوسی کے آرام اور سکون کا خیال نہ رکھے۔

10 مشترکہ گلی کوچوں میں گندگی پھیلائی جائے اور ایک پڑوسی دُوسرے پڑوسی کے گھر کے قریب یا سامنے کوڑا کرکٹ پھینکے۔

11 چھت پر چڑھتے وقت ایک پڑوسی دُوسرے پڑوسی کی بے پردگی کا خیال نہ رکھے وغیرہ۔

اگر ہم ٹھنڈے دل سے غور کریں تو محسُوس ہوگا کہ پڑوسی سے رنجش کی بنیاد جہاں رواداری، برداشت اور حوصلے کی کمی ہوتی ہے وہاں اس ذمہ داری کو پورا نہ کرنا بھی ہے جو پڑوسیوں سے برتاؤ کے سلسلے میں اسلام ہم پر ڈالتا ہے۔ اگر دوسروں کے بچّوں کو اپنے بچّے سمجھا جائے اور جس طرح اپنے بچّوں سے پیار کیا جاتا ہے ان سے بھی کیا جائے، پڑوسی کی خوشحالی سے حسد کرنے کی بجائے خود اپنے حالات سُدھارنے کی کوشش کی جائے، نادار پڑوسی سے نفرت کرنے کی بجائے اس سے شفقت اور محبّت کا برتاؤ کیا جائے، اگر پھل اسے تحفہ میں نہیں دے سکتے تو ان کے چھلکے باہر پھینک کر ان کی دِل شکنی نہ کی جائے، پڑوسی کے دُکھ درد میں شریک ہونا اپنا فرض سمجھا جائے، کسی معاملے میں پڑوسی سے بدگمان ہونے کی بجائے اس سے مِل کر نرمی کے ساتھ گفتگو کر لی جائے، مذہب اور عقیدے کو اپنی جگہ رکھا جائے اور اس کو میل جول

میں رکاوٹ نہ بننے دیا جائے، پڑوسی سے شدید ضرورت کے سوا قرض نہ مانگا جائے اور نہ وقت بے وقت چیزیں مانگ مانگ کر اسے تنگ کیا جائے، قرض لے کر اسے جلد از جلد یا وعدہ کے مُطابق واپس کرنے کی کوشش کی جائے اور مانگی ہوئی چیزیں بھی ضرورت پوری کرنے بعد صحیح سالم فوراً واپس کی جائیں، ریڈیو اور ٹیلی ویژن وغیرہ کو اس طرح استعمال کیا جائے کہ دُوسروں کے آرام اور سکون میں خلل نہ پڑے۔ چھت پر چڑھنے سے پہلے پڑوسیوں کو آگاہ کر دیا جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ پڑوسیوں کے ساتھ تعلّقات خوشگوار نہ رہیں۔

اسلام میں پڑوسی کے ساتھ حُسنِ سلوک کی بے انتہا تاکید کی گئی ہے۔ قرآنِ حکیم میں واضح حکم ہے کہ ”رشتہ دار ہمسایوں اور اجنبی ہمسایوں کے ساتھ نیک سلوک کرو“ (سورۃ نساء:۳۶)

رسولِ اکرم ﷺ نے تو پڑوسی کی رائے کو کسی کے اچھا یا بُرا ہونے کی کسوٹی قرار دیا ہے آپ کا ارشاد ہے کہ اگر تیرے پڑوسی تجھے اچھا کہتے ہیں تو واقعی تُو اچھا ہے اور اگر پڑوسی کی رائے تیرے بارے میں خراب ہے تو تُو واقعی بُرا آدمی ہے۔

پڑوسیوں کے ساتھ اچھے سلوک اور برتاؤ کو آپ کس قدر اہمیّت دیتے تھے اس کا اندازہ حضور ﷺ کے اس ارشاد سے کیا جا سکتا ہے:

”وہ شخص نہ صاحبِ ایمان ہے اور نہ جنّت میں داخل ہو سکے گا جس کی شرارتوں اور ایذا رسانیوں سے اس کے پڑوسی محفوظ اور بے خوف نہ ہوں۔“ (صحیحین)

وَالِدَین کی اطاعت

جَنَّت کی ضامِن

یہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ انسان کے لیے والدین ایسی نعمتِ عُظمٰی ہیں جس کا کوئی نعم البدل نہیں۔ اسی لیے قرآنِ حکیم میں والدین کی اطاعت پر بہت زور دیا گیا ہے لیکن افسوس کہ تہذیب مغرب نے والدین کو عضوِ معطّل بنا کر رکھ دیا ہے۔ مغرب زدہ معاشرے میں اکثر دیکھنے میں آتا ہے کہ بوڑھے اور بے سہارا والدین کی فرمانبرداری تو کیا اولاد ان کی کفالت تک سے گریزاں ہوتی ہے۔ اس کے برعکس جب ہم دیکھتے ہیں کہ اسلام نے انسان کی دینوی اور اُخروی فلاح یا اُس کی جَنّت اور دوزخ کا انحصار ہی والدین کی اطاعت اور خدمت گزاری پر رکھا ہے تو اس حقیقت پر بے ساختہ ایمان لانا پڑتا ہے کہ اسلام حقیقی معنوں میں دینِ رحمت ہے۔ اس نے زندگی کے ہر شعبے میں ایسی راہ متعیّن کر دی ہے جس پر چل کر انسان دنیا اور آخرت میں فلاح پا سکتا ہے۔ اسلام والدین کے احترام اور اطاعت کو غیر معمولی اہمیت دیتا ہے۔ خَاتَم الانبیا والمرسلین رحمتِ عالم ﷺ مسلمانوں کو والدین کی اطاعت اور خدمت کرنے کی بار بار تاکید فرماتے رہتے تھے یہاں تک کہ آپؐ نے والدین کے نافرمان کو جنت سے محروم قرار دیا۔ سُنَنِ نسائی اور مُسنَدِ دارمی کی ایک حدیث میں حضرت عبداللہ بن عَمرو بن عاص رضی اللہ عنہما سے حُضور ﷺ کا یہ ارشاد مروی ہے کہ احسان جتلانے والا اور والدین کی نافرمانی کرنے والا جنت میں داخل نہ ہوگا۔ بالفاظِ دیگر احسان جتلانا اور والدین کی نافرمانی جَنّت سے دُوری کا باعث ہیں۔ مُسنَدِ طَبرانی کی ایک حدیث میں رسولِ اکرم ﷺ کا یہ ارشاد بھی نقل ہوا ہے کہ والدین کا نافرمان بہشت سے اس قدر دُور رہے گا کہ اس تک بہشت کی بُو بھی نہ پہنچ

سکے گی حالانکہ بہشت کی ہوا یا خوشبو پانچ سو سال کی مَسافت سے بھی پہنچ جاتی ہے۔ بہشت تو آخرت کا معاملہ ہے والدین کے نافرمان کو دنیا میں بھی سزا مل جاتی ہے۔ مُسندِ بیہقی میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

یَغْفِرُ اللہُ مِنھَا مَا شَآءَ اِلَّا عُقُوق الْوَالِدَیْنِ فَاِنَّہٗ یُعَجِّلُ لِصَاحِبِہٖ فِی الْحَیَاتِ الدُّنیَا قَبلَ المُمَاتِ۔

یعنی ہر قِسم کے گناہوں میں سے اللہ تعالیٰ جتنے گناہ چاہے گا بخش دے گا سوائے ماں باپ کو ستانے کے گناہ کے۔ سو بے شک اللہ تعالیٰ ماں باپ کے ستانے والے کو موت سے پہلے زندگی ہی میں جلد سزا دیتا ہے۔

کُتبِ حدیث میں رسولِ اکرم ﷺ کے اور بھی بہت سے ارشادات ملتے ہیں جن میں آپؐ نے مختلف پیرایوں میں مسلمانوں کو شرک کے سوا والدین کا ہر حکم ماننے کی تلقین فرمائی ہے یہاں تک کہ کافر ماں باپ کے ساتھ بھی حُسنِ سلوک کی ہدایت فرمائی ہے۔ آنحضور ﷺ کے یہ ارشادات فی الحقیقت اللہ تعالیٰ کے ان احکام کی تفسیر ہیں جو قرآنِ پاک میں چودہ جگہ والدین کی اطاعت کے بارے میں وارد ہوئے ہیں۔ ان میں سے بیشتر مقامات پر اللہ تعالیٰ نے شرک کی مذمّت اور اپنی عبادت کا حکم دے کر فوراً والدین کے ساتھ نیک سلوک کرنے کا حکم دیا ہے۔ نیک سلوک میں ادب، تعظیم، اطاعت، رضا جوئی اور خدمت سب داخل ہیں۔ ہم یہاں صرف ایک مثال پیش کرتے ہیں۔ سورۂ بنی اسرائیل کی آیۃ ۲۳ اور ۲۴ میں ارشاد ہوا ہے:

وَ قَضٰی رَبُّکَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِیَّاہُ وَ بِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَانًا ط اِمَّا یَبْلُغَنَّ عِنْدَکَ الْکِبَرَ اَحَدُھُمَآ اَوْ کِلٰھُمَا فَلَا تَقُلْ لَّھُمَا اُفٍّ وَّلَا تَنْھَرْھُمَا وَقُلْ لَّھُمَا قَوْلًا کَرِیْمًا ○ وَاخْفِضْ لَھُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَۃِ وَ قُلْ رَّبِّ ارْحَمْھُمَا کَمَا رَبَّیٰنِیْ صَغِیْرًا ○ (آیۃ ۲۳-۲۴)

(یعنی) تیرے ربّ نے حکم دیا کہ تم لوگ اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو

اور اپنے والدین کے ساتھ نیک سلوک کرو، اگر تیری موجودگی میں سے ایک یا دونوں بڑھاپے کو پہنچ جائیں تو اُن کے سامنے اُف تک نہ کرنا اور نہ انہیں جھڑکنا اور ان کے ساتھ عزّت وتوقیر سے بات کرنا اور نرمی اور تواضع سے ان کے سامنے جھک کر رہنا اور دُعا کرتے رہنا کہ اے میرے پروردگار ان پر رحم فرما جیسا کہ انہوں نے میرے بچپن میں میری پرورش کی۔

اگر ہم اللہ اور رسول ﷺ کے ان احکام پر ذرا سا بھی غور کریں تو ہمارا ضمیر گواہی دے گا کہ والدین سے بڑھ کر انسان کے لیے کوئی نعمت نہیں۔ ذرا تصوّر کیجیے ماں کی مامتا کا کہ بچے کی ولادت کے سلسلے میں اس نے کیسی زہرہ گداز تکلیف اٹھائی۔ دودھ پلانے کے زمانے میں بچے کو ذرا گرم سرد ہوا لگ گئی تو ماں کی راتوں کی نیند حرام ہو گئی وہ اپنے ہاتھ سے بچّے کی گندگی دھوتی رہی۔ بچہ ہنسا تو اس کا دل باغ باغ ہو گیا بچہ رویا یا اس نے کوئی تکلیف محسوس کی تو وہ فرطِ غم سے نڈھال ہو گئی، جب تک اس کا علاج نہ کرا لیا سُکھ کا سانس نہ لیا۔ بچّے کے ساتھ باپ کا ربط ماں کی نسبت ذرا کم سہی لیکن بچّے کی پرورِش کے اخراجات اور تعلیم وتربیت وغیرہ کا بار وہی اٹھاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان دونوں کو اولاد کی بے لوث محبت سے معمور کر رکھا ہے۔ اس کے سُکھ اور آرام کی خاطر وہ اپنا سُکھ اور چین قربان کر دیتے ہیں۔ وقت گزرنے کے ساتھ بچّہ جوان ہوا اور والدین کو بڑھاپے نے آ لیا۔ بچپن کا زمانہ بچّے کی محتاجی کا زمانہ تھا اب والدین کا بڑھاپا ان کی محتاجی کا زمانہ ہے۔ اِس وقت اسلام اولاد پر والدین کے ادب واحترام، ان کی خدمت اور دیکھ بھال کا فرض عائد کرتا ہے جبکہ تہذیبِ مغرب میں بالغ اولاد والدین کو نہ اپنے ذاتی معاملات میں دخل دینے کا حق دیتی ہے اور نہ ان کے ادب واحترام کو کوئی اہمیّت دیتی ہے۔ آنحضور ﷺ نے مسلمانوں کو نہ صرف ماں باپ کی زندگی میں ان کی خدمت کرنے کی ہدایت فرمائی ہے بلکہ ان کی وفات کے بعد بھی اولاد پر کچھ حقوق باقی رکھے ہیں۔ امام ابو داؤدؒ اور ابنِ ماجہؒ نے حضرت ابو اُسَید ساعدیؓ سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں بنی سلمہ کا ایک شخص حاضر ہوا اور اس نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! والدین کے مرنے کے

بعدان سے حُسنِ سلوک کی کوئی صورت ہمارے ذمہ باقی ہے؟ آپؐ نے فرمایا، ہاں یہ کہ ان کے لیے دعائے مغفرت کرنا، ان کی شرعی وصیّت کو پورا کرنا اور ان کے رشتہ داروں سے صلۂ رحمی کرنا جو محض ان کی قرابت کی وجہ سے کی جائے اور ان کے دوستوں کی تعظیم کرنا۔

ایک اور حدیث میں رسولِ اکرم ﷺ نے فرمایا ہے کہ والدین کی اطاعت اولاد کے گناہوں کا کفّارہ بن جاتی ہے.......... نیز آپ کا یہ ارشاد بھی نقل ہوا ہے کہ والدین اولاد کی جنّت بھی ہیں اور دوزخ بھی۔ ان کی فرمانبرداری اور خدمت جنت کی طرف لے جاتی ہے اور نافرمانی دوزخ کی طرف۔ دعا ہے اللہ تعالیٰ ہم سب کو والدین کی اطاعت اور خدمت کی توفیق دے۔ جہاں تک احسان جتلانے پر وعید کا تعلّق ہے تو اسلامی نقطۂ نگاہ سے کسی پر احسان کرکے اس کو جتلانا نہایت قبیح حرکت ہے قرآنِ حکیم میں آتا ہے لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِکُمْ بالمَنِّ والْاَذٰی یعنی مت باطل کرواپنی خیرات کو ساتھ احسان جتانے کے اور ایذا کے۔ مطلب یہ کہ احسان جتانے سے نیکی مٹ جاتی ہے اور اس کا کوئی ثواب باقی نہیں رہتا بلکہ احسان جتانے والا گنہگار رہوتا ہے۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْن

راشی اور مُرتشی دونوں ملعون ہیں

راشی کا مطلب ہے رشوت دینے والا لیکن (ع) کتنا یہ حرفِ غلَط مشہور ہوگیا، کہ آج کل لوگ رشوت لینے والے کو راشی کہتے ہیں۔

مُرتَشی کا مطلب ہے رشوت لینے والا لیکن یہ لفظ عام بول چال (یا عَامَۃُ النَّاس کے مابین گفتگو) میں بہت کم استعمال ہوتا ہے۔

رشوت کے لُغوی معنی ہیں ناجائز نذرانہ جو نقدی، جنس یا کسی اور شکل میں (بغیر حق کے) ناجائز طور پر حاصل کر کے کسی کا جائز یا ناجائز کام کیا جائے یا کوئی فائدہ حاصل کرنے کے لیے کسی مقدمہ کے گواہ یا حاکم کو دی جائے۔

رشوت کی ایک سیاسی قِسم بھی ہے وہ یہ کہ جابر یا مُطلَقُ العِنَان حکمران بعض نا اہل (مگر مالی یا سیاسی طور پر طاقتور یا خوشامدی یا اپنے منظورِ نظر نالائق) لوگوں کو روپیہ یا جاگیر دے کر یا کسی اعلیٰ منصب پر فائز کر کے اپنا حامی بنائیں۔ رشوت کی عمومی صورت وہ ناجائز مفاد ہے جو اپنے اعزاز، منصب یا عہدے کی بنیاد پر، استحقاق کے بغیر حاصل کیا جائے اور اس عہدے یا منصب پر فائز ہوئے بغیر جس کا حاصل کرنا ممکن نہ ہو...... رشوت لینے اور دینے کی اور بہت سی صورتیں بھی ہیں بہرصورت رشوت نام ہے جھوٹ، فریب، مکر، بے ایمانی، خیانت، اور جعلسازی سے کام لے کر دوسروں کے حق مارنے کا...... یہ حق دوسرے انسانوں (اپنے بھائی بندوں) کا بھی مارا جا سکتا ہے اور حکومت کا بھی (اپنے فرائضِ منصبی کی مٹی پلید کر کے)۔

اللہ تعالیٰ نے نہایت واضح الفاظ میں اس قبیح دھندے سے منع فرمایا ہے

سورۂ بقرہ میں ارشاد ہوا ہے:

وَلَا تَأْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ وَتُدْلُوْا بِهَآ اِلَى الْحُكَّامِ لِتَاْكُلُوْا فَرِيْقًا مِّنْ اَمْوَالِ النَّاسِ بِالْاِثْمِ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ (آیۃ ۱۸۸)۔

ترجمہ: اور تم لوگ نہ تو آپس میں ایک دوسرے کے مال ناروا طریقے سے کھاؤ اور نہ حاکموں کے آگے اِن کو اس غرض کے لیے پیش کرو کہ تمہیں دوسروں کے مال کا کوئی حصہ قصداً ظالمانہ طریقے سے کھانے کا موقع مل جائے (بالفاظِ دیگر جھوٹ بول کر یا ہیرا پھیری کر کے دوسروں کا مال مت ہضم کرو اور نہ یہ کرو کہ حاکموں تک رشوت پہنچا کر ایک دوسرے کا مال ناجائز طور پر کھانا شروع کر دو اور تم جانتے ہی ہو (کہ اگر تمہارا مال دوسرے اس طرح کھانے لگیں تو تمہیں کتنا ناگوار گزرے)۔

خاتم الانبیا والمُرسَلین ہادیِ اکرم ﷺ کو اس فعلِ قبیح (رشوت) سے اس قدر نفرت تھی کہ آپؐ نے اس کے لینے اور دینے والے دونوں پر لعنت بھیجی ہے۔ صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں حضرت عبداللہ بن عُمر و رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، اللہ کی لعنت ہو رشوت دینے والے پر اور رشوت لینے والے پر۔ اسی طرح ''مُنتقٰی'' میں بروایت حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ آنحضور ﷺ کا یہ ارشاد نقل ہوا ہے کہ اللہ کی لعنت ہو حاکم کو رشوت دینے والے پر اور اس حاکم پر بھی جو رشوت لے۔

سرورِ عالم ﷺ نے حکومت کے اہلکاروں (ملازموں) کو عوام سے کسی قسم کے تحفے لینے سے بھی منع فرمایا ہے کیونکہ یہ تحفے ان کو ان کے منصب یا عہدے کے لحاظ سے پیش کیے جاتے ہیں اس لیے یہ رشوت ہی کے ذیل میں آتے ہیں۔

صحیحین میں حضرت ابوحُمَید ساعِدی رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے قبیلۂ اَزْد میں سے ایک شخص کو جس کا نام اِبنُ اللُّتْبِیَّہ تھا، زکوٰۃ کی وصولی کے لیے عامل بنا کر بھیجا۔ جب وہ مدینہ واپس آیا تو اس نے مسلمانوں سے کہا کہ یہ مال زکوٰۃ کا ہے جو میں بیت المال کے لیے جمع کر کے لایا ہوں اور یہ مال ہدیہ ہے جو مجھے تحفہ کے طور پر دیا گیا ہے۔ نبی ﷺ نے جب یہ بات سنی تو خطبہ دیا اور اللہ کی حمد وثنا کے بعد (لوگوں سے) فرمایا کہ میں تم میں سے بعض آدمیوں کو، ان امور پر جو اللہ نے میرے سپرد کیے ہیں، عامل بناتا ہوں، اُن میں سے ایک جب

واپس آتا ہے تو کہتا ہے کہ یہ مال تمہارا ہے اور یہ مال مجھے تحفۃً دیا گیا ہے۔ یہ شخص اپنے باپ کے گھر یا اپنی ماں کے گھر کیوں نہ بیٹھ رہا، پھر دیکھتا کہ کون اس کے گھر میں آکر تحفۃً پیش کرتا ہے۔

ایک روایت میں یہ اضافہ بھی ہے کہ ''اس موقع پر رسول اللہ ﷺ نے یہ بھی فرمایا کہ مجھے اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں محمد کی جان ہے کہ تم میں سے جو شخص اس قسم کے تحفے قبول کرے گا، قیامت کے دن یہ تحفے اس کی گردن سے چمٹے ہوں گے، اگر اس نے تحفہ میں اونٹ لیا ہے تو وہ اس پر سوار بلبلاتا سنائی دے گا، گائے لی ہے تو وہ گردن سے چمٹی ہوئی بلبلا رہی ہوگی اگر بکری لی ہوگی تو وہ گردن سے چمٹی ہوئی ممیا رہی ہوگی''۔

اس کے بعد حضور ﷺ نے دونوں ہاتھ آسمان کی طرف اٹھا کر بارگاہِ الٰہی میں عرض کیا:

''یا اللہ تو گواہ رہیو! میں نے انہیں تیرا حکم سنا دیا ہے''
یا اللہ تو گواہ رہیو! میں نے انہیں تیرا حکم سنا دیا ہے
دو مرتبہ حضورؐ نے یہ الفاظ دہرائے۔

آنحضور ﷺ نے کسی کی سفارش کرنے کے عوض بھی تحفہ لینے کی ممانعت فرمائی ہے۔ حضرت ابو اُمامہ رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ سے روایت ہے کہ جو شخص کسی کی سفارش کرے اور وہ (جس کی سفارش کی گئی) سفارش کے بدلے میں سفارش کرنے والے کو کچھ تحفہ بھیجے اور وہ قبول کرلے تو وہ گویا سود کے دروازوں میں سے ایک بڑے دروازے سے داخل ہوا۔ (ابوداؤد)

ایک روایت میں ہے کہ رسولِ اکرم ﷺ نے جلیل القدر صحابی حضرت عبداللہ بن رواحہ انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ کو یہودِ خیبر کی طرف غلہ کی بٹائی وصول کرنے کے لیے بھیجا (یعنی فتح خیبر کے بعد حضورؐ نے حضرت عبداللہؓ بن رواحہ کو خیبر کا عامل مقرر فرمایا)۔ یہودِ خیبر نے اپنی عورتوں کے زیور جمع کر کے عامل (حضرت

عبداللہؓ بن رواحہ) کو بطورِ تحفہ پیش کیے۔ مگر انہوں نے یہ کہہ کر زیور قبول کرنے سے انکار کر دیا کہ میرے لیے یہ مال حرام ہے اور ہم لوگ حرام نہیں کھا سکتے۔

سیّدنا حضرت عُمرِ فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ نے اپنے عہدِ خلافت میں عدالتیں قائم کیں تو رشوت ستانی کے انسداد کے لیے کئی تدابیر اختیار فرمائیں مثلاً قاضیوں کی تنخواہیں بہت زیادہ مقرر کیں تاکہ وہ معاشی اعتبار سے آسودہ رہیں اور انہیں اپنی آمدنی بڑھانے کی ضرورت پیش نہ آئے۔ انہوں نے یہ قانون بنا دیا کہ جو شخص معزّز اور دولت مند نہ ہو اسے قاضی نہ مقرر کیا جائے۔ کوفہ کے گورنر حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کو اس قاعدے کی وجہ یہ بتائی کہ دولت مند رشوت کی طرف راغب نہ ہو گا اور معزز آدمی کسی کے رعب میں نہیں آئے گا۔

حضرت عمرؓ کا ایک دوست ہر سال ان کے لیے اونٹ کی ایک ران ہدیۃً بھیجا کرتا تھا۔ ایک دفعہ وہ شخص ایک مقدمہ میں فریق بن کر حاضر ہوا اور عرض کیا:

”امیر المؤمنین! ہمارے مقدمہ کا فیصلہ اس طرح کیجیے جیسے اونٹ کی ران کی بوٹیاں ایک دوسرے سے جدا کی جاتی ہیں“

حضرت عمرؓ بات کی تہہ تک پہنچ گئے۔ اسی وقت تمام عمّال کو تحریری فرمان بھیجا کہ کسی کا ہدیہ قبول نہ کرنا (خواہ یہ کسی ذاتی دوست کی طرف سے ہو) کہ (صاحبِ اختیار کے لیے) ہدیہ (قبول کرنا) رشوت لینے کے مترادف ہے۔

حضرت عمرؓ جب کسی کو عامل مقرر فرماتے تو اس کے پاس جس قدر مال اور اسباب ہوتا تھا، اس کی مفصل فہرست تیار کرا کر محفوظ رکھوا دیتے تھے۔ اگر عامل کی مالی حالت میں غیر معمولی ترقی ہوتی تھی تو اس سے مواخذہ کیا جاتا تھا۔ ایک دفعہ عتبہ بن ابی سفیان کو ایک علاقے کا گورنر مقرر کیا۔ کچھ عرصہ کے بعد ان کے مال و دولت میں غیر معمولی اضافہ دیکھنے میں آیا۔ حضرت عمرؓ کو اطلاع ملی تو آپ نے ان کو بلا کر باز پرس کی کہ تمہیں اتنا مال کہاں سے حاصل ہوا؟ انہوں نے جواب دیا کہ کچھ مال میں اپنے گھر سے لے کر گیا تھا اور اس کے بعد میں نے تجارت کے ذریعے مال جمع کیا

ہے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا:

''میں نے تمہیں عاملِ حکومت بنا کر بھیجا تھا، تاجر بنا کر نہیں بھیجا تھا۔ تجارت اور گورنری جمع نہیں ہوسکتیں۔ یہ سب فالتو سرمایہ بیت المال میں جمع کرو''

اس طرح مصر کے گورنر حضرت عُمرو بن عاص رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ کے بارے میں حضرت عمرؓ کو اطلاع ملی کہ ان کے مال اسباب میں حیرت انگیز اضافہ ہوا ہے۔ انہوں نے حضرت عُمرو بن عاصؓ کو لکھا:

اے عُمرو جب تمہیں مصر بھیجا گیا تھا اس وقت تمہاری حالت اور تھی مگر اب تمہارے پاس اسباب غلام اور مویشی جو اس قدر جمع ہو گئے، کہاں سے آ گئے؟''

حضرت عُمرو بن عاص نے جواب میں لکھا کہ مصر میں زراعت اور تجارت دونوں سے پیداوار ہوتی ہے اس لیے ہمارے پاس بہت سی رقم پس انداز ہو جاتی ہے۔

لیکن حضرت عمرؓ اس جواب سے مطمئن نہ ہوئے۔ وہ اس قدر محتاط تھے کہ اپنے حُکام کی آمدنی میں غیرِ معمولی اضافہ کے سلسلے میں اس بات کا ذرا سا بھی امکان ہوتا کہ اس اضافے کا سبب کسی خلافِ اصول طریقے کا استعمال بھی ہوسکتا ہے تو وہ فالتو (اضافی) رقم یا مال اسباب ضبط کر کے بیت المال میں داخل کرا دیتے تھے یا عام مسلمانوں میں تقسیم کر دیتے تھے۔ چنانچہ حضرت عُمروؓ بن عاص کا اضافی مال اسباب وغیرہ مسلمانوں میں تقسیم کرا دیا۔

ایک دفعہ ایک شاعر خالد بن صعق نے اپنے اشعار کے ذریعے حضرت عمرؓ کو اطلاع دی کہ فلاں فلاں عُمال کے اموال میں غیر معمولی اضافہ ہو گیا ہے، امیر المؤمنین ان کا حساب لیں کہ یہ اضافہ کیسے ہوا۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ نے ان سب کی موجودات کا جائزہ لے کر آدھا آدھا مال بٹا لیا اور بیت المال میں داخل کرا دیا۔ (الفاروق شبلی نعمانی)

مشہور مصنف مولانا ابویحیٰ امام خان نوشہروی مرحوم اپنی کتاب

''قرآنی دستورِ حیات'' میں اس واقعے پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''میں کہتا ہوں یہ تمام اموال رشوت تو نہ تھے بلکہ لوگوں نے ہدیۃً پیش کیے ہوں گے یا تجارت و زراعت کے ذریعہ سے ان عاملوں نے جمع کیے ہوں گے مگر چونکہ حاکمِ اعلیٰ کی برتری لوگوں کو ہدیہ دینے پر مائل کرتی ہے اور تجارت و زراعت میں بھی لوگ ان کو دوسروں پر محض ان کے حاکم ہونے کی وجہ سے ترجیح دیتے ہیں اس لیے یہ بھی ایک قسم کی رشوت بن جاتی ہے اس لیے حضرت عمرؓ نے ایسا کیا اور بالکل بجا کیا۔
> (قرآنی دستورِ حیات صفحہ ۲۹۱)

غیر اسلامی نظامِ حکومت میں آدمی اپنے جائز کام کے لیے بھی اس حکومت کے اہلکاروں کو نذرانہ دینے پر مجبور ہو جاتا ہے (اگر وہ ایسا نہ کرے تو اس کے کام میں طرح طرح کے روڑے اٹکائے جاتے ہیں) ایسی صورتِ حال کا ذکر کرتے ہوئے مولانا جلیل احسن ندوی اپنی کتاب ''راہِ عمل'' میں لکھتے ہیں:

> ''رشوت اس رقم کو کہتے ہیں جو دوسروں کا حق مارنے کے لیے حکومت کے کلرکوں اور افسروں کو دی جاتی ہے۔ رہی وہ رقم جو اپنے جائز حق کی وصولیابی کے لیے باطل نظامِ حکومت کے بے ایمان کارندوں کو دل کی پوری نفرت کے ساتھ اپنی جیب سے نکال کر دینی پڑتی ہے جس کے بغیر اپنا حق نہیں نکلتا اس کی کی وجہ سے یہ مومن اللہ کے یہاں نہیں دھتکارا جائے گا۔ اِن شَاءَ اللہ۔ ایسے حالات شدید تقاضا کرتے ہیں کہ خدا کا دین غالب اور حکمراں ہو''۔ (راہِ عمل صفحہ ۱۲۳)

اس میں کوئی شک نہیں کہ غیر اسلامی نظامِ حکومت میں ایک سچا مسلمان اپنے جائز کام کے لیے بھی بعض اوقات حکومت کے بے ایمان ملازموں کو رشوت دینے پر مجبور ہو جاتا ہے لیکن ملازمین حکومت اگر اللہ اور اللہ کے رسولؐ پر ایمان رکھتے ہیں اور مسلمان ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں تو ان کو ہر حالت میں رشوت (خواہ یہ کسی بھی صورت میں ہو) لینے سے احتراز کرنا چاہیے ورنہ ان پر اللہ کی لعنت پڑے گی۔ دعا ہے اللہ تعالیٰ ہم سب کو رشوت لینے اور دینے سے بچائے۔

دو قابلِ رَشک انسان

صحیح بخاری اور صحیح مُسلِم میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ دو شخص قابلِ رَشک ہیں ایک وہ جس کو اللہ نے مال عطا فرمایا ہو اور وہ اس کو اللہ کی راہ میں خرچ کر رہا ہو دوسرا وہ جسے اللہ نے علم و حِکمت سے نوازا ہو، وہ خود بھی اِس پر عمل کرتا ہو اور دوسروں کو بھی اِن کی تعلیم دیتا ہو۔

اس حدیثِ پاک میں اِنفاق فی سبیل اللہ یعنی اللہ کی راہ میں خرچ کرنے اور اشاعتِ عِلم و حکمت کی اہمیّت اور فَضِیلَت بیان کی گئی ہے۔ ایک صاحبِ حیثیت مسلمان اگر واجب زکوٰۃ دینے کے عِلاوہ اپنی اور اپنے اہل و عیال کی جائز ضروریات پوری کرے، رشتہ داروں، ہمسایوں، غریبوں، مسکینوں، بیواؤں، یتیموں اور حاجت مَندوں کی مدد کرے، مُجاہِدین کی اِعانت کرے، سامانِ جہاد کی فراہمی میں حصہ لے، رفاہِ عام کے کاموں میں شریک ہو، نادار قرض داروں کا قرض معاف کر دے یا ان کا قرض خود ادا کر دے تو یہی اللہ کی راہ میں خرچ کرنا یا اِنفاق فی سبیل اللہ ہے۔ قرآنِ حکیم میں جگہ جگہ اِنفاق فی سبیل اللہ کی تاکید کی گئی ہے اور اس کے لیے بے حد و حساب اجر و ثواب کا وعدہ کیا گیا ہے۔ بعض صورتوں میں اللہ تعالیٰ نے زکوٰۃ کے علاوہ غریبوں کی اِمداد کے لیے کئی دوسرے صَدَقاتِ بھی واجب قرار دیے تا کہ دولت ہر طبقہ میں گھومتی رہے۔ مُشکِل اور مصیبت کے وقت غریبوں کی امداد لازِم قرار دی یہاں تک کہ اپنی ضرورت کے سوا سب کچھ غریبوں کے لیے دینے کا حُکم دیا۔ سورۃ البَقرہ میں حُضورؐ کو مخاطب کر کے ارشاد ہوا ہے:

یَسْئَلُوْنَکَ مَاذَا یُنْفِقُوْنَ ۝ قُلِ الْعَفْوَ ط

یعنی آپ سے لوگ پوچھتے ہیں کہ خدا کی راہ میں کونسا مال خرچ کریں

کہہ دیں کہ جو ضرورت سے زیادہ ہے۔

یہاں اِنفاقِ فی سبیل اللہ کی عُمومی صورت بیان کی گئی ہے۔ اگر کوئی شخص دوسروں کی ضرورت کو اپنی ضرورت پر بھی ترجیح دے تو یہ ایثار ہے جو اِنفاقِ فی سبیل اللہ کی سب سے اعلیٰ صورت ہے۔

سَرورِ عالَم ﷺ فرمایا کرتے تھے کہ میرے پاس کوہِ اُحُد کے برابر بھی سونا ہو تو مجھے یہ پسند نہیں کہ تیسرے دن تک اِس میں سے ایک اشرفی کے برابر بھی میرے پاس بچ رہے۔ مَیں اِس مال کو دونوں ہاتھوں سے مخلوقِ خدا میں تقسیم کر کے رہوں گا۔

ایک مرتبہ حُضُورؐ کی بکریوں کا ریوڑ دیکھ کر ایک شخص نے اپنی ضرورت پیش کی آپؐ نے تمام ریوڑ اُس شخص کو بخش دیا اُس شخص نے اپنے قبیلے میں جا کر کہا:

> ''مُحمّدؐ اس قدر دریا دِل ہیں کہ راہِ خدا میں دیتے وقت
> اپنے مُفلِس ہو جانے کا مطلق خیال نہیں کرتے''

غزوہ تبوک کے موقع پر حُضُورؐ نے صحابۂ کرامؓ کو راہِ حق میں مال خرچ کرنے کی ترغیب دی تو حضرت ابوبکر صدیقؓ نے گھر کا تمام اثاثہ سوئی سلائی سمیت لا کر حضورؐ کے قدموں پر ڈھر کر دیا۔ حضرت عُمرِ فاروقؓ نے گھر کا نصف سامان حاضر کر دیا حضرت عثمان غنیؓ نے ہزاروں اشرفیوں کے علاوہ سینکڑوں اونٹ نکیل و پالان سمیت پیش کیے دوسرے صحابہؓ نے بھی کسی مالی قربانی سے دریغ نہ کیا حتّٰی کہ خواتین نے اپنے زیور تک اتار کر راہِ خدا میں دے دیئے۔ جب سورۃ آلِ عمران کی آیت

لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰی تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ ط

(یعنی تم کبھی نیکی حاصل نہ کر سکو گے جب تک تم ان چیزوں کو
جو تمہیں عزیز ہوں، راہِ خدا میں صَرف نہ کرو گے)

نازل ہوئی تو اصحابِ رسولؐ نے اپنی قیمتی سے قیمتی جائدادیں اور اموال، راہِ خدا میں لٹا دیے۔

حضرت سلمان فارسیؓ مدائن کے گورنر تھے، پانچ ہزار ماہانہ وظیفہ مقرر تھا لیکن

جونہی وظیفہ ملتا وہ اُسے مساکین میں تقسیم کر دیتے اور اپنی ضروریات چٹائی بُن کر پوری کرتے۔ یہی عادت حمص کے گورنر حضرت سعیدؓ بن عامر کی تھی۔ غرض ایسی سینکڑوں مثالیں ملتی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ رحمتِ عالم ﷺ اور آپؐ کے صحابہؓ کے نزدیک اللہ کی راہ میں خرچ کرنا ایک افضل عبادت کی حیثیت رکھتا تھا۔ اسی لیے حضورؐ نے راہِ خدا میں مال خرچ کرنے والے کو قابلِ رشک انسان قرار دیا ہے۔ دوسرا قابلِ رشک آدمی آپؐ کے نزدیک وہ صاحبِ علم و حکمت ہے جو خود بھی اِس پر عمل کرتا ہے اور دوسروں کو بھی اِس کی تعلیم دیتا ہے۔ حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، عالِم کی فضیلت عابِد پر ویسی ہے جیسی میری فضیلتِ اُمّت پر۔ حضور ﷺ نے حصولِ علم کو ہر مسلمان کا فریضہ قرار دیا ہے اور تعلیم و تعلّم کو عبادت سے بھی افضل قرار دیا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ و بن العا ہیں کہ ایک دن رسول اللہ ﷺ نے مسجد میں دو حلقے دیکھے ایک حلقہ یادِ خدا میں مشغول تھا اور دوسرا مسائلِ دین کی تعلیم و تعلّم میں، آپؐ نے فرمایا، دونوں حلقے اچھے ہیں لیکن دوسرا پہلے سے افضل ہے کہ اس میں شامل لوگ خود بھی علم سیکھتے ہیں اور بے علموں کو سکھاتے بھی ہیں، میں خود بھی مُعلّم بنا کر بھیجا گیا ہوں یہ فرما کر آپؐ دوسرے حلقے میں شریک ہو گئے۔ حضورؐ نے علم کے ساتھ عمل کو بھی ضروری قرار دیا ہے آپؐ فرمایا کرتے تھے مُبارک ہے وہ بندہ جو اپنے علم پر عمل کرتا ہے اور ضرورت سے زائد مال راہِ خدا میں خرچ کر دیتا ہے۔ جس علم سے کسی کو نفع نہ ہو آپؐ ایسے علم سے خدا کی پناہ مانگا کرتے تھے۔ آپؐ کا ارشاد ہے کہ جس عالِم کے علم سے اس کی اپنی ذات کو بھی نفع نہ ہو قیامت کے دن اسے سخت عذاب ہو گا۔ قرآنِ حکیم میں بے عمل عالِم کو اُس گدھے کی مانند قرار دیا گیا ہے جس پر کتابیں لدی ہوں سورۃ جمعہ کی آیت کَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ اَسْفَارًا میں اسی طرف اشارہ ہے۔ حکمت بھی علم ہی کی ایک شاخ ہے اس کا اِطلاق کتابُ اللہ کی تعلیمات پر بھی ہو سکتا ہے اور دانائی گی اُن تمام باتوں پر بھی جو حضورؐ لوگوں کو اس ارشادِ ربانی کے مطابق سکھاتے تھے:

اُدۡعُ اِلٰی سَبِیۡلِ رَبِّکَ بِالۡحِکۡمَةِ وَالۡمَوۡعِظَةِ الۡحَسَنَةِ (النحل ۱۲۵)

(یعنی لوگوں کو راہِ حق کی طرف حکمت اور عمدہ پند و نصیحت سے بلائیے)

آپؐ فرمایا کرتے تھے، حکمت مؤمن کی گمشدہ میراث ہے ایک اور حدیث میں آپؐ کا یہ اِرشاد نقل ہوا ہے کہ مسلمان اپنے بھائی مسلمان کو سب سے بہتر جو فائدہ پہنچا سکتا ہے وہ یہ ہے کہ جو اچھی بات سُنے اُسے بھی سنا دے۔ حضرت اَنس بن مالک رضی اللہ عنہ سے رِوایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، حکمت عزّت دار آدمی کو اور زیادہ عزّت بخشتی ہے اور غلام کو بلند کرتے کرتے تختِ شاہی پر بیٹھا دیتی ہے۔ حضرت امام مالکؒ کا قول ہے کہ حکمت سے مراد اللہ کی اطاعت، دین میں تفقّہ اور اس پر عَمل ہے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہم میں سے ہر مالدار کو راہِ خدا میں بے دریغ خرچ کرنے اور ہر صاحب علم و حکمت کو اِس پر عَمل کرنے اور دُوسروں کو سِکھانے کو توفیق عطا فرمائے، آمین۔

رمضان المبارک

ملّی وحدت و یک جہتی کا مہینہ

یوں تو ساری عبادات تَقَرُّب اِلَی اللہ کا ذریعہ اور وسیلہ ہیں مگر اُن کی الگ الگ خُصُوصِیات اور تاثیرات ہیں گویا ہر گُلے را رنگ و بوئے دیگر است یعنی ہر پھول کا رنگ اور اس کی خوشبو ایک دوسرے سے الگ ہے۔ ان عبادات میں صِیامِ رمضان، یعنی رمضان المبارک کے روزوں کے فضائل اور فوائد کی کوئی حد و نہایت نہیں۔ اسی طرح ماہِ صِیام یعنی رمضان المبارک کی عجیب شان ہے۔ یہ اَن گِنت برکتوں اور سعادتوں کا مہینہ ہے۔

اللہ جَلَّ شانہٗ اور اس کے رسولِ مُعَظّم ﷺ نے اس کے بے شمار فضائل بیان فرمائے ہیں ان فضائل کی اہمیت کا اندازہ رسولِ اکرم ﷺ کے اس ارشادِ مبارک سے کیا جا سکتا ہے کہ اگر لوگوں کو یہ معلوم ہو جائے کہ رَمَضان المبارک کیا چیز ہے تو میری امّت یہ تمنّا کرے کہ سارا سال ہی رَمَضان ہو جائے۔ اس مبارک مہینے کی سب سے بڑی خُصُوصِیّت اور فضیلت یہ ہے کہ اس میں قرآنِ حکیم نازل ہوا جو تمام انسانوں کے لیے رہنما ہے اور جس میں حق اور باطل کو الگ الگ کرنے والی تعلیمات ہیں جیسا کہ قرآنِ حکیم میں ارشاد ہوا ہے۔

شَھْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْٓ اُنْزِلَ فِیْهِ الْقُرْاٰنُ ھُدًی لِّلنَّاسِ وَ بَیِّنٰتٍ مِّنَ الْھُدٰی
وَالْفُرْقَانِ (البقرہ:۱۸۵)

یعنی رَمَضان وہ مہینہ ہے جس میں قرآن نازل کیا گیا جو انسانوں کے لیے سراسر ہدایت ہے اور ایسی واضح تعلیمات پر مشتمل ہے جو راہِ راست دکھانے والی اور

حق و باطل کا فرق کھول کر رکھ دینے والی ہیں۔

نماز کی طرح روزہ بھی بظاہر ایک اِنفرادی فِعل ہے لیکن جس طرح فرض نماز کے ساتھ جماعت کی شرط عائد کر کے اس کو ایک اجتماعی عَمل میں تبدیل کر دیا گیا ہے اسی طرح فرض روزوں کے لیے ایک خاص مہینہ اور ان کے اوقات مقرر کر کے اس کو ایک اجتماعی عَمل بنا دیا گیا ہے۔ روئے زمین کے تمام مسلمان خواہ وہ کسی اسلامی ملک میں بس رہے ہوں یا کسی غیر مسلم ملک میں، کسی پہاڑ پر آباد ہوں یا کسی جزیرے میں غرض دنیا کے کسی بھی گوشے میں آباد ہوں ایک مہینے کے فرض روزے انہیں ماہِ رَمَضان ہی میں رکھنے ہوں گے اور اس کے لیے اُسی طریقِ کار اور اُنہی اوقات کی پابندی کرنی ہوگی جو قبولیتِ روزہ کے لیے ضروری ہیں۔ بلاشبہ مختلف مقامات کے وقت سَحَر اور وقتِ اِفطار مختلف ہوتے ہیں لیکن نہ مہینہ تبدیل ہوسکتا ہے اور نہ اللہ اور شارعِ اسلام کے وہ احکام جن کی روشنی میں سَحَری اور اِفطار کے اوقات معیّن کیے جاتے ہیں۔ حضرت شاہ ولی اللہ مُحَدِّث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ ماہِ رَمَضان کی اجتماعیت کے بارے میں اپنی شہرۂ آفاق کتاب ''حُجَّۃِ اللّٰہِ الْبَالِغَہ'' میں لکھتے ہیں۔

''روزۂ رَمَضان ایک عمومی اور اجتماعی شکل کی حیثیت رکھتا ہے اس لیے وہ رُسُوم کی دسترس سے محفوظ ہے۔ مسلمانوں کے مختلف طبقوں اور مختلف جماعتوں کا ایک چیز پر اِجماع اور اِجتماع جس میں سب ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں، روزہ کو ان کے لیے آسان بنا دیتا ہے اور اس سے ان کی بہت ہمت افزائی ہوتی ہے۔ اسی طرح ان کی یہ اجتماعیّت خواص و عوام دونوں کے لیے مَلَکُوتی برکتوں کے نُزُول کا باعث ہے۔ اس میں اس کا امکان بھی بڑھ جاتا ہے کہ اُن کے کاملین و واصلین یعنی خدا رسیدہ صالحین پر جو انوار نازل ہوں وہ بھی ان سے نیچے والوں کو فیضیاب کرتے جائیں اور ان کی دعائیں ان کے پیچھے والوں تک پہنچتی رہیں۔'' (حُجَّۃِ اللّٰہِ الْبَالِغَہ کا اقتباس ختم ہوا)

اس میں کوئی شک نہیں کہ روزے کا مقصد تزکیہ اور ضبطِ نفس کے ذریعے مسلمانوں کی اخلاقی تربیت کرنا ہے اور یہ مقصد انفرادی عَمل کے ذریعے

بھی حاصل کیا جاسکتا ہے لیکن اس کے لیے سال بھر میں ایک مہینہ فرض روزوں کے لیے مخصوص کر دینے سے منشائے الٰہی یہ ہے کہ سب مسلمان بیک وقت روزہ رکھیں اور وہی نِظامِ تربیت جس سے افراد تیار ہوں ایک پاکیزہ اجتماعی نِظام بنانے میں بھی مُمِد و معاون ہو۔

ماہِ رَمضان کی اوّلین خُصوصیّت یہ ہے کہ تقویٰ یا پرہیزگاری کی اجتماعی فضا پیدا کرتا ہے۔ پوری پوری آبادیوں پر رُجوع اِلَی اللہ اور خشیتِ اِلٰہی کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ لوگوں میں بالعموم نیکی طرف رغبت اور برائی کی طرف نفرت پیدا ہوتی ہے۔ کوئی بھی شخص جو دین سے ذرّہ برابر لگاؤ رکھتا ہے، نہ صرف خود گناہوں سے بچنے کی کوشش کرتا ہے بلکہ کسی دوسرے کو بھی گناہ کا کوئی کام کرتے دیکھ کر اسے شرم دلاتا ہے کہ رَمضان میں ایسا کام کر رہے ہو جس سے اللہ اور اس کے رسولؐ نے منع کیا ہے۔ اکثر لوگوں (بالخصوص مالدار اور فارغ البال لوگوں کے طبقے) میں خیرات کرنے، گناہوں سے توبہ کرنے، روزہ افطار کرانے، سائلوں اور حاجت مندوں کی مدد کرنے، بھوکوں کو کھانا کھلانے اور برہنہ تن مساکین کو کپڑے پہنانے کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ یوں معاشرے میں عملی ہمدردی اور امدادِ باہمی کی روح بیدار ہوتی ہے جو ملّی وحدت اور یک جہتی کا بنیادی عنصر ہے۔ اگر ہم یہ کہیں کہ رَمضان المبارک کا مہینہ خیر کے لیے جمع ہونے اور نیک کام اجتماعی طور پر سرانجام دینے کا مظہر اور اسلامی زندگی میں مُساوات کی علامت بھی ہے تو اس میں کوئی مُبالغہ نہ ہوگا۔ فی الحقیقت اس مہینے میں تمام عالَمِ اسلام "اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَۃٌ" کی تصویر بن جاتا ہے اور اس پر ایک خاص کیفیت طاری ہو جاتی ہے جس کی طرف حکیم الامت علامہ اقبالؒ نے یوں اشارہ کیا ہے۔

ایک ہوں مُسلم حرم کی پاسبانی کے لیے
نیل کے ساحل سے لے کر تا بخاکِ کاشغر

یہ الگ بات ہے کہ بعض بین الاقوامی قوانین اور سیاسی مَصلَحتیں عالَمِ اسلام کے تمام

فرزندانِ توحید کو ایک پلیٹ فارم پر جمع ہونے میں رکاوٹ بنتی ہیں تاہم یہ مبارک مہینہ ان میں ملّی وحدت اور یک جہتی کا جذبہ ضرور پیدا کرتا ہے۔ یہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ اسلام مسلمانوں کو ایک خاص قسم کی اخلاقی تربیت دے کر جو صالح مُعاشرہ وُجود میں لانا چاہتا ہے اس کے اجزائے ترکیبی میں ماہِ رَمَضان کی خاص اہمیت ہے۔ اس مہینے میں ایک مال مست مسلمان کو بھی روزہ رکھ کر معلوم ہو جاتا ہے کہ اس کا کوئی قلاّش فاقہ کش بھائی بھوک کی حالت میں کس آزمائش سے دوچار ہوتا ہے۔ چنانچہ اس کیفیت کا احساس اسے حاجت مندوں اور غریبوں کی مدد کرنے پر ابھارتا ہے اور یہ مدد وہ صرف اللہ کی رضا کے حُصُول کے لیے کرتا ہے یوں امیروں اور غریبوں میں حَسَد کے بجائے شکرگزاری اور احسان مندی کا تعلق قائم ہوتا ہے اور طبقاتی جنگ کے امکانات معدوم ہو جاتے ہیں مختصر یہ کہ تمام طبقوں کے لوگوں کا مل کر ایک ہی مقصد کے حصول کے لیے بھوک پیاس کی مشقت اٹھانا، گناہوں سے اجتناب کرنا نیکیوں اور بھلائی کی طرف لپکنا ایسا اِشتراکِ عَمَل ہے جو مسلمانوں میں بہترین رشتہء اُخوت اور یک جہتی پیدا کرنے کا ذریعہ ہے اسی لیے ہم رَمَضان المبارک کو خیر و برکت کے علاوہ ملّی وحدت اور یک جہتی کا مہینہ بھی کہہ سکتے ہیں۔

رمضان المبارک

اور مسلمان تاجر کا کردار

جس طرح بہار کا موسم آتے ہی ہر طرف روئیدگی نظر آتی ہے، حدِ نگاہ تک سبزہ ہی سبزہ آنکھوں کو طراوت بخشتا ہے اور جو درخت کل تک خزاں رسیدہ تھے وہ سبز جوڑا پہن کر جوان ہو جاتے ہیں اُسی طرح ہر سال ماہِ رمضان کی آمد اپنے جلو میں بے شمار سعادتیں برکتیں اور اللہ تعالیٰ کی عنایاتِ بے پایاں لیے ہوتی ہے جو سارے مہینے میں بارش کی طرح برستی رہتی ہیں اور ساری فضا خیر و برکت سے معمور رہتی ہے۔ صومِ رمضان صرف عبادت ہی نہیں بلکہ اسلام کا ایک رُکن ہے۔ عبادتیں سب ہی انسان میں عبدیّت کا جذبہ اُبھارنے کا باعث ہوتی ہیں لیکن ہر عبادت کا اپنی ظاہری صورت میں بھی ایک مسلمان کی زندگی کے کسی خاص پہلو سے خُصوصی تعلق ہوتا ہے مثلاً نماز اللہ جلّ شانہٗ کے سامنے انتہائی عجز و انکسار کا اظہار ہے تو زکوٰۃ اس امر کا اظہار کہ جو کچھ ہمارے قبضے میں ہے وہ اللہ کا دیا ہوا ہے اور اس میں اللہ کے بندوں کا بھی حق ہے۔ اسی طرح حج، قربانی، صدقہ وخیرات وغیرہ بھی ایک خاص اثر رکھتی ہیں یہی حال روزے کا ہے اس عبادت کا مقصد خود اللہ تعالیٰ نے یوں واضح فرمایا ہے۔

كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ
(البقرہ: ۱۸۳)

"یعنی تم پر روزے اس طرح فرض کیے گئے جیسے پہلے لوگوں پر، شاید کہ تم متّقی بن جاؤ"

مطلب یہ کہ روزے سے جو فوائد مطلوب ہیں ان میں حُصولِ تقوٰی سب سے اہم مقصد ہے۔ تقوٰی قرآنِ پاک کی ایک اصطلاح ہے جس کے معنٰی یا مفہوم

غایت درجہ کی پرہیز گاری ہے یعنی ہر اس کام سے بچنا جس سے اللہ ناراض ہوتا ہو یا اللہ کے کسی بندے کو ناحق ضرر پہنچتا ہو۔ رسولِ اکرم ﷺ کے ایک پیارے ساتھی حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہٗ سے کسی نے پوچھا اے صاحبِ رسول! تقوٰی کا مطلب کیا ہے؟ آپؓ نے پلٹ کر اس سے سوال کیا، کیا تم کسی ایسی جگہ سے گزرے ہو جہاں چاروں طرف کانٹے دار جھاڑیاں ہوں؟ ان صاحب نے جواب دیا، جی ہاں بارہا ایسا اِتفاق ہوا ہے۔ آپ نے پھر سوال کیا کہ ایسے موقع پر تم کیا کرتے ہو؟ انہوں نے جواب دیا کہ اپنے کپڑوں اور بدن کو سمیٹ لیتا ہوں تاکہ کانٹوں سے بچ جاؤں۔ یہ سن کر حضرت ابوایوبؓ نے فرمایا کہ زندگی کی راہ پر گناہ کے کانٹوں سے بچ کر نکلنے کی فکر ہی تقوٰی ہے۔ فی الحقیقت کسی بھی مسلمان کی سیرت و کردار کی تعمیر کے لیے تقوٰی خشتِ اوّل کی حیثیت رکھتا ہے چونکہ روزے کا مقصد تقوٰی کا حصول ہے اس لیے اس کے فوائد و برکات سے وہی مسلمان مستفیض ہو سکتے ہیں جو اس مقصد کو حاصل کرنے کی کوشش کریں۔ ان میں غریب، امیر، آجر، مزدور، کسان اور تاجر وغیرہ ہر طبقے کے لوگ شامل ہیں۔ اس وقت ہمارا موضوعِ گفتگو یہ ہے کہ رَمضان المبارک میں ایک مسلمان تاجر کا کیا کردار ہونا چاہیے۔ تاجر ہمارے معاشرے کا ایک نہایت اہم عُنصر ہے کیونکہ رحمتِ عالَم ﷺ نے تجارت کو تمام پیشوں سے افضل قرار دیا ہے۔ رَمضان المبارک میں ایک مسلمان تاجر پر دوہری ذمہ داری آپڑتی ہے بلکہ یوں کہیے کہ نیکیوں کے اس موسمِ بہار سے فیضیاب ہونے کے لیے اس کو دوگونہ مواقع میسّر آجاتے ہیں ایک تو اُن آدابِ تجارت کی سختی کے ساتھ پابندی کرنے سے جن کا ہر مسلمان تاجر سے اسلام تقاضا کرتا ہے۔ مثلاً مال خریدنے اور بیچنے میں نرمی کرنا، ذخیرہ اندوزی نہ کرنا، ملاوٹ نہ کرنا، مال کا عیب نہ چھپانا، پورا تولنا اور پورا ناپنا، مال بیچنے کے لیے قسمیں نہ کھانا وغیرہ۔

دوسرے ایک عام مسلمان کی حیثیت سے ان باتوں سے بچنا جو روزے کے اجر سے محروم کر دیتی ہیں مثلاً جھوٹ بولنا، کسی کی غیبت کرنا، بے ہُودہ باتیں کرنا،

گالیاں بکنا، لڑائی جھگڑا کرنا اور خلافِ شرع کاموں میں مشغول رہنا۔

ایک مسلمان تاجر کا اسلام کے مقرّر کیے ہوئے آدابِ تجارت کی پابندی کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اس کے کاروبار کا محور رزقِ حلال کے حُصُول کے لیے تگ ودَو کرنا ہے جو بجائے خود عبادت کا درجہ رکھتی ہے۔ اگرچہ عام دِنوں میں بھی اس عبادت کی اللہ تعالیٰ کے نزدیک بڑی قدر و قیمت ہے مگر رَمَضان المبارک میں دوسری عبادات کی طرح اس عبادت کا ثواب بھی بہت بڑھ جاتا ہے اور اگر کوئی مسلمان تاجر ماہِ رَمَضان میں اپنے مسلمان بھائیوں کی خیر خواہی یا ان کو فیض پہنچانے کی نیّت سے اپنے مال کی قیمتیں کم کر دیتا ہے اور برائے نام منافع پر اکتفا کرتا ہے تو اسے سونے پر سہاگہ کہا جائے گا جو اس تاجر کو اجرِ عظیم کا مستحق بنا دے گا۔

قرآن وحدیث میں اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ نے مسلمان تاجروں کے لیے جو آدابِ تجارت مقرّر فرمائے ان میں سے کچھ یہ ہیں۔

(1) پورا تولو اور پورا ناپو، کم تولنے اور کم ناپنے والے اپنی روزی کو حرام بنا دیتے ہیں اور اللہ کے غضب کو دعوت دیتے ہیں۔

(2) لین دین میں اپنے عہد کو ہر حال میں پورا کرو۔

(3) جو شخص عیب دار چیز بیچے گا اور خریدار کو اس کے نقص سے آگاہ نہ کرے گا وہ ہمیشہ غضبِ الٰہی میں رہے گا۔

(4) قسم اٹھانے سے مالِ تجارت کی نکاسی تو ہو جاتی ہے مگر برکت سَلب ہو جاتی ہے۔

(5) گرانی کے انتظار میں غلّے کو روکنے والا بہت بُرا انسان ہے اگر اللہ تعالیٰ نرخوں کو ارزاں کرتا ہے تو غمگین ہوتا ہے اور گراں کرتا ہے خوش ہوتا ہے۔

(6) گرانی کے انتظار میں غلّے کو روکنے والا ملعون ہے۔

(7) تاجروں کا قیامت کے دن فاجروں کے ساتھ حشر ہوگا سوائے ان کے جو حرام سے بچے، جھوٹی قسم نہ کھائی اور قیمت بتانے میں راستبازی کو ہاتھ سے نہ

چھوڑا۔

(8) اللہ تعالیٰ اُس شخص پر رحم فرماتا ہے جو خریدنے، بیچنے اور تقاضا کرنے میں نرمی اختیار کرے۔

ایک سچے مسلمان تاجر کی پہچان یہی ہے کہ وہ ہمیشہ ان آداب پر عمل پیرا رہتا ہے۔ اگر کوئی تاجر ایسا نہیں کرتا تو اُس کی کمائی حرام ہوجاتی ہے اور یوں وہ اپنا اور اپنے اہل وعیال کا پیٹ دوزخ کی آگ سے بھرتا ہے بالخصُوص مسلمان ہونے کا دعوٰی کرنے والا کوئی تاجر رَمَضان المبارک میں ناجائز منافع خوری پر اُتر آئے تو وہ نہ صرف اس ماہِ مُقدّس کے فیوض و برکات سے محروم ہوجاتا ہے بلکہ اپنی آخرت بھی برباد کرلیتا ہے۔ اس کے برعکس ایک سچے مسلمان تاجر کا کردار ملک وملّت کے لیے باعثِ رحمت ہوتا ہے۔ رَمَضان المبارک میں وہ اپنے مسلمان بھائیوں کو جتنا بھی فائدہ پہنچائے گا وہ اس کے لیے بے حساب اجر وثواب کا باعث ہوگا۔ اسی طرح اگر اس نے ایک عام مسلمان کی حیثیت سے رحمتِ عالَم ﷺ کے اس ارشاد پر عمل کیا کہ مَنْ صَامَ رَمَضَانَ اِیْمَاناً وَّ اِحْتِسَا بًا غُفِرَلَہٗ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِہٖ تو اس کی آخرت سنور جائے گی۔

حُضُور ﷺ کے اس ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ جس نے ایمان اور احتساب کے ساتھ روزہ رکھا اس کے تمام پچھلے گناہ معاف کردیے گئے۔ اس حدیث پاک میں ایمان سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے متعلق ایک مسلمان کا جو عقیدہ ہونا چاہیے، وہ عقیدہ ذہن میں پوری طرح تازہ رہے اور احتساب کا مطلب یہ ہے کہ انسان اللہ ہی کی رضا کا طالب ہو اور ہر ایسے کام سے دُور رہے جو اللہ کی رضا کے خلاف ہو، دعا ہے اللہ تعالیٰ ہر مسلمان تاجر کو ہمیشہ اور بالخصوص رَمَضان المبارک میں اپنا کردار اللہ اور رسول کی رضا کے مطابق ادا کرنے کی توفیق دے۔

وَمَاعَلَیْنَآاِلَّاالْبَلَاغ

سَحَری اور اِفطاری کی برکات اور رمضان کے عشروں کے فضائل

جس طرح بہار کا موسم آتے ہی ہر طرف سبزہ ہی سبزہ آنکھوں کو طراوت بخشتا ہے اُسی طرح ہر سال رمضان المبارک کی آمد اپنے جلو میں بے شمار فضیلتیں، سعادتیں اور برکتیں لئے ہوتی ہے جو سارے مہینے میں بارش کی طرح برستی رہتی ہے اور ساری فَضا خیر و برکت سے معمور رہتی ہے۔ سُنَنِ نسائی میں حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول ﷺ سے عرض کیا کہ یا رسول اللہ مجھے کوئی ایسا عمل بتایئے جس سے اللہ تعالیٰ مجھے نفع دے۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ روزہ رکھا کرو اس کی مثل کوئی بھی عَمل نہیں ہے۔ شارِحینِ حدیث نے لکھا ہے کہ آنحضور ﷺ نے روزہ کو بے مثل عمل اِس اعتبار سے قرار دیا ہے کہ اس میں نفسِ امّارہ کو مغلوب کرنے اور اِس کی خواہشوں کو دبانے کی صِفَت بدرجۂ غایت پائی جاتی ہے۔ روزوں کی یہ صِفَتْ عُمُومی ہے۔ جہاں تک رَمَضان المبارک کے فرض روزوں کا تعلق ہے تو ان کے فضائل اور روحانی وجسمانی فوائد کی کوئی انتہا ہی نہیں۔ ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اگر لوگوں کو یہ معلوم ہو جائے کہ رَمَضان کیا چیز ہے تو میری اُمّت تمنّا کرے کہ سارا سال ہی رمضان ہو جائے۔ فی الحقیقت رَمضان المبارک کا سارا مہینہ حُصُولِ تقویٰ اورِ خیر و برکت کا مہینہ ہے۔ صومِ رمضان کے دو خاص اجزاء سَحَری اور افطار ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے مسلمانوں کو سحری کھانے اور بروقت افطار کرنے کی تاکید فرمائی ہے اور صومِ وصال سے منع فرمایا ہے۔ صومِ وصال سے مراد ہے بغیر افطار اور سحری کے مُسَلسل روزے رکھے جائیں چونکہ اس طرح کے روزے سخت مُشَقّت اور ضُعف کا باعث ہوتے ہیں اور اس کا خدشہ ہوتا ہے کہ صومِ وصال رکھنے والا کمزوری کے باعث دوسری ذمہ داریوں کو ادا کرنے کے قابل نہیں

رہے گا اس لیے حضور ﷺ نے اس طرح کے روزے رکھنے سے اُمت کو منع فرما دیا۔

جہاں تک حُضور پُرنور ﷺ کی اپنی ذاتِ گرامی کا تعلق ہے تو جس طرح آپ نے نمازِ تہجد اپنے اوپر فرض کر لی تھی اسی طرح آپ مسلسل روزے بھی رکھ لیا کرتے تھے کیونکہ آپ ﷺ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک قسم کی غیر مادّی اور روحانی قوّت ملتی رہتی تھی لیکن صحیحین میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی روایت کے مطابق آپؐ نے ترحم اور شفقت کی بنا پر اُمت کو صوم وصال سے منع فرمایا اس کے برعکس آپؐ ﷺ نے مسلمانوں کو حکم دیا کہ وہ سحری کھایا کریں کیونکہ اس میں برکت ہے مُسنَدِ احمد میں حضرت ابوسعید خُدریؓ سے رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد مروی ہے کہ سحری میں برکت ہے اسے ہرگز نہ چھوڑو اگر کچھ نہیں تو اُس وقت پانی کا ایک گھونٹ ہی پی لیا جائے کیونکہ سَحَر میں کھانے پینے والوں پر اللہ تعالیٰ رحمت فرماتا ہے اور فرشتے ان کے لئے دعائے خیر کرتے ہیں۔ ایک اور روایت میں حضور ﷺ کا یہ ارشاد نقل ہوا ہے کہ ہمارے اور اہلِ کتاب کے روزوں کے درمیان فرق کرنے والی چیز سَحَری کھانا ہے۔ رحمتِ عالم ﷺ نے جہاں سَحَری کھانے کو ایک بابرکت عمل قرار دیا ہے وہاں اس میں تاخیر کا حکم بھی دیا ہے یعنی صبحِ صادق سے بہت پہلے سَحَری نہ کھائی جائے بلکہ صبحِ صادق کے قریب کھا پی کر روزہ رکھا جائے۔ اسی طرح آپ ﷺ نے افطار میں تعجیل کا حکم دیا ہے یعنی آفتاب کے غروب ہوتے ہی افطاری کر لی جائے۔ صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جب تک میری اُمت کے لوگ افطار میں جلدی کرتے رہیں گے وہ اچھے حال میں رہیں گے۔

اسی طرح ”جامع ترمذی“ میں حضرت ابوہریرہؓ نے آنحضور ﷺ کا یہ ارشاد روایت کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ اپنے بندوں میں مجھے وہ بندہ زیادہ محبوب ہے جو روزہ کے اِفطار میں جلدی کرے مختصر یہ کہ سحری کھانا اور افطاری کرنا دونوں ہی عمل اللہ تعالیٰ کی خوشنودی اور برکت کا باعث ہیں۔ ایک حدیث میں

آیا ہے کہ جس نے رَمَضان میں کسی روزہ دار کو افطار کرایا تو یہ اس کے گناہوں کی بخشش کا ذریعہ ہوگا اور اس کو روزہ دار کے ثواب کے برابر ثواب ملے گا بغیر اس کے کہ روزہ دار کے اُجر میں کوئی کمی ہو۔

سَحری اور افطاری کی روزانہ برکات کے علاوہ اللہ تعالیٰ نے رَمَضان شریف کے تین عشروں کو بھی اپنی خاص رحمت اور مَغْفِرَت کا ذریعہ بنادیا ہے۔ اس میں پہلی رات ہی سے اصحابِ صلاح وتقوٰی یعنی گناہوں سے بچنے کا اہتمام کرنے والے لوگوں کے گھروں پر رحمتوں کی بارش ہونے لگتی ہے دوسرے عشرے میں اُن لوگوں کے لئے بھی مغفرت کا سامان مہیا ہو جاتا ہے جو ایسے متقی اور پرہیزگار تو نہیں ہیں لیکن پہلے عشرے میں روزوں' دوسرے اعمالِ خیر اور توبہ استغفار کے ذریعے اپنے حال کو بہتر بنالیتے ہیں چنانچہ اس عشرے میں اللہ جَلَّ شَانُہٗ ان کی مغفرت اور معافی کا فیصلہ صادر فرمادیتا ہے۔ تیسرے عشرے مین اللہ تعالیٰ کی رحمت کا دریا جوش میں آجاتا ہے اور اُن لوگوں کو بھی دوزخ سے نجات اور رہائی مل جاتی ہے جو ناکارہ اور بے عمل تھے لیکن رَمَضان المبارک میں عام مسلمانوں کے ساتھ روزے رکھ کر اور توبہ استغفار کرکے اپنے نفس کو اللہ تعالیٰ کے رحم کا مستحق بنالیا۔ دعا ہے اللہ تعالیٰ ہم سب کو رمضان المبارک کے فیوض وبرکات سے بہرہ ور ہونے کی توفیق عطا فرمائے۔

لَیْلَۃُ القَدْر کی فضیلت

قرآنِ حکیم اللہ تعالیٰ کا پاک کلام ہے اور اس کی عظمت و شان اور اس کے فضائل و برکات کی کوئی حد و نہایت نہیں۔ اس کا اندازہ اسی ایک بات سے کیا جا سکتا ہے کہ رَمضان اُلمُبارک کو صِرف اس لئے تمام مہینوں پر فضیلت حاصل ہے کہ اس میں قرآنِ پاک نازل ہوا جیسا کہ سورۂ بَقرہ میں ارشاد ہوا ہے:

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْ اُنْزِلَ فِیْهِ الْقُرْاٰنُ

"یعنی رمضان وہ مہینہ ہے جس میں قرآن نازل کیا گیا"

اسی سب سے افضل اور مقدس مہینے میں لَیلَۃُ القَدْر یا شبِ قَدر آتی ہے جو رمضان المبارک کی تمام راتوں میں اس لئے افضل ہے کہ اس شب میں قرآنِ پاک نازل ہوا جیسا کہ سورہ قَدر میں ارشاد ہوا ہے:

اِنَّا اَنْزَلْنٰهُ فِیْ لَیْلَةِ الْقَدْرِ

"یعنی ہم نے اس (قرآن) کو شبِ قدر میں نازل کیا ہے"

اسی طرح سورۂ دُخان میں فرمایا گیا ہے:

اِنَّا اَنْزَلْنٰهُ فِیْ لَیْلَةٍ مُّبٰرَكَةٍ

"یعنی ہم نے اسے ایک برکت والی رات میں نازل کیا ہے"

مفسّرین نے اس رات میں قرآن نازل کئے جانے کے دو مطلب بیان کئے ہیں۔ پہلا یہ کہ اس رات پورا قرآن وحی لے جانے پر مامور فرشتے کے سپرد کر دیا گیا اور پھر حالات اور واقعات کے مطابق ۲۳ سال کے دوران میں جبریلؑ اللہ تعالیٰ کے حکم سے اس کی آیات اور سورتیں رسول اللہ ﷺ پر نازل کرتے رہے دوسرا مطلب یہ ہے کہ قرآنِ کریم کے نُزول کی ابتدا اس رات سے ہوئی اور یہی رات تھی جس میں سورۂ عَلَق کی ابتدائی پانچ آیتیں نازل کی گئیں۔

قَدْر کے معنی اکثر مُفَسِّرِین نے عظمت وشَرَف یا تقدیر کے لیے ہیں عظمت و شَرَف اس اعتبار سے کہ اس میں قرآن نازل ہوا اور اللہ تعالیٰ نے اسے ہزار مہینوں سے زیادہ بہتر فرمایا خَیْرٌ مِّنْ اَلْفِ شَھْرٍ - ہزار مہینوں سے زیادہ بہتر کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ اس رات کا عَمَلِ خیر ہزار مہینوں کے عَمَلِ خیر سے بہتر ہے۔ صحیحین میں حضرت ابوہُرَیرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص لَیلَۃُ القَدْر میں ایمان کے ساتھ اور اللہ کے اَجر کی خاطر عبادت کے لئے کھڑا رہا اس کے تمام پچھلے گناہ معاف ہوگئے۔ گویا لَیلَۃُ القَدْر میں عبادت کرنے والے مُومنین کی اللہ تعالیٰ کے نزدیک غیر معمولی قدر و مَنزِلت ہے۔ صرف اس ایک رات کی عبادت سے ان کی گزشتہ زِندگی کے تمام گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔ اس رات کو غفلت میں گزار دینے پر سخت وعید آئی ہے۔ سُنَنِ ابنِ ماجہ میں حضرت اَنَسؓ سے مروی یہ حدیث بیان ہوئی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ماہِ رَمَضان المبارک میں فرمایا کہ یہ مہینہ جو تمھارے پاس آیا ہے اس میں ایک رات ہے جو ہزار مہینوں سے بہتر ہے۔ جو اِس سے محروم رہا وہ ساری خیر سے محروم ہوگیا اور محروم کے سوا خیر سے کوئی محروم نہیں ہوتا۔ ہزار مہینوں سے زیادہ بہتر کا دوسرا مطلب یہ ہے کہ ہزار مہینوں سے مراد گنے ہوئے ۸۳ سال چار مہینے نہیں بلکہ بے انتہا خیر ہے کیونکہ اہلِ عرب بڑی کثیر تعداد کا تصوّر دلانے کے لیے ہزار کا لفظ بولا کرتے تھے۔ قَدْر کے معنی تقدیر اس لحاظ سے ہیں کہ اس شب میں اللہ تعالیٰ تقدیر کے فیصلے نافذ کرنے کے لیے فرشتوں کے سپرد کر دیتا ہے۔ اس کی تائید سورۂ دُخان کی اس آیت سے ہوتی ہے:

فِیْھَا یُفْرَقُ کُلُّ اَمْرٍ حَکِیْمٍ

”یعنی اس رات میں ہر معاملے کا حکیمانہ فیصلہ صادر کر دیا جاتا ہے“

بعض مُفَسِّرِین نے قَدْر کا مطلب "تنگ" بھی لکھا ہے وہ ان معنوں میں کہ اس شب میں آسمان سے فرشتے اس کثرت سے اُترتے ہیں کہ زمین تنگ ہو جاتی ہے۔ نُزُولِ قرآن اور نُزُولِ روح و ملائکہ کے علاوہ لیلۃ القدر کی فضیلت میں اور بھی

بہت سی احادیث اور روایات ملتی ہیں جن میں سے کچھ یہ ہیں۔
1- اس رات کو ہر مؤمن کو ملائکہ سلام کرتے ہیں۔ 2- اس رات کو آسمانوں کے دروازے کھول دیے جاتے ہیں۔ 3- اس رات توبہ قبول ہوتی ہے۔ 4- اس رات جبریل علیہ السّلام اپنے پروردگار کے حکم سے ہر امرِ خیر لے کر اُترتے ہیں۔
5- اس شب میں جبریل علیہ السّلام جس شخص کو قیام وقعود اور ذِکرِ الٰہی میں مشغول پاتے ہیں اس کے لیے دعائے رحمت کرتے ہیں۔

لَیلَۃُ القدر کی یہ ساری فضیلتیں ساری رات کے لیے ہیں۔ شام سے صُبح یا طلُوعِ فجر تک جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے هِیَ حَتّٰی مَطلَعِ الفَجرِ۔ یعنی پوری رات خیر ہی خیر ہے ہر شر اور ہر فتنے سے پاک۔ یہ نہیں کہ شب کے کسی خاص حصے میں برکتوں اور رحمتوں کا نزُول ہو اور دوسرے میں نہ ہو۔ اس لیے بہتر یہی ہے کہ ساری رات عبادت میں بسر کی جائے اور کوئی لحہ ضائع نہ کیا جائے۔ علماءِ اُمّت کی بڑی اکثریت کی رائے یہ ہے کہ لَیلَۃُ القدر، رمضان المبارک کی آخری دس تاریخوں میں سے کوئی ایک طاق رات ہے اور ان میں بھی بیشتر اصحاب کی رائے یہ ہے کہ وہ ستائیسویں رات ہے۔ اس سلسلے میں متعدد احادیث کُتُب حدیث میں ملتی ہیں ان میں سے کچھ یہ ہیں:

صحیح بخاری میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ لَیلَۃُ القدر کو رمضان کی آخری دس راتوں میں تلاش کرو جب مہینہ ختم ہونے میں نو دن باقی ہوں یا سات دن باقی ہوں یا پانچ دن باقی ہوں۔

صحیحین، مُسنَدِ احمد اور جامعِ ترمذی میں اُمُّ المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ لَیلَۃُ القدر کو رمضان کی آخری دس راتوں میں سے طاق راتوں میں تلاش کرو۔

مُصَنَّف ابنِ ابی شیبہ میں روایت ہے کہ حضرت ابوذر رضی اللہ تعالیٰ عنہُ سے

لَیلَۃُ القَدْر کے بارے میں دریافت کیا گیا تو انہوں نے کہا کہ حضرت عمرؓ، حضرت حُذَیفہؓ اور اصحابِ رسول اللہ ﷺ میں سے بہت سے صحابہ کو اس میں کوئی شک نہ تھا کہ وہ رمضان کی ستائیسویں رات ہے۔

مُسنَدِ ابی داوٗد، طیالسی اور مُسنَدِ احمد میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ سے روایت ہے کی رسول اللہ ﷺ نے لَیلَۃُ القَدْر کے بارے میں فرمایا کہ وہ رمضان کی ستائیسویں، انتیسویں یا آخری رات ہے۔

بعض اہلِ علم نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ کسی ایک رات کا تعیّن اللہ اور اس کے رسولؐ کی طرف سے اس لیے نہیں کیا گیا کہ لَیلَۃُ القَدْر کی فضیلت سے فیض اُٹھانے کے شوق میں لوگ زیادہ سے زیادہ راتیں عبادت میں گزاریں اور کسی ایک رات پر اکتفا نہ کریں۔ بعض لوگوں کو یہ کہتے سنا گیا ہے کہ وہ رمضان کے آخری عشرے کی تمام طاق راتوں میں رات رات بھر جاگتے رہے ہیں لیکن انھوں نے کوئی خاص (غیر معمولی) چیز نہیں دیکھی۔ دراصل لَیلَۃُ القَدْر کی ماہیّت اللہ تعالیٰ کے بھیدوں میں سے ایک بھید ہے، وہ جس پر چاہے یہ بھید کھولتا ہے ہمیں اس کی زیادہ کُرید نہیں کرنی چاہیے بلکہ اپنی تمام تر توجہّ اپنے مراسمِ عبودیت / اعمال میں اخلاص پیدا کرنے کی طرف کرنی چاہیے اخلاصِ عمل اور یقینِ محکم رضائے الٰہی کے حُصُول کا بہترین ذریعہ ہیں۔

عیدالفطر کی اہمیّت اور اس کے دینی اور دنیوی فوائد

دنیا میں ہر قوم کے کچھ خاص تہوار اور جشن کے دن ہوتے ہیں جن میں اس قوم کے لوگ اپنے اپنے انداز میں خوشی مناتے ہیں۔ اسلام میں بھی خوشی کے دو دن رکھے گئے ہیں۔ ایک عیدالفطر اور دوسرا عیدالاضحیٰ، ان کا سلسلہ ہجرتِ نبوی کے بعد اس وقت شروع ہوا جب مسلمانوں نے مدینہ مُنورّہ میں اجتماعی زندگی کا آغاز کیا۔

سُنَنِ ابی داوٗد میں حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ مکّہ سے ہجرت فرما کر مدینہ تشریف لائے تو اہلِ مدینہ (جن کی کافی تعداد پہلے ہی اسلام قبول کر چکی تھی) دو تہوار منایا کرتے تھے اور ان میں کھیل تماشے کیا کرتے تھے۔

رسول اللہ ﷺ نے ان سے پوچھا، اے اہلِ مکّہ یہ دو دن جو تم مناتے ہو ان کی کیا حقیقت اور حیثیت ہے؟ انہوں نے عرض کیا کہ ہم زمانہ جاہلیّت میں بھی یہ تہوار اسی طرح منایا کرتے تھے۔

رسول اللہؐ نے فرمایا، اللہ تعالیٰ نے تمہارے ان دو تہواروں کے بدلے میں ان سے بہتر دو دن تمہارے لیے مقرر کر دیے ہیں، یومِ عیدالاضحیٰ اور یومِ عیدالفطر۔

اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے حقیقی، ملّی تہوار یہی دو دن ہیں۔ عیدالاضحیٰ تو اس مہتم بالشّان واقعہ کی یادگار ہے جس میں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے رضائے الٰہی کی خاطر اپنے لختِ جگر حضرت اسماعیل علیہ السلام کی گردن پر چھری چلا دی تھی اور عیدالفطر کی اہمیّت یہ ہے کہ یہ سب سے مبارک مہینے رمضان المبارک کا نہایت ہی مبارک تحفہ ہے۔ یہ پورا مہینہ خواہشات کی قربانی، مجاہدہ اور ہر طرح کی

طاعت وعبادات کی کثرت کا مہینہ قرار دیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس مہینے کے بخیر وخوبی خاتمے پر جو دن آئے گا وہ ایمانی اور روحانی برکتوں کے لحاظ سے بجا طور پر جشن اور مُسَرَّت کا دن ہوگا۔ چنانچہ یکم شوّال کا دن ہر سال اہلِ ایمان کے لیے مَسَرَّت، ابتہاج اور شکرِ الٰہی کا پیغام لاتا ہے لیکن دوسری قوموں کے ایامِ جشن میں ہونے والے لہو ولعب کے برعکس عید الفطر مسلمانوں کے مُوحدانہ عقائد اور پاکیزہ معاشرتی تصورات کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ یہ مسلمانوں کو ایک دوسرے کے قریب ہونے اور پاکیزہ بنیادوں پر میل جول بڑھانے کا موقع فراہم کرتی ہے اور ساتھ ہی غریبوں اور محتاجوں کی مدد کرنے کا جذبہ پیدا کرتی ہے یوں یہ مقدس دن مسلمانوں میں اجتماعیت کے فروغ کا باعث بنتا ہے۔ اس دن دنیا کے تمام مسلمان علی الصّباح اپنے اپنے شہروں، قصبوں، دیہاتوں اور محلّوں میں ایک جگہ جمع ہو کر دو رکعت نماز ادا کرتے ہیں۔ ایک دوسرے سے اپنی خطاؤں کی معافی مانگتے ہیں اور باہمی رنجشیں دور کرتے ہیں...... لیکن اس سے پہلے کہ وہ نمازِ عید ادا کریں، انہیں حکم دیا گیا ہے کہ ہر صاحبِ نصاب مسلمان اپنی طرف سے بھی اور اپنے تمام گھر والوں کی طرف سے بھی خواہ وہ بالغ ہوں یا نابالغ، مقررہ مقدار میں صدقہ ءفطر ادا کرے ورنہ اس کے روزے بارگاہِ خداوندی میں قبول نہ ہوں گے اور اس صدقہ کے مستحق کون لوگ ہیں؟ تمام غریب مسکین، معذور اور بالخصوص وہ سفید پوش مسلمان جو ہیں تو مسکین لیکن کسی کے سامنے ہاتھ پھیلانے میں شرم محسوس کرتے ہیں۔ گویا عید کی خوشیاں صرف اغنیا ہی کے لیے مخصوص نہیں بلکہ ان کے لیے لازم قرار دیا گیا ہے کہ ان خوشیوں میں غربا و مساکین کو بھی شریک کریں۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے روزوں کو فضول ولا یعنی اور فحش باتوں کے اثرات سے پاک صاف کرنے کے لیے اور محتاجوں، مسکینوں کے کھانے کے بندوبست کے لیے صدقہ ءفطر واجب قرار دیا ہے۔ اس حدیث میں صدقہ ءفطر کی دو حکمتوں اور فائدوں کی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے۔

ایک یہ کہ مسلمانوں کے جشن و مسرت کے اس دن صدقہ ٔ فطر کے ذریعے محتاجوں، مسکینوں کی شکم سیری اور آسودگی کا انتظام ہو جائے گا اور دوسرے یہ کہ زبان کی بے احتیاطیوں اور لغزشوں سے روزے پر جو برے اثرات پڑے ہوں گے یہ صدقہ ٔ فطر ان کا بھی کفارہ اور فدیہ ہو جائے گا۔

حضرت بریدہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا معمول تھا کہ آپؐ عید الفطر کی نماز کے لیے کچھ کھا کر تشریف لے جاتے تھے۔ گویا عید کے دن روزہ رکھنا ممنوع ہے اور علی الصّبَاح نماز سے پہلے کچھ کھانا اس لیے ہے کہ جس اللہ کے حکم سے رمضان کے پورے مہینے دن میں کھانا پینا بالکل بند رہا آج جب اس کی طرف سے دن میں کھانے پینے کا اِذن ملا اور اسی میں اس کی رضا اور خوشنودی معلوم ہوئی تو طالب محتاج کی طرح سویرے سویرے ہی اس کی ان نعمتوں سے لذت اندوز ہونے لگے۔ بندگی کا مقام یہی ہے۔

گر طمع خواہد زِمن سلطانِ دیں
خاک بر فرقِ قناعت بعد ازیں

مختصر یہ کہ عید الفطر کی حقیقی روح یہ ہے کہ اس روز مسلمان اللہ کا شکر ادا کریں، اپنے سے کم حیثیت والوں کی مدد کریں، امیر غریب سب اجتماعی طور پر خوشی منائیں اور اپنے اندر محبت، اُخُوّت اور اتحاد و اتفاق کا جذبہ پیدا کریں۔ دعا ہے اللہ تعالیٰ ہم سب کو احکامِ خداوندی اور ارشاداتِ نبویؐ کے مطابق خوشی کے اس موقع سے لطف اندوز ہونے کی توفیق عطا فرمائے۔

آمین ثم آمین!

مَسَرّت اور شادمانی کا اسلامی تصوّر

اسلام دینِ فطرت ہونے کے اعتبار سے نوعِ انسانی کے لیے ایک مکمل ضابطہء حیات ہے اور انسانی زندگی کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کرتا ہے۔ وہ انسان کو وہم وخیال، یبُوست اور بوریّت کے دائرے میں بند کر کے خلوَت نشینی کی تلقین نہیں کرتا بلکہ اس کو حقائق اور واقعات کی دنیا میں رہنا سکھاتا ہے۔ وہ انسان کی فطرت اور طَبائع کا پورا پورا لحاظ کرتا ہے اور دُکھ ہو یا سُکھ، غم ہو یا خوشی ہر موقع پر اسلام اپنے ماننے والوں کے لیے ایک ایسی راہِ عمل مُتعیّن کرتا ہے جو ایک طَرَف تو ان کو ایک خاص حد کے اندر اپنے جذبات کے اظہار کا موقع بہم پہنچاتی ہے اور دوسری طرف ان کو رضائے الٰہی کے حصول کا موقع بہم پہنچاتی ہے مثلاً غم کے موقع پر آنسو بہانے اور دبی آواز سے کسی قدر رونے کی بھی اجازت ہے مگر بَین کرنے یا واویلا کرنے کی سخت مُمانعت ہے کیونکہ صُبر کا دامن ہاتھ سے چھوڑنا اللہ کی ناراضی کا باعث ہے اور شیوۂ تسلیم ورضا یا صبر اختیار کرنا اس کی خوشنودی کا باعث۔ اسی طرح مَسَرّت کو اسلام نے شُکرِ خداوندی، عبادت اور حُسنِ معاشرت کا نہایت حَسین اِمتزاج بنا دیا ہے۔ غیر مُسلِم اَقوام کے جشن ہائے مَسَرّت بالعُموم بے قابو اور بے لگام ہوتے ہیں۔ ان کی حیثیت میلوں ٹھیلوں جیسی ہوتی ہے اور ان میں ہر قسم کی خرمستیاں اور لغویات روا رکھی جاتی ہیں لیکن دینِ حَنیف مَسَرّت اور شادمانی کے موقعوں پر لہو ولعب اور خُرافات میں وَقت اور دَولت کے ضِیاع کی اجازت نہیں دیتا بلکہ وہ حقیقی مَسَرّت اس بات کو قرار دیتا ہے کہ بارگاہِ خداوندی سے مَسَرّت اور شادمانی کی صُورت میں عطائے نعمت کا صِدقِ دل سے شکر ادا کیا جائے۔ یہ نفلی عبادات کی صورت میں بھی ادا کیا جا سکتا ہے اور اپنے اَعزّہ و اقرباء، ہمسایوں، دوستوں، اور دوسرے حاجت مندوں کی مالی مدد کر کے

یا ان کو دعوتِ طَعَام وغیرہ میں شریک کر کے بھی کیا جا سکتا ہے۔ یہ ایک قسم کی عبادت ہی مُتصوّر ہوگی گویا اسلام نے اظہارِ مَسرّت کو عبادت کے تابع کر دیا ہے اور ایسے موقعوں پر ایثار و سخاوت، خدمتِ خلق، اُخوّت اور باہمی خُلوص و محبّت کا دَرس دیا ہے۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اسلام انسانی فطرت کے تقاضے پورے نہیں کرتا اور مُعاشرے میں خُشکی اور افسردگی کا ماحول پیدا کرتا ہے، نہ وہ لوگوں کو تفریح کی اجازت دیتا ہے اور نہ اس میں جسم و رُوح کے لُطف و انبساط اور نشاط کے لیے کوئی گنجائش ہے۔ فی الحقیقت اسلام نے ایسے تمام تفریحی مشاغل جائز قرار دیے ہیں جن سے احکامِ الٰہی کی خلاف ورزی نہ ہوتی ہو اور جو مُعاشرے میں خرابی پھیلانے کا باعث نہ ہوں مثلاً ہر وہ کسرت یا کھیل جس سے جسمانی قوّت حاصل ہو ان میں کُشتی، کبڈی، ہاکی، فٹ بال، والی بال، رسہ کشی، گھڑ دوڑ، پیراکی، دوڑ وغیرہ سبھی چیزیں شامل ہیں۔ ایسا گانا سننے اور سنانے کی بھی اجازت ہے جس میں فحاشی، عریانی، بدکلامی اور جذبات کو برانگیختہ کرتے یا گناہ پر ابھارنے والی کوئی بات نہ ہو۔ مجلس آرائی، شعر و شاعری، لطیفہ گوئی اور ہنسی مذاق کی بھی اجازت ہے لیکن ان سب چیزوں کا دائرہ تہذیب کے اندر ہونا ضروری ہے۔ انفرادی یا علاقائی سطح پر تو مَسرّت اور شادمانی کا اظہار مختلف طریقوں سے کیا جا سکتا ہے مگر اسلام نے ملّتِ اسلامیہ کو عید الفطر اور عید الاضحیٰ کی صورت میں عالمگیر سطح پر مَسرّت اور شادمانی کا جو اجتماعی تصوّر دیا ہے وہ اپنی نوعیّت اور مَقاصد کے اعتبار سے منفرد اور بے مثل ہے۔ حضرت اَنس رضی اللہ عنہُ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ مکہ سے ہجرت فرما کر مدینہ منورہ تشریف لائے تو دیکھا کہ وہاں کے لوگ سال میں دو مرتبہ اپنے قومی تہوار مناتے ہیں اور خوب ناچتے گاتے اور کھیل تماشے کرتے ہیں۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ وہ لوگ زمانۂ جاہلیّت ہی سے ایسا کرتے آئے ہیں۔ آپؐ نے فرمایا یہ جہالت وضلالت کا طریقہ ہے، اللہ تعالیٰ نے ہم مسلمانوں کے لیے دو تہواروں کو اعلیٰ ترین اور بابرکت دنوں میں مقرر فرما دیا ہے یہ ہیں عید الفطر اور عید الاضحیٰ۔ عید الفطر کی تقریبِ سعید پر مسلمانوں

کے لیے لازم ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے حضور شکرانہ ادا کریں کہ اس نے ان کو رمضان المبارک کے روزے رکھنے کی توفیق عطا فرمائی۔ اس موقع پر فطرانہ ادا کرنا بھی لازم ہے تا کہ ہمارے غریب اور مسکین بھائی بہن بھی عید کی خوشیوں میں شریک ہوسکیں۔ اسی طرح عید الاضحیٰ کے موقع پر قربانی دے کر سنّتِ ابراہیمی ادا کی جاتی ہے۔ قربانی کے گوشت میں خویش واقرباء اور غرباو مساکین کا حصہ مقرّر ہے ان دونوں عیدوں کا آغار دو رکعت نماز سے ہوتا ہے اور ان کا مقصد خوشی منانے کے ساتھ ادائے شکر، مِلّت کی شیرازہ بندی، یکجہتی اور اُخوّت کا عَملی اظہار اور غُربا و مساکین کی مدد بھی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ایامِ عید میں آرائش وزیبائش کا اہتمام نئے کپڑے پہننا، خوشبو کا استعمال، جائز تفریحات سب چیزیں مباح ہیں لیکن ان میں گم ہوکر اگر معاشرے کو نظر انداز کر دیا جائے اور اس کے کمزور اور بے سہارا افراد کی طرف سے آنکھیں بند کرلی جائیں تو مَسَرّت اور شادمانی کا اسلامی تصوُّر ختم ہوکر رہ جاتا ہے اور ان تقاریبِ سعید کی حیثیت بے روح رَسم کی رہ جاتی ہے۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنی خوشیاں اُس طریقے سے منانے کی توفیق دے جو ان کے اسلامی تصوّر سے ہم آہنگ ہو۔ آمین

کتابیات

اس کتاب میں شامل مضامین کی تیاری میں جن کتابوں سے براہِ راست یا بالواسطہ بطورِ خاص مدد لی گئی ہے، ان کے نام یہ ہیں:۔

۱۔	قرآنِ حکیم	
۲۔	الجامع صحیح	امام بخاریؒ
۳۔	الجامع صحیح	امام مسلمؒ
۴۔	مشکوٰۃ المصابیح	شیخ ولی الدین محمد بن عبداللہ خطیب عمریؒ
۵۔	تفہیم القرآن	مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ
۶۔	قرآنی دستورِ حیات	مولانا ابو یحییٰ امام خاں نوشہروی مرحوم
۷۔	معارف الحدیث	مولانا محمد منظور نعمانیؒ
۸۔	قرآن حکیم اور ہماری زندگی	جسٹس (ر) ڈاکٹر تنزیل الرحمٰن
۹۔	زادِ راہ	مولانا جلیل احسن ندوی
۱۰۔	راہِ عمل	مولانا جلیل احسن ندوی
۱۱۔	خُلقِ عظیم	میر ولی اللہ مرحوم

حسنِ گفتار

طالب ہاشمی

دار الاشاعت مصطفائی